متاعِ فقیر

سردار محمد چوہدری

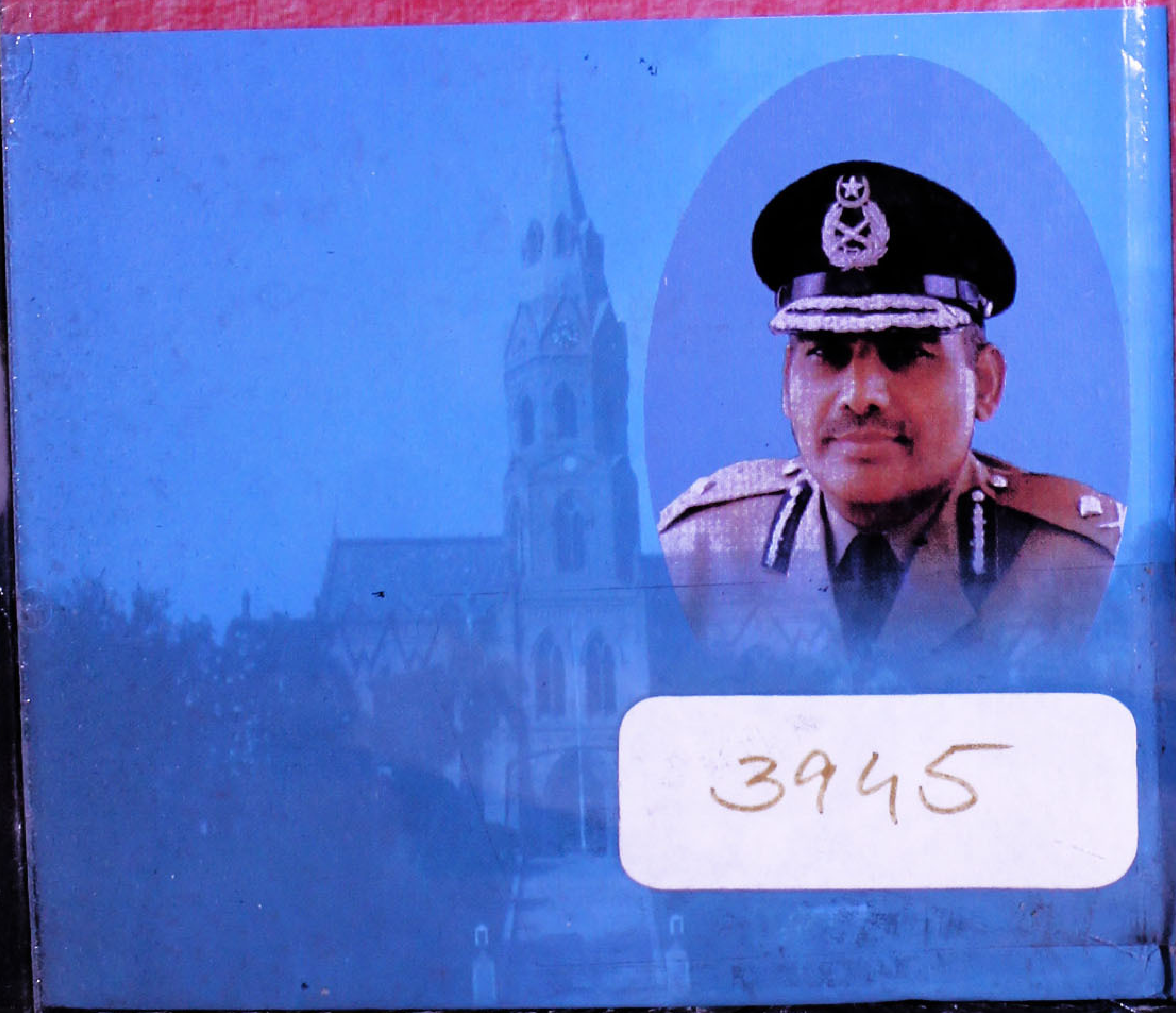

3945

920 Sardar Mohammad Ch.
Mata'-e-Faqir/Sardar Mohammad Ch.
Lahore : Sang-e-Meel Publications, 1999.
204p.

1. Sawaneh
I. Title

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ سنگ میل پبلی کیشنز/مصنف سے باقاعدہ تحریری اجازت کے بغیر کہیں بھی شائع نہیں کیا جا سکتا اگر اس قسم کی کوئی بھی صورت حال ظہور پذیر ہوتی ہے تو قانونی کارروائی کا حق محفوظ ہے

87209

1999
نیاز احمد نے
زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور سے چھپوا کر
سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
سے شائع کی۔

ISBN: 969-35-1022-4

سنگ میل پبلی کیشنز لاہور

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e Pakistan (Lower Mall), P.O. Box 997 Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 7220100-7228143 Fax: 7245101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com
Chowk Urdu Bazar Lahore. Pakistan Phone 7667970

Marfat.com

انتساب

بلقیس کے نام

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگیں کہ پنہاں ہو گئیں

Marfat.com

Marfat.com

فہرست مضامین

۱۔	ادارتی نوٹ	
۲۔	عرض مولف	۹
۳۔	پیش لفظ	۱۲
۴۔	اداس عید	۱۸
۵۔	کھلاڑاکہ	۲۷
۶۔	اجاڑہ	۳۵
۷۔	پناہ گیر	۴۰
۸۔	اسلامیہ کالج ہوشیار پور	۴۷
۹۔	ٹرین ٹو پاکستان	۵۴
۱۰۔	لاہور والٹن کیمپ	۶۱
۱۱۔	ٹوبہ ٹیک سنگھ	۷۰
۱۲۔	نیا ایس۔ڈی۔ایم	۷۶
۱۳۔	روشنی کا سفر	۸۳
۱۴۔	گورنمنٹ کالج' لاہور	۹۲
۱۵۔	شہر لاہور	۱۰۳
۱۶۔	مقابلے کا امتحان	۱۰۹

Marfat.com

۱۷۔	اک المیہ	۱۱۶
۱۸۔	رحمت کی تجویز	۱۲۳
۱۹۔	بیاہ کے بندھن آسمانوں پر	۱۳۱
۲۰۔	جھٹ منگنی پٹ بیاہ	۱۳۷
۲۱۔	سودا دل کا	۱۴۶
۲۲۔	بلقیس اور میں	۱۵۴
۲۳۔	رفاقت ہی سے ہے رفیق حیات	۱۵۸
۲۴۔	زندگی کی راہیں	۱۶۷
۲۵۔	ناگہانی موت	۱۷۵
۲۶۔	زندگی کا پہیہ چلتا رہا	۱۸۳
۲۷۔	رب کا روپ... ماں	۱۸۷
۲۸۔	ہائے موت کہ تجھے موت کیوں نہ آگئی	۱۹۱
۲۹۔	گھر دیکھ کر دشت یاد آیا	۱۹۶
۳۰۔	دل کی بات	۲۰۳

Marfat.com

ادارتی نوٹ

زیرِ نظر کتاب "متاعِ فقیر" سردار محمد چوہدری سابق انسپکٹر جنرل آف پولیس، پنجاب کی "آپ بیتی" ہے جس میں انہوں نے کوئی بھی لگی لپٹی رکھے بغیر اپنا ماضی و حال انتہائی ایمانداری اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مجھے پاکستان میں بہت ہی کم لوگ ایسے ملے جو اپنی زندگی میں نہایت ہی اعلیٰ مقام پر پہنچے لیکن اپنے ماضی کو فراموش نہیں کیا۔ چوہدری صاحب نے جس انداز سے اپنا ماضی بیان کیا ہے اور یہ دعویٰ بھی نہیں کیا کہ "پدرم سلطان بود" یہ بات نہایت ہی قابلِ ستائش ہے۔ جہاں تک زبان دانی کا تعلق ہے چوہدری صاحب نے نہایت آسان اور خوبصورت الفاظ اور محاورے استعمال کئے ہیں بلکہ بعض جگہ پر تو پنجابی لفظ اور جملے ان کی اصل پہچان کے ساتھ جوں کے توں لکھ دیئے جس سے چوہدری صاحب کے دل کی سچائی عیاں ہے وہ لفاظی کے فن سے آشنا ہیں اور اس کی اہمیت سے بھی واقف ہیں لیکن یہاں وہ بڑے واضح اور کھرے نظر آتے ہیں اور لفاظی نام کی کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ یہ امر قابلِ غور ہے کہ جو آدمی ہمیشہ انگریزی لکھتا اور بولتا رہا ہو بلکہ انگریزی ہی میں سوچتا رہا ہو اس نے کس قدر خوبصورت اور سادہ اردو زبان میں اپنی سوانح حیات لکھی ہے۔

میں چوہدری صاحب کو ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ وہ کبھی بھی کسی نفسیاتی الجھن کا شکار نہیں ہوئے اور نہ ہی انہوں نے کبھی غیر ضروری دباؤ قبول کیا۔ اسی لیے وہ زندگی میں ہر مرحلہ پر کامیاب و کامراں رہے۔ ان کے ماضی کو دیکھ کر یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہوتی ہے کہ محنت

Marfat.com

کبھی بھی رائیگاں نہیں جاتی اور اللہ تعالیٰ اس کا ثمر ضرور عطا کرتا ہے۔ میں نے ان کو ہمیشہ ہمدرد پایا اور چھوٹے سے چھوٹے آدمی کو بھی انہوں نے انسانیت کے رتبے سے عزت دی۔

پاکستان سے ان کا لگاؤ جذباتی ہے اور اس ملک کے لیے جو انہوں نے اور ان کے خاندان نے صعوبتیں اٹھائی ہیں وہ بیان سے باہر ہیں۔ لیکن انہوں نے ان مصائب کو کبھی بھی اپنے ماضی کا روگ نہیں بنایا۔ اس کتاب کی ایک اور بھی خوبی ہے کہ اس میں زندگی کی حقیقتوں کو کچھ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ وہ قاری کے ذہن میں ایک فلم کی طرح گھومتی ہیں اور مناظر مجسم ہو کر سامنے آتے ہیں۔ نوجوان نسل جس نے ابھی عملی زندگی کا آغاز کرنا ہے' اس کے لیے بقول اقبال یہ "شعلہ نوا قندیل" ہے۔

اگر اس ادارتی نوٹ کے طویل ہونے کا خوف نہ ہوتا تو میں اس پر مزید لکھتا۔ اب میں ان ہی الفاظ کے ساتھ چوہدری صاحب کو عقیدت کا خراج پیش کرتے ہوئے اپنی تحریر تمام کرتا ہوں۔

ڈاکٹر ایس ایم شفیق
ایم اے (اکنامکس)' ایم اے (پولیٹیکل سائنس)
ایل ایل بی' پی ایچ ڈی

Marfat.com

عرض مؤلف

آپ کے ہاتھ میں جو کتاب ہے یہ کوئی ناول نہیں ہے۔ ناول سے بڑھ کر دلچسپ تو ہو سکتی ہے مگر یہ داستان ایک حقیقت ہے۔ اس کے تمام کردار اصلی ہیں اور ان کے نام بھی۔ مگر بعض حقیقتیں افسانوں سے کہیں زیادہ بڑھ کر دلچسپ ہوتی ہیں اور یہ کہانی بھی ان ہی کہانیوں میں سے ایک ہے اور یہ روئیداد ہے میری اپنی زندگی کی۔ میری زندگی میں جو کچھ بھی ہوا وہ ہزار افسانوں کا ایک افسانہ ہے اور اب جبکہ میں عمر کے باسٹھویں سال میں ہوں اور پیچھے مڑکر دیکھتا ہوں تو مجھے خود یقین نہیں آتا کہ کیا یہ واقعی میری زندگی ہے۔

اپنے تجربہ کی بنیاد پر میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ کوئی انسان چاہے وہ کتنا ہی افلاطون کیوں نہ ہو اپنے مستقبل کی راہیں متعین نہیں کر سکتا۔ زندگی عجیب و غریب واقعات کا مجموعہ ہے۔

سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
عجوبہ زندگی ہے موت نہیں

Marfat.com

موت کے بعد کی باتیں تو نبیوں پیغمبروں نے خوب بتا رکھی ہیں مگر اصلی راز ہے تو ہماری اپنی یہ زندگی جس کے متعلق ہمیں زعم رہتا ہے کہ شاید ہم سب کچھ جانتے ہیں۔

مگر ہم مخلوق ہیں' ہماری عقل مخلوق ہے' ہماری دنیا مخلوق ہے' ہماری کائنات مخلوق ہے اور ہم سب محدود ہیں۔

لامحدود و لایموت ہے تو صرف اس کی ذات۔ صرف اس کی ذات پاک۔ مجھے نومبر ۱۹۹۷ء میں دل کی تکلیف ہوئی۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ کافی نقصان ہو چکا ہے لہٰذا میں اپنے علاج کی خاطر منرودل پٹسبورگ (امریکہ) آگیا جہاں میرے کزن بھائی ڈاکٹر پیر محمد طور رہتے ہیں۔ وہ خود تو ہوائی جہازوں کے ڈاکٹر ہیں مگر ان کی بیگم شائستہ طور باقاعدہ انسانوں کی ڈاکٹر ہیں۔

یہاں پہنچ کر بہت زیادہ ٹیسٹوں وغیرہ کے بعد ڈاکٹروں نے کہا کہ عرصہ دراز کے عارضہ شوگر کی وجہ سے میرے گردے کافی خراب ہو چکے ہیں اور معاملہ ذرا پیچیدہ ہے۔ لہٰذا مجھے اپنی موت نظر آنے لگی۔ اس ذہنی کیفیت کے دوران مجھے شدت سے احساس ہوا کہ میں نے زندگی میں بہت سے لوگوں کے لئے بہت کچھ کیا اور بہت سے لوگوں نے میرے لئے بہت کچھ کیا اور میں نے ان باتوں کا تذکرہ اپنی انگریزی زبان میں لکھی یاد داشتوں The Ultimate Crime میں کسی حد تک کر دیا ہے۔ مگر ایک ایسی ہستی جس نے میرے لئے سب سے زیادہ کیا۔ مجھے سب کچھ دیا۔ بے لوث محبت دی بلکہ مرمٹی اس کے ساتھ میں نے انصاف نہیں کیا۔ شاید میرا کوئی غیر شعوری حجاب میری راہ میں حائل تھا اور وہ تھی میری مرحومہ رفیقہ حیات بلقیس۔ آہستہ آہستہ میرا یہ احساس بہت ہی زیادہ گہرا ہوتا گیا اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں مرنے سے پہلے اس کے متعلق صحیح صحیح جذبات ضرور لکھوں گا۔

مزے کی بات ہے کہ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک دن ڈاکٹر پیر محمد نے کہا کہ سردار تمہاری ذاتی زندگی کے نشیب و فراز کسی الف لیلوی کہانی سے کم نہیں ہیں۔ تم نے سرکاری معاملات پر اتنی بڑی کتاب لکھ دی ہے۔ اب آپ اپنی نجی زندگی کی کہانی کیوں نہیں لکھ دیتے اور ان کی اس بات نے میرے ارادے کو اور بھی پختہ کر دیا اور میں نے تخلیق پاکستان کے مہینے اگست ۱۹۹۸ء کی پہلی تاریخ سے اپنی کہانی لکھنا شروع کر دی۔

Marfat.com

حیرت کی بات ہے کہ یہی بات مجھے ناصر حسین شمسی نے نیو یارک سے میری یادداشتیں پڑھنے کے بعد کہی کہ اپنی زندگی کے متعلق اور لکھو۔ انگریزی کتاب میں ذرا تشنگی رہ گئی ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں یہ کام پہلے ہی کر رہا ہوں بلکہ لکھنا شروع کر دیا ہے۔ یوں میں نے آج ۱۵ اگست ۱۹۹۸ کو یعنی پندرہ دن میں اپنی ذاتی زندگی کی مختصر روئیداد جلدی جلدی لکھ دی کہ بعد میں وقت ملے نہ ملے۔ زندگی ملے نہ ملے سانس چلے نہ چلے۔

میں اس کتاب لکھنے کی تحریک دینے پر ڈاکٹر پیر محمد طور اور ناصر شمسی کا بے حد ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے اس کے لکھنے کا حوصلہ دیا۔ میں اپنی بھابھی شائستہ طور کا بھی بے حد مشکور ہوں کہ انہوں نے امریکہ میں بیٹھ کر خوب پاکستانی کھانے کھلائے اور ہر طرح سے میرا خیال رکھا۔ وطن واپسی پر اس آپ بیتی کو ترتیب دیا گیا۔ میں ظہور احمد چوہدری اور ذوالقرنین جاوید کا بے حد مشکور ہوں کہ انہوں نے اس تحریر کو نہایت محنت اور خوبصورتی سے کمپوز کیا۔ میں اخلاق احمد صاحب انسپکٹر پولیس کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اس کتاب کی نہایت باریک بینی سے پروف ریڈنگ کی۔ میں قاری کا ممنون ہوں کہ وہ اسے پڑھنے کی زحمت اٹھا رہا ہے۔

میں اپنی تمام تر آہوں، سسکیوں، آنسوؤں اور بہت سی دعاؤں کے ساتھ اس کتاب کا انتساب اپنی پیاری بلقیس کے نام کرتا ہوں۔

منروول پٹسبرگ
امریکہ

سردار محمد چوہدری
۱۵۔ اگست ۱۹۹۸

Marfat.com

پیش لفظ

میرے عزیز دوست سردار محمد چوہدری کی خواہش ہے کہ میں اس کی خود نوشت کا پیش لفظ لکھوں۔ اس کی وجہ ایک تو ہماری دیرینہ رفاقت ہے۔ دوسری میری ان لوگوں سے شناسائی جن کا اس کتاب میں ذکر آیا ہے۔

سردار بڑا سچا آدمی ہے۔ اس نے اپنی زندگی کے واقعات ایمانداری کے ساتھ من و عن بیان کر دیئے ہیں۔ انگریزی ادب میں آٹو بائیو گرافی کی یہ خوبی ہے کہ لکھنے والا اکثر اپنے سیاہ و سپید' اچھے برے اور سود و زیاں کو قاری کی نذر کر دیتا ہے۔ وہ اپنی عسرتوں' محرومیوں اور ناکامیوں کو اپنی راحتوں' شادمانیوں اور کامرانیوں سے جدا نہیں کرتا۔ اس حقیقت نگاری کے سبب پڑھنے والا کتاب کو زندگی سے قریب تر پاتا ہے۔ ہمارے ہاں اردو ادب میں اپنے بارے میں لکھنے والوں کا فقدان ہے۔ میری نظر سے جو مطبوعات گزریں ان میں اپنا حال کم' اپنے ذاتی کم اور حالات عالم زیادہ۔ اپنی ذات کو بعینہٖ پیش کرنے کیلئے بڑی اخلاقی جرات چاہیے۔ شہاب نامہ اس سلسلے کی منفرد مثال ہے جس میں قدرت اللہ شہاب نے اپنی شخصی زندگی کو بغیر کسی حجاب کے سپرد قلم کر دیا ہے۔ اس سے پہلے ممتاز مفتی نے جرات رندانہ کر کے خود نوشت لکھی اور خوب لکھی۔ لیکن ایک ایسا تاثر دیا کہ یہ فکشن ہے۔ آخر عمر میں مانا کہ "علی پور کا ایلی" ممتاز مفتی خود ہے۔ جب بھید کھل گیا تو انہوں نے 'الکھ نگری' لکھ کر آپ بیتی مکمل کر دی۔ اس کے آغاز میں لکھتے ہیں "اردو ادب میں جتنی بھی خود نوشتیں تھیں سب دھلی دھلائی' کلف لگی' استری شدہ

Marfat.com

تھیں کوئی لکھنے والا اپنی کیوں' کجھوں اور کج رویوں کی بات نہیں کرتا تھا۔ میں نے سچی بات لکھنے کا تہیہ کیا اور علی پور کا ایلی وجود میں آئی"۔

حقیقت فکشن سے زیادہ دلکش ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ لوگ یا تو اپنی حقیقت سے نا آشنا ہوتے ہیں یا پھر حقائق پر دبیز پردے ڈال دیتے ہیں تاکہ کوئی دوسرا دیکھ نہ لے۔ ویسے بھی بنی آدم عروج پر آتے ہی اصلیت کو بھول جاتا ہے۔ اچھوں کو گھٹاتا ہے بروں کو بڑھاتا ہے اور پھر اپنے کئے کی سزا پاتا ہے۔

تصنع اور بناوٹ سے آزاد آٹو بائیو گرافی زیادہ پڑھی جاتی ہے۔ قاری اس میں اپنے ماضی کی جھلک پاتا ہے۔ مصنف کے تجربات اور واقعات کی روشنی میں اسے زندگی کی راہیں استوار کرنے میں مدد ملتی ہے۔ قفل کھلتے ہیں' ذہن بیدار ہوتا ہے' تمنائیں جاگتی ہیں۔ اندھیرے چھٹتے ہیں' راستے کھلتے ہیں۔ ان تجربات کی روشنی میں بہت سارے لوگ راہ حیات پر چلتے ہوئے اپنی منزل کو پالیتے ہیں۔ آسمانی صحیفوں میں بھی پہلے والوں کی تمثیلات پیش کی گئی ہیں۔ ان کے واقعات بیان کئے گئے ہیں تاکہ آنیوالے سیکھیں اور فلاح پائیں۔

ایک اچھے اور کامیاب انسان کی خود نوشت ایک تجربہ گاہ ہے۔ ایک پریکٹیکل ورکشاپ ہے۔ ایک استاد ہے جس سے سینکڑوں لوگ فیض یاب ہوتے ہیں یہ ایک ایسی درسگاہ ہے جہاں طالب کو مطلوب ملتا ہے اور مسافر کو سراغ منزل۔ ٹوٹے ہوئے دل جڑتے ہیں۔ مردہ جی بحل اٹھتے ہیں۔ اجڑے ہوؤں کو بستی بے گھروں کو گھر ملتا ہے۔ ناامیدوں کیلئے گلشن امید کھل جاتا ہے۔

اس عجیب و غریب داستان کا ہیرو اپنے بچپن کو آزادی پر قربان کر دیتا ہے۔ سب کچھ ہندوستان چھوڑ کر ۱۰ سال کی قلیل عمر میں ایک کٹے پھٹے قافلے کے ساتھ قتل و غارت اور خونخواری کے عفریت سے بچتا بچاتا خطرناک سفر کی سختیاں سہتا ہوا سر پر افلاس کی گھٹھڑی اٹھائے واہگہ بارڈر کراس کرتا ہے اور پاک سرزمین پر اپنے بڑوں کے ساتھ سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔ پھر سنگین حالات کے گورکھ دھندے سے گذرتا ہوا نئے وطن کی اعلیٰ سروس پر فائز ہوتا ہے اور انسپکٹر جنرل پولیس ہو کر ریٹائر ہوتا ہے۔ دوران ملازمت سربراہان مملکت اس سے مشورہ لیتے ہیں اسے اللہ کی مشیت

Marfat.com

کیسے یا محنت اور جانفشانی کا کمال پوری داستان پڑھنے والے کے دل میں اتر جاتی ہے۔ ہنستوں کو رلاتی ہے۔ روتوں کو ہنساتی ہے۔

سردار حق گو ہے اس کی تحریر تصنع، تکلف اور خود نمائی سے پاک ہے۔ اس کی پیاری پیاری باتیں دل میں اتر جاتی ہیں۔ وہ پاکستان کے معماروں میں سے ہے جنہوں نے آزادی کی خاطر گھر بار چھوڑا اور نامساعد حالات کا سامنا کرتے ہوئے سرحد کے اس طرف اقبال اور قائداعظم کی سرزمین کو اپنی چاہتوں، تمناؤں اور خوشیوں کا مرکز بنایا۔ وہ جذبہ کیا تھا؟ وہ کیفیت کیا تھی؟ وہ شوق حصول منزل جس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا تھا۔ ایک جوئے خون ہے جو مردہ قوم کو زندہ کر سکتی ہے۔ سردار نے بعض دھندلے نقوش کو صبح صادق کا اجالا دیا ہے۔ ملاحظہ ہو وہ منظر جب ان کا لٹا ہوا قافلہ سرحد پار کرتا ہے۔

"میرا چچا محمد دین مجھے کھڑکی کے پاس لے جا کر دکھاتا رہا کہ دیکھو! یہ دیکھو پاکستان ہے کتنا خوبصورت ہے پاکستان! اور کہتا جاتا تھا کہ یہ جنت ہے بیٹا یہ جنت ہے۔ اب یہاں کوئی ظالم سکھ نہیں آئے گا۔ یہاں سب کچھ ملے گا دودھ، گھی شکر سب کچھ ملے گا۔ گنے چوسیں گے اور مسجد میں نماز پڑھیں گے۔ یہ جگہ ہماری ہے۔ یہ وطن ہمارا ہے۔ یہ لوگ ہمارے ہیں۔ یہاں خوشیاں ہی خوشیاں ہوں گی۔ سب طرف اسلام کا بول بالا ہو گا۔ یہاں ہمارا بابا قائداعظم ہے وہ ہمیں زمین دے گا۔ زندگی دے گا۔ پتر فکر نہ کر۔ ہن فکر نئیں کر"۔

پھر والٹن مہاجر کیمپ میں چار روزہ قیام کا ذکر کرتے ہوئے سردار نے لکھا ہے "میری ماں نے کہا کہ پاکستان ہمارے لئے مسجد کا مقام رکھتا ہے۔ یہ پاک ہے اور انہوں نے مرتے دم تک پاکستان کو ایک مسجد ہی سمجھا"۔

کاش یہ جذبہ ایمان یہ حب الوطنی قوم اور قائدین قوم کے دلوں میں اتر جائے۔ تو واقعی چاچا محمد دین کا پاکستان جنت بن جائے۔ ضرورت ہے اس بات کی کہ نظریہ پاکستان دلوں میں راسخ کیا جائے۔ اقبال اور قائد کی سوانح کو تعلیمی نصاب کا حصہ بنایا جائے۔ حصول آزادی کی خاطر مسلمانوں نے کیا کچھ قربان کیا؟ اسے بھلایا نہیں جا سکتا۔ سردار محمد چوہدری نے ان قیامت خیز واقعات کو خود نوشت میں شامل کر کے تاریخ پاکستان کے ان خد و خال کو ابھارا ہے جسے قوم بھول

Marfat.com

چکی ہے۔ اس بھول میں ہی موجودہ بدحالی کا راز مضمر ہے۔ جو قوم اپنے ماضی کو فراموش کر دیتی ہے اس کا یہی حال ہوتا ہے۔

سردار کی تحریر میں سادگی بھی ہے اور بے ساختگی بھی بالکل اس کی اپنی شخصیت کی طرح۔ میرا اور اس کا ساتھ چار دہائیوں سے اوپر کا ہے۔ زمانہ طالب علمی میں بھی اس کے مزاج میں ایک ریزی تھی۔ بقول مختار مسعود "ریزی ایک خالی گھر کی طرح بے تکلف بے ریا اور بے ساختہ ہوتی ہے" ایک بار تو یہ ریزی اسے لے ڈوبتی اگر عین وقت پر میاں صاحب کی نصرت اور رہنمائی میسر نہ آتی۔

میاں محمد شفیع مرحوم اک مرکز مہر و وفا تھے۔ مجسم رحم و کرم۔ وہ ایک ہر دلعزیز نابغہ روزگار شخصیت تھے۔ تصنع تکلف اور خود نمائی سے پاک ہمہ تن محبت سراپا ایثار' صاحب بصیرت' روشن ضمیر سالک آدمی تھے۔ حسن قناعت میں بیگانہ زیر لب تبسم' کشادہ سینہ' عقابی آنکھیں اور لمبا قد۔ مگر انکساری ان کے روشن چہرے سے صدق و صفا خلوص اور دیانتداری عیاں تھی۔ میاں صاحب روشنی کا ایک بلند مینار تھے جس نے بہتوں کیلئے زندگی کی تیرہ و تاریک راہوں کو روشن کیا اور آوارگان راہ کو نشان منزل دیا۔

میاں صاحب اس داستان درویش کا مرکزی کردار ہیں۔ جی چاہتا ہے ان کی سیرت کے بارے میں چند باتیں عرض کردوں۔ میں اور سردار اس شمع علم و فضل کے گرد پروانے کی طرح گھومتے تھے۔ دونوں گورنمنٹ کالج سے جی او آر پیدل ہی صرف ان کی باتیں سننے کیلئے چلے جاتے۔ ان کو بھی ہمارے ساتھ اتنی محبت تھی کہ اطلاع ملتے ہی سب کچھ چھوڑ کر فوراً باہر آجاتے۔ وہ حلیم الطبع تھے۔ ان کی باتوں میں ایک مقناطیسی خاصیت تھی' ایک دل کو موہ لینے والا انداز۔ مزے لے لے کر باتیں سناتے' ایک دوست کی طرح۔ درمیان کے فاصلے ختم ہو جاتے تھے۔ واپسی پر راستے میں ہم ان کے خوبصورت جملوں کو بار بار دہراتے اور لطف اندوز ہوتے۔

ایک بار تاج محل کے حسن تعمیر کا ذکر کرتے ہوئے کہنے لگے "ناصر سردار میں تمہیں کیا بتاؤں کہ بنانے والے نے کیا شے بنا دی ہے۔ میں جب وہاں گیا رات کا سماں تھا اور چودھویں کا مکمل چاند۔ جھیل کے ساکت پانی کے اندر تاج محل اور چاند کا عکس پڑ رہا تھا۔ حسن و جمال کے

Marfat.com

اس منظر کو دیکھ کر میں انگشت بلب اور حیران و ششدر کھڑا یہ سوچ رہا تھا کیا یہ تاج محل چاند کیلئے بنا ہے؟ یا چاند کو تاج محل کی زینت کیلئے وہاں لگا دیا گیا ہے"۔

اپنے امریکن سفر کی باتیں سنا رہے تھے۔ کسی یونیورسٹی میں طلباء سے خطاب کے بعد ایک امریکن نژاد طالب علم نے پوچھا مشرق میں آپ لوگ کھانا چھری کانٹے کی بجائے ہاتھ سے کھاتے ہیں۔ کیا یہ ان ہائیجینک نہیں؟ میاں صاحب نے جواب دیا۔ میں جب کھاتا ہوں تو جانتا ہوں یہ میرے ہاتھ ہیں۔ آپ کا چھری کانٹا نہ جانے کتنے لوگوں کے منہ میں جاتا ہے۔ خود ہی فیصلہ کر لیں کہ کونسا طریقہ ہائیجینک ہے۔ آپ کا یا ہمارا۔

میاں صاحب کی ذات میں حب الٰہی' حب رسولؐ اور حب وطن کا امتزاج تھا۔ اقبال سے متاثر تھے۔ کہتے تھے اقبال عاشق رسولؐ اور عارف قرآن تھے۔ چونکہ تصور پاکستان کے وہ خالق ہیں۔ لہٰذا نظام پاکستان تعلیمات اقبال ہی کے حوالے سے مرتب ہونا لازم ہے۔

عشق رسولؐ کا ذکر کرتے ہوئے ہمیں بتایا کہ وہ حضورؐ پر اپنی جان نثار کرنے والے غازی علم دین شہید سے جیل کے اندر چند دوسرے احباب کے ساتھ ملے جن میں اصغر گونڈوی بھی تھے۔ میاں صاحب اس زمانے میں طالب علم تھے مسلمان وکلاء کا خیال تھا کہ اگر وہ اپنا بیان تھوڑا سا بدل دیں تو سزائے موت ٹل سکتی ہے۔ یہ وفد اسی سلسلہ میں ان سے ملنے گیا تھا۔ ان سے جب بات کی گئی تو بقول میاں صاحب ان کا جواب تھا "میں ہرگز بیان نہیں بدلونگا۔ کیا میں اس دو دن کی زندگی کی خاطر جنت کو چھوڑ دوں؟"

گورنمنٹ کالج لاہور میں ہر جمعرات کی شام مجلس اقبال کا اجلاس ہوتا تھا جس میں مقالہ پڑھا جاتا تھا۔ ایک نشست میں پروفیسر کرامت حسین جعفری نے "جبر و قدر" پر ایک جامع مضمون پڑھا۔ اس شام کے مہمان خصوصی میاں محمد شفیع تھے۔ مقالے پر بحث کے دوران تاریخ کے پروفیسر عبدالقیوم نے شاہان بنو امیہ کی فتوحات اور کارناموں کی بڑی تعریف کی۔ وہ دراصل جعفری صاحب کے مقالے کے اس حصہ پر تنقید کر رہے تھے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ مسئلہ تقدیر وقدر جو مسلمانوں کے تنزل اور پسماندگی کا باعث بنا' بنو امیہ کی ایجاد تھا۔ جو شہادت امام حسینؓ کے اصل اسباب چھپانا چاہتے تھے۔ اس پر بڑی بحث ہوئی۔ جعفری صاحب کا موقف تھا کہ تقدیر کا عام تصور جو عوام الناس میں پایا جاتا ہے اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں اور اقبال بھی اس

Marfat.com

کو نہیں مانتے تھے۔ پروفیسر قیوم بنو امیہ کے گن گا رہے تھے اور وسعت سلطنت اور تعمیرات گنوا رہے تھے۔ بحث اپنے عروج پر تھی کہ صاحب صدر (میاں صاحب) رطب اللسان ہوئے۔ انہوں نے کہا "قیوم صاحب آپ کی نظر بنو امیہ کی فتوحات اور تعمیرات پر ہے لیکن نواسہ رسول ؐ کا خون کر کے اور آل رسول ؐ کو اس میں بند کر کے بنو امیہ نے جو کلنک کا نشان اسلام کے ماتھے پر لگا دیا' آپ کے تمام فضائل قیامت تک اسے دھو نہیں سکتے"۔ اس جملے نے برہان قاطع کا کام کیا اور بحث ختم ہو گئی۔ امام عالی مقام سے میاں صاحب کو بے حد عقیدت تھی۔ ان کا ذکر کرتے تو آبدیدہ ہو جاتے۔ ان کے ڈرائنگ روم کے کارنس کے اوپر ان کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا علامہ اقبال کا یہ عظیم شعر ایک خوبصورت فریم میں سجا ہوا تھا۔

اے حیا اے پیک دور افتادگاں
رشک ما بر خاک پاک او رساں

اقبال نسیم صبح گاہی سے مخاطب ہیں اور رو رو کر کہتے ہیں اے دور رہنے والوں کی قاصد اے ہوا میرے اشکہائے عقیدت کو تربت امام پر پہنچا دے۔

مصنف نے کمال محبت سے ان کا ذکر کیا ہے چونکہ اس کی زندگی پر ان کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ یہ اس پیر طریقت کا فیضان نظر تھا کہ اک ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل بن گیا۔

نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں۔ ان کے خلوص نے اسپ شوق پہ تازیانے کا کام کیا اور تو بہ کا فرہاد' پہاڑوں' ریگستانوں' دریاؤں کو پار کرتا ہوا مہمات کو سر کرتا ہوا اپنی شیریں (بلقیس) سے ہمکنار ہو گیا۔

ناصر شمسی

جیکسن نیو جرسی (امریکہ)

۱۰ ستمبر ۱۹۹۸ء

Marfat.com

اداس عید

آج یکم اگست اور ۱۹۹۸ء سال عیسوی ہے۔ میں ڈاکٹر طور کے گھر منروول پٹسبورگ (امریکہ) میں بیٹھا ہوں۔ ڈاکٹر پیر محمد طور میری والدہ مرحومہ کے مطابق مجھ سے چھ (٦) دن بڑے ہیں۔ ہم بھارت ضلع ہوشیار پور موضع کوٹھہڑہ جسوالاں میں پیدا ہوئے۔ پیر محمد کا گاؤں ہمارے گاؤں کے ساتھ ہی دلماں تھا مگر ان کے والد چوہدری ابراہیم صاحب ہمارے گاؤں کوٹھہڑہ جسوالاں میں پٹواری تعینات تھے۔ یوں ہم ساتھ ساتھ پیدا ہوئے ہیں اور مختلف راہوں سے ہوتے ہوئے ساتھ ساتھ ہی پلے بڑھے ہیں۔ طور ان کا گوت ہے اور میرا گوت دیدڑ ہے۔ ہم دونوں گجر قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ہمارے آپس میں ایک سے زیادہ رشتے ہیں۔ آسانی کے لئے آپ انہیں میرا کزن یا بھائی کہہ سکتے ہیں۔ میرا سگا بھائی کوئی نہیں ہے۔

میں ڈاکٹر پیر محمد کے پاس پچھلے پندرہ دن سے ٹھہرا ہوا ہوں اور اپنے عارضہ قلب کے علاج کے لئے یہاں آیا ہوں۔ وہ جسم کے ڈاکٹر نہیں بلکہ ہوائی جہازوں کے علم کے ڈاکٹر ہیں۔ ہاں ان کی بیگم شائستہ ضرور انسانی جسم کی ڈاکٹر ہیں۔ دونوں میاں بیوی میرا اور میرے پھوپھی زاد بھائی غلام سرور کا بہت زیادہ خیال کرتے ہیں۔ غلام سرور میرے سہارے کے طور پر میرے ساتھ آئے ہوئے ہیں اور مجھ سے عمر میں کافی کم ہیں۔

ڈاکٹر طور کے دوست ڈاکٹر محبوب چوہدری اور ڈاکٹر احسان اعوان میرے معالج ہیں۔ جو کچھ اب تک دیکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دونوں ہی بڑے قابل ڈاکٹر ہیں۔ یہ کافی

Marfat.com

عرصہ سے امریکہ میں دلوں کی مرمت کا کام کر رہے ہیں۔ بہت سے امریکی المنسل ڈاکٹران کی ماتحتی میں کام کرتے ہیں۔ یہ سب لوگ اپنے اپنے پیشہ کے علاوہ اپنے دین میں بھی بہت دلچسپی رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر طور مقامی مسجد اور اسلامک سنٹر کے صدر اور روح رواں ہیں۔ ہر روز پنجگانہ نماز باجماعت ہوتی ہے۔ بچے اسلامی تعلیم مسجد میں حاصل کرتے ہیں۔ سرجن محمد اس مسجد کے امام ہیں۔ دمشق سے ان کا تعلق ہے اور دین پر کافی عبور رکھتے ہیں۔ کل جمعہ تھا اور مسجد میں نمازیوں کی تعداد سو کے لگ بھگ تھی۔ منرو ول کوئی بہت بڑا شہر نہیں ہے ایک چھوٹا سا خوبصورت قصبہ ہے۔ اس میں اتنے زیادہ مسلمانوں کا اجتماع ایک روح پرور منظر تھا۔ سنا ہے امریکہ میں دین اسلام بہت تیزی سے پھیل رہا ہے۔

چند دن قبل ڈاکٹر طور نے میری وہ تحریر پڑھی جو میں نے اپنے جذبات اور خیالات پر مبنی اپنے والد محترم چوہدری دل محمد مرحوم کی پچھلے سال وفات پر لکھی تھی۔ پڑھی تو وہ اپنے جذبات سے مغلوب ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کا رشتہ ہی ایسا تھا۔ وہ بابا جی۔ میرے والد محترم کے ہاتھوں میں تو پلے تھے۔ اگلے دن مسجد سے ہم لوگ واپس آ رہے تھے تو ڈاکٹر صاحب کہنے لگے کہ آپ نے انگریزی زبان میں اپنی جو خود نوشت لکھی ہے وہ زیادہ تر آپ کے سرکاری امور کا احاطہ کرتی ہے۔ آپ اپنی ذاتی زندگی کی باتیں خاص طور پر زندگی کے اہم موڑوں کے متعلق کچھ زیادہ تفصیل سے کیوں نہیں لکھتے؟

ڈاکٹر طور کا یہ کہنا تھا اور میرے ذہن میں میری زندگی کی فلم چلنا شروع ہو گئی۔

کچھ یادیں اور کچھ باتیں ابھر آئیں اور ایسی ابھریں کہ انہوں نے مجھے اپنی مضبوط گرفت میں جکڑ لیا۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ مجھے پکڑ لیا۔ ایسی یادیں کہ آسیب کی طرح چمٹیں۔ زندگی کی پوری فلم ہی دیکھ ڈالی اور دیکھتے ہی میں ایک حیرت کدہ میں پہنچ گیا۔

کیا یہ میری زندگی ہے؟ نہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔ بہت دفعہ محسوس ہوا کہ یہ کون سردار نامی شخص ہے جس کی ایسی عجیب و غریب بلکہ اوٹ پٹانگ داستان ہے۔ کبھی میں اس سردار کو پہچان لیتا اور کبھی وہ میرے لئے ایک عجیب الخلقت اجنبی محسوس ہوا۔ میں حیران بھی ہوتا اور پریشان بھی۔ زندگی عجیب گورکھ دھندا نظر آئی۔ میں ہمیشہ یہی سمجھتا رہا کہ آخرت ہم سے اوجھل ہے اور نبی پیغمبر ہمیں آخرت کے متعلق بتانے کے لئے بھیجے گئے۔ مگر اب باسٹھ سال

Marfat.com

کی عمر میں یکدم پیچھے مڑ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ کچھ بھی تو سمجھ میں نہ آیا۔ کہاں شروع اور کہاں ختم؟ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے؟

حقیقت کیا ہے اور غیر حقیقت کیا؟

سب ہی دھوکہ نظر آیا۔ اک فریب نظر تھا سو گزر گیا۔

کیا سوچا تھا اور کیا ہو گیا؟

اور

کیا کیا ہوتا رہا؟

ایک فلم آتی اور چلی جاتی ..... پھر ایک اور فلم عدسہ حیات پر ابھر آتی۔ ان فلموں کا کبھی جوڑ ملتا اور کبھی بالکل نہ ملتا۔

پچھلے چند دن میں نے عجیب کیفیت میں گزارے ہیں۔ سوچتا ہوں اور پھر بھول جاتا ہوں۔ کنفیوژ ہو جاتا ہوں۔ کبھی صاف نظر آتا ہے اور کبھی دھندلا۔ کوئی فیصلہ نہیں کر پایا کہ زندگی کیا ہے اور میری زندگی کیا رہی ہے۔ واقعی عقل کار زار حیات کی حصہ دار نہیں ہے۔ منطق کا زندگی سے کوئی تعلق نظر نہ آیا..... زندگی شاید ذرا اس سے کچھ آگے بڑھ کر چیز ہے یا پھر بالکل ہی مختلف شئے ہے۔ جسم شاید بہانہ ہے یا محض سواری۔ اسی لئے شاید بلھے شاہ کہہ گئے:۔

بلھے

اساں	مرناں	ناہیں
گور	پیا	کوئی ہور

روح سے متعلق سوال کرنا بھی شاید اسی لئے منع ہے اور جب محمد عربیؐ سے بار بار اس حقیقت کے متعلق پوچھا گیا تو ارشاد ربانی ہوا ھذا من امر ربی

اب امر ربی کے متعلق پوچھنا کیا؟ مگر شعور و شیطان بھی تو میرا ہمراز ہے۔ ضدی ہے، تنگ کرتا رہتا ہے۔ ابلیس کی استقامت کی داد دینی ہی پڑتی ہے۔ میں نے دیکھا کہ جس سردار کی مجھے تلاش ہے اس میں تو ابلیس بیٹھا راج کر رہا ہے۔ یہ کم بخت وہاں سے نکلے گا تو سردار صاحب کے درشن کر سکیں گے۔ سردار کو تو اس شوریدہ سر شعور نے بہت ستا رکھا ہے جس نے آدم کو جنت سے نکال باہر پھینکا تھا۔ اپنے شعور پر نازاں سردار زندگی کی حقیقتوں کو کہاں

Marfat.com

دیکھ سکتا ہے۔ شعور کی ٹیڑھی عینک اترے گی تو پھر ہی وہ کچھ دیکھ سکے گا۔ ڈاکٹر پیر محمد نے پتہ نہیں کون سے میرے تار ہلا دیئے تھے کہ میں گم ہو کر ہی رہ گیا۔

یہ کہانی عجیب ہے۔ یہ کہاں شروع ہوئی اور کہاں ختم ہو گئی یہ پورے وثوق سے کوئی نہیں کہہ سکتا۔ ہاں چند ٹکڑے ضرور سامنے آ سکتے ہیں۔ کوئی ان ٹوٹے ٹکڑوں کو جوڑ لے تو اور بات ہے۔

کل (۳۱ جولائی) ڈاکٹر صاحب مجھے اور سرور کو ایک نزدیکی قصبہ Grove city کی سیر کے لئے لے گئے۔ میری بھتیجی اور ڈاکٹر صاحب کی بیٹی صدف ہماری ڈرائیور تھی اور ہم پنسلوانیہ ریاست (امریکہ) کی ڈھلوان و ناہموار وادیوں کو چیرتے نہات ہی کشادہ سڑکوں پر ہوا کے دوش پر فراٹے بھرتے چلتے گئے۔ جوں جوں میں ان پیاری پیاری اور ڈھلکتی ڈھلکتی پہاڑیوں کو دیکھتا جا رہا تھا کہ میرے اندر کے کچھ خوابیدہ منظر اور ارمان ابھرنا شروع ہو گئے۔ چھوٹی چھوٹی منھی منھی سی ہریالی سے اٹی پڑی چوٹیوں کو دیکھتے ہی میرا دل مچلنے لگا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ میرے بچپن کی سوئی ہوئی پیاری پیاری یادوں کی پہاڑیاں تھیں اور میں تھا۔ وہی کوٹھیڑہ جسوالاں۔ وہی درخت۔ وہی پودے۔ وہی کھیت' وہی ڈھلوان وہی مکئی کی فصل۔

میرے آم کے درخت کہاں ہیں؟ میری پینگ کہاں ہے؟ اور میرے جامن۔ وہ گرا وہ پڑا۔ واہ! واہ! وہ دیکھو ٹپکے کا آم۔ وہ ندی۔ وہ چو۔ وہ سواں۔ چمک۔ بارش۔ بدلی۔ گرج چمک۔ او! اماں میں گر گیا۔ کون مجھے دھکے دے رہا ہے۔ ہائے ماں! مجھے سلطان مارتا ہے۔ حرام زادہ کتا۔ اوئے باہمنا تو مجھے دھکے دے رہا ہے۔ تیری یہ جرات۔ خبردار ذرا ٹھہرنا اور پتہ نہیں میں کیا کیا بول رہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے پریشان ہو کر کہا:

چوہدری صاحب! چوہدری صاحب! کیا ہوا؟ کیا ہوا؟ صدف! صدف! روکو! کار روکو

.....اور کار ایک طرف ہو کر رک گئی

سب پریشان تھے۔ سرور پریشان تھا۔ پیر محمد پریشان تھا۔ صدف ہکا بکا تھی

سب نے سمجھا کہ مجھے شاید دل کا دورہ پڑ گیا ہے۔

یا مجھے ہذیاں ہو گیا ہے۔

Marfat.com

سنا ہے کہ جب مجھے دل اور بعد میں معدہ کی بیماری نے بہت زیادہ نڈھال کر دیا تھا تو میری حالت کچھ ہذیانی ہو گئی تھی..... اگرچہ مجھے اس سے انکار ہے مگر کچھ بعید نہیں ہے

سرور نے میری وہ حالت بچشم خود دیکھ رکھی تھی اور گھبرا کر آنکھیں پھاڑے میری طرف نہایت سراسیمگی کی حالت میں دیکھ رہا تھا۔

میں نے پوچھا:

کیا بات ہے؟

کیا ہم باغبانپورہ پہنچ چکے ہیں؟

میرا باغبانپورہ کہنا تھا کہ یہ لوگ اور بھی زیادہ پریشان ہو گئے۔ سمجھے کہ واقعی میری حالت غیر ہو چکی ہے۔

میری حالت واقعی غیر تھی لیکن اس وجہ سے نہیں جو یہ لوگ سوچ رہے تھے۔ میری حالت میرے تخیل نے خراب کر دی تھی اور تخیل بھی بے لگام ہو کر میرا بچپن واپس میرے سامنے آگیا تھا۔ آم اور جامن نہیں تھے مگر مجھے ہر درخت اپنا آم اور اپنا جامن لگ رہا تھا۔ کوئی پتنگ نہیں تھی مگر سب طرف برسات میں ڈلی پینگیں جھول رہی تھیں۔ میرے ہجولی وہیں تھے۔ میرے ساتھ کھیلنے والی لڑکیاں بچیاں اور الہڑیں وہیں تھیں۔ مجھے تو ان کے رسیلے اور اداس گیت بھی سنائی دے رہے تھے۔ بارش کہیں نہیں تھی مگر مجھے ہر طرف کوٹھوڑے والی زور دار بارش نظر آ رہی تھی۔ چو اور سواں ندی چڑھے پانی سے فراٹے مارتی نظر آ رہی تھیں۔ گرودسٹی کا ترجمہ میرے تخیل نے باغبانپورہ کر رکھا تھا.....اور یوں اس بھولے بسرے سماں نے ایک حقیقت کا سماں اور وہ بھی اپنا ہی سماں بنا لیا تھا..... اور کار ٹھہرتے ہی وہ سب سپنے ٹوٹ کر چکنا چور ہو گئے اور میں واپس ہٹسبورگ کی پہاڑیوں اور وادیوں میں آن موجود ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے پریشان ہو کر مجھے پانی پلایا۔ میری نبض دیکھی اور جب میں مسکرایا تو خفا ہو گئے۔

یار تم نے تو ہمیں ڈرا ہی دیا۔

کیا ہوا؟ کیا ہوا؟

خیریت تو ہے۔

تمہاری طبیعت ٹھیک ہے ناں!

"ہاں! ہاں! میں بالکل ٹھیک ہوں" میں نے کہا

87209

Marfat.com

"آپ لوگ اتنے پریشان کیوں ہو؟"

بھئی تم کچھ عجیب باتیں کر رہے تھے۔ بارش۔ کھڈ۔ جامن۔ آم..... پتہ نہیں کیا کیا بک رہے تھے۔ یہاں تو ایسی کوئی چیز نہ ہے۔

یار چھوڑو! تم لوگوں نے مجھے ڈسٹرب کر دیا۔ میں اچھا بھلا کوٹھوڑہ میں گھوم رہا تھا۔ ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔ کوئی رنج تھا اور نہ غم۔ سب لوگ خوش تھے برسات تھی۔ چرند پرند چہک رہے تھے۔ گائیں بھینسیں مست چر رہی تھیں اور مد ہر مد ہر مترنم ہواؤں فضاؤں کے دوش پر نغمہ سرا تھے۔ آپ نے تو ستیاناس کر کے رکھ دیا..... چھوڑو یار سارا تسلسل ہی توڑ ڈالا۔

ڈاکٹر صاحب اور سرور سمجھ گئے کہ مجھے دل کا نہیں بچپنے کا دورہ پڑ گیا ہے۔ اس بچپنے اور لڑکپن کے رنگین خاکے جن کو..... نصف صدی پہلے بڑے ہی دکھ بھرے دل کے ساتھ چھوڑا تھا اور وہ فضا ہر گزرے دن ماہ و سال بلکہ لحہ لحہ تحیلاتی خوبصورت رنگوں سے اک حسین و جمیل قوس قزاح بن چکی تھی اور بہانے بہانے واپس آکر اٹھکیلیاں کرتی رہتی تھی اور کل میرے ساتھ ایک دفعہ وہی واردات ہو چکی تھی۔

.....اور ہم گرو دسٹی کی طرف چل پڑے۔ وہی کیفیت پھر واپس آگئی۔ ایک مقام پر تو میں پکار ہی پڑا وہ دیکھو بھروائیں بنگلہ۔ وہ دیکھو! بھروائیں بنگلہ۔ وہی عمارت وہی رنگ ڈھنگ جو کانگڑہ اور شملہ جاتے راہ پر بنے بھروائیں بنگلہ کا تھا۔ میں بھروائیں پکارتا رہا مگر میری ہڑبونگ پر اب کسی نے زیادہ توجہ نہ دی اور ہم گرو دسٹی پہنچ گئے۔

دیکھتے ہی میں نے کہا بھئی یہ تو گگریٹ ہے..... میرا گگریٹ۔ ڈاکٹر صاحب میرا اور آپ کا گگریٹ قصبہ۔ اسی طرح کی عمارتیں ہیں۔ وہی اینٹیں۔ وہی سفید پینٹ۔ وہی یک منزلہ عمارتیں۔ اسی طرح کے نازک ستون۔ بالکل چینی طرز تعمیر کے ستون اور نازک نازک محرابیں..... بھئی یہ تو گگریٹ ہے۔ میرا گگریٹ۔ وہ دیکھو عین دو کانوں کے درمیان میں سے نالہ بہہ رہا ہے۔ ذرا خشک ہے۔ اس میں بہتا گونجتا پتھروں سے ٹکراتا پانی تھا۔ یہاں پانی نہیں تو کیا ہوا..... وہ دیکھو ڈاکٹر صاحب نڑ کے پودے۔ آپ کو یاد ہے ہم نڑ سے اپنی قلمیں بناتے اور تراشا کرتے تھے۔ واہ! واہ بھئی اپنا گگریٹ آگیا ہے۔ چلو دیکھتے ہیں ہندو کھتری کی مٹھائیوں کی دوکان کہاں ہے..... چلو گرم گرم جلیبیاں کھاتے ہیں۔ بھئی واہ! واہ! فتو

Marfat.com

کے چٹخارے والے پکوڑے کھائیں گے۔ ابھی ابھی ڈھول اور ڈھمک کی آواز آئیگی۔ اس کی لے اور تان پر گانے ہوں گے۔ سکھ بھنگڑے ڈالیں گے اور گاؤں کی الڑیں گدھا ڈالیں گی۔ بازی گر ہوں گے اور کشتیاں ہوں گی۔

میں ان ہی خیالات میں کھویا پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کھڑا تھا کہ ایک نہایت ہی بھدی اور دیو ہیکل خاتون مجھ سے آن ٹکرائی یا شاید میں اس سے ٹکرا گیا مگر نتیجہ یہ نکلا کہ میں دھڑام سے گر گیا اور گرنے کی زبردست آواز بھی آئی اور اردگرد کے لوگ نہایت کھل کھلا کر ہنس پڑے۔

میں نے شرمندگی بھی محسوس کی اور درد بھی

سرور نے بڑھ کر مجھے اٹھالیا ورنہ شاید میں کتنی دیر وہیں گرا پڑا رہتا۔

میں نے اپنا قمیض شلوار جھاڑا اور سوچ ہی رہا تھا کہ یہ کتنے بیہودہ لوگ ہیں۔ ایک شریف۔ نحیف و نزار۔ غریب الدیار شخص پر کس طرح ہنس رہے ہیں۔

بڑے بدتمیز ہیں۔ اکھڑ اور بے ادب.....اور

ابھی میں اپنی لغویات کی لغت مزید درست کر ہی رہا تھا کہ زور سے آواز آئی

کلمزی بھارتی (Clumsy Indian)

میں نے خاموشی ہی میں خیریت سمجھی کہ پاکستان کی عزت تو بچ گئی۔ میری خیر صلہ ہے۔ بدنامی ہوئی ہے تو بھارت کی ہوئی ہے۔ ویسے بھی اب کوٹھہڑہ جسوالاں بھارت میں ہے۔ گگریٹ بھی بھارت میں ہے۔ چھوڑیں کوٹھہڑہ اور گگریٹ کو۔ پاکستان کی پگڑی سنبھال تو او! سردار۔

یوں ہم لوگ بھارتی گگریٹ اور کوٹھہڑہ جسوالاں کو خیرباد کہہ کر واپس لوٹ پڑے بلکہ امرکی باغبانپورہ کو بھی وہیں چھوڑ آئے مگر ضدی اور بھولا بھالا بچپنا کب ساتھ چھوڑتا ہے۔

رات بھر خواب اسی کے تھے اور اب دن بھی اس کا ہے۔ اگست ماہ ہے۔ میری زندگی میں سب سے بڑی تبدیلی لانے والا مہینہ یہی ہے۔ ہم سب کی زندگی میں سب سے بڑی تبدیلی لانے والا یہی مہینہ ہے کہ اگست نے ایک جہان نو پیدا کرنا تھا۔

۱۹۴۷ء کا سن ہے۔ سکول میں گرمی کی چھٹیاں ہیں۔ عید کی آمد آمد ہے مگر کچھ عجیب سی اداسی ہے۔ ہر آدمی ہراساں ہراساں سا نظر آرہا ہے۔ روزے رکھ رہا اور ہر بڑا بھی رہا ہے۔ فضاء میں کچھ خوف سا ہے.....کچھ ان دیکھا سا خوف ہے۔ ۳ جون کے پلان کا

Marfat.com

اعلان ہو چکا ہے۔ ہندوستان تقسیم ہو گا۔ ایک حصہ بھارت کہلائے گا اور دوسرا پاکستان۔ پاکستان میں مسلمان ہوں گے اور بھارت میں ہندو۔ حد کونسی ہوگی۔ اسکا پتہ نہیں۔ پنجاب تقسیم ہو گا۔ کوئی کہتا ہے کہ ستلج سرحد ہوگی اور کوئی کہتا ہے کہ بیاس مگر ہر طرف ایک عجیب و غریب بے یقینی ہے۔ کون سی زمین کس کی ہوگی اور کون سا گھر کس کا ہے؟ کچھ معلوم نہ ہے۔ ہر زمین غیر نظر آ رہی ہے اور ہر گھر پرایا۔ ایک عجیب کیفیت ہے۔ بتائے بتائی نہ جائے اور سنائے سنائی نہ جائے..... اور ہر کوئی قبرستان ضرور جاتا ہے شاید اپنے مردوں کو مل رہے ہیں۔ شاید ان کے اندر کا کچھ کہہ رہا ہے کہ اب زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہر سکیں گے۔ بہتر ہے کہ ہمیشہ بچھڑ جانے والوں کو جتنا زیادہ مل لیا جائے بہتر ہے..... یا شاید کچھ زندہ لوگ اپنے آپ کو مردوں کے زیادہ قریب پا رہے ہیں اور اپنی اپنی جگہ بنا رہے ہیں۔ کچھ عجیب سا سماں ہے۔ گاؤں کی عورتیں بھی قبرستان زیادہ جانے لگی ہیں اور یوں موت کی یاد کچھ زیادہ ہی تازہ ہو رہی ہے۔ عجیب فضا ہے اور عجیب سماں۔ ہر کوئی سہما سہما سا ہے۔ میں اور سلطان سکول کی طرف جاتے ڈرتے ہیں۔ پتہ نہیں کیوں؟ حتیٰ کہ اس طرف مسلمان وزیرا تیلی کا کولہو ہے۔ ہم وہ بھی جھوٹنے نہیں جاتے۔ یہ کیا ہو گیا ہے؟ کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ ہم نیچے کی زمین میں لگی جامنیں اٹھانے نہیں جاتے حالانکہ ہم سب بچے کتنے شوق سے وہاں جاتے تھے۔ کوئی بتاتا بھی نہیں کہ کیا وجہ ہے؟ کیا ہونے والا ہے۔

ہر کوئی عجیب منہ اٹھائے یا چھپائے پھر رہا ہے۔ کچھ پتہ نہیں چل رہا کہ آخر ماجرا کیا ہے؟

آخر عید آ گئی۔ سب گاؤں کے مسلمان مسجد پہنچ چکے ہیں۔ ساتھ شیخوں کا بنگلہ ہے۔ وہ بھی نمازیوں سے بھرا پڑا ہے۔ میاں بدر الدین مہندی سے رنگے اپنے لال بالوں کے ساتھ امامت کے لئے موجود ہیں مگر اداسی ہر طرف چھائی ہوئی ہے۔ ہم بچوں کو کچھ پتہ نہیں چل رہا کہ بات کیا ہے مگر ہم محسوس کرتے ہیں کہ بات کوئی ضرور ہے۔ چہ مگوئیاں ہو رہی ہیں۔ میں اور سلطان پانچویں جماعت کے طالب علم ہیں اور اپنے آپ کو بہت معتبر اور دانا سمجھتے ہیں مگر یہاں پر آکر ہماری عقل جواب دے جاتی ہے اور ہمارا علم ہماری کوئی مدد نہیں کرتا۔

.....اور مسجد میں سے ایک آواز اٹھتی ہے کہ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ بن کر رہے گا پاکستان۔ ہم لے کر رہیں گے پاکستان۔ پاکستان زندہ باد! پاکستان زندہ باد۔ ارد گرد کی کھڈوں اور پہاڑوں کی طرف سے وہی آواز بار بار لوٹ کر آتی ہے پاکستان زندہ۔ پاکستان زندہ باد۔ سلطان کہتا ہے کہ پہاڑ کہہ رہے ہیں کہ پاکستان زندہ باد پاکستان زندہ باد..... وہ دیکھو پہاڑ بھی پکار رہے

Marfat.com

ہیں کہ پاکستان زندہ باد ..... وہ جوگندر سنگھ کا بچہ کدھر ہے؟ وہ کہتا تھا کہ پاکستان کبھی بھی نہیں بن سکتا۔ اب تو پاکستان بن ہی گیا۔ اب تو پہاڑ بھی پکار اٹھے ہیں۔ پہاڑ گواہی دے رہے ہیں کہ پاکستان بن گیا.....اب جوگندر سنگھ سے پوچھیں گے کہ بچو کیسے رہا۔

اتنے میں نماز کھڑی ہوگئی۔ سب نے اطمینان سے نماز پڑھی۔ ختم ہوئی تو سب کہہ رہے تھے کہ اب کوچ کا وقت آگیا ہے۔ میاں محمد بخش سب سے کہہ رہے تھے کہ اب پاکستان چلو۔ جو مسلمان ہے وہ پاکستان چلے۔ جو مومن صادق ہے وہ پاکستان چل پڑے۔ اب یہ گاؤں ہمارا نہیں۔ اب یہ زمینیں ہماری نہیں۔ اب یہ گھر ہمارے نہیں۔ اب یہ دیس ہمارا نہیں..... چل بھائی چل اپنے پیا کے دیس --- اپنے دیس۔

''وہ دیکھو! میاں جی گا رہے ہیں'' سلطان نے مجھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ ''یہ پیا کون ہے؟ کدھر ہے؟ کس کا دیس ہے؟''

''شاید پاکستان ہی پیا کا دیس ہے'' میں نے کہا

''سردار! یہ پیا کون ہے؟'' سلطان نے کہا

''شاید میاں جی کا بیٹا ہے'' میں نے نہایت معصومیت سے کہا

''واہ! بھئی واہ! میاں جی نے تو شادی بھی نہیں کی۔ ان کا بیٹا کہاں سے آگیا؟'' سلطان نے کہا۔

''شاید نیک لوگوں کے بغیر شادی ہی کے اولاد ہو جاتی ہو'' میں نے کہا

''بے وقوف کہیں کا۔ شادی کے بغیر کیسے اولاد ہو سکتی ہے'' ساتھ ہی کھڑے نور محمد نے کہا چلو! چھوڑو یار۔ کس بحث میں پڑ گئے ہو۔ ہو گا یہ پیا بھی کوئی

اور ہم باہر نکل کر گلی ڈنڈا کھیلنے میں مصروف ہو گئے۔

Marfat.com

کھلا ڈاکہ

عید کے اگلے روز میں نے صبح اٹھ کر دیکھا تو ہمارے مکان سے ذرا نیچے درختوں کے جھنڈ کے تلے بہت سے لوگ بیٹھے ہیں۔ چارپائیاں بچھی ہیں اور دو عدد حقوں پر کش لگ رہے ہیں۔ ہمارے گھر کے سامنے سے کھڈ بہتی تھی اور داہنے ہاتھ ایک چو تھا۔ کھڈ میں ہمیشہ پانی ہوتا تھا مگر چو صرف برسات میں بہتا تھا۔ کھڈ میں ریت ہوتی تھی اور چو گول گول پتھروں سے بھرا ہوتا تھا اور دونوں کے سنگم پر درختوں کا ایک بہت بڑا جھنڈ بنا ہوا تھا۔ اس جھنڈ کے نیچے گاؤں کے اکثر اکٹھ ہوتے تھے۔ بیاہ شادی دعوتیں اور تصفیہ طلب معاملات کے متعلق پنچائتیں بیٹھتی تھیں۔

اس روز بھی میں نے سمجھا کہ شاید کوئی ایسی ہی تقریب ہوگی اور میں خوش خوش بھاگ کر وہاں گیا۔ دیکھا تو ہمارے دادا چوہدری عمر بخش وہاں براجمان ہیں اور بہت سے ہمارے رشتہ دار' مامے' نانکے اور چچا پھوپھا قسم کے لوگ ان کے ارد گرد جمع ہیں۔ اور طرح طرح کی باتیں کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی ہماری اور دوسرے لوگوں کی گائیں' بھینسیں اور بیل بکریاں ہیں۔ کچھ عجیب سا سماں ہے۔ یہ صورت میں نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ ماحول سنجیدہ بھی ہے اور لا ابالی بھی۔ ہر طرح کے لوگ وہاں آ رہے ہیں۔ سواں پار کا ایک خوش پوش سا نوجوان آیا۔ حسب دستور اسے لسی پانی دیا گیا اور پھر وہ حقہ کے کش پر حال احوال دینے لگا اور معلوم ہوا کہ

Marfat.com

وہاں کے ہندو جو ہمیشہ ان لوگوں کے ساتھ اچھی طرح سے رہتے بستے آئے تھے اور مسلمانوں سے دبتے تھے اب انہیں عجیب عجیب نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ وہ مسلمانوں کے مال پسو پر نظریں رکھے ہوئے ہیں۔ اور پھر اس نوجوان نے بڑی ہی سنجیدگی سے کہا کہ اب یہاں وسہ‌ہا بہت مشکل ہو چکا ہے۔ اگر یہاں رہنا ہے تو پھر ہم سب کو ہندو بننا پڑے گا اور یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔
ہم مرجائیں گے مگر اپنا مذہب نہیں چھوڑیں گے اور ہم سب نے پاکستان کی طرف ہجرت کرنیکا فیصلہ کیا ہے۔ آپ لوگ کیا سوچ رہے ہیں؟

''ہم سب نے بھی یہی فیصلہ کر رکھا ہے''۔ سب موجود لوگوں نے ایک ہی وقت میں ایک ہی بات کر دی۔

''بھائی بزرگوں کی قبروں کو چھوڑ کر جانا بہت مشکل ہے۔ ہمارے بڑے وڈیرے کیا کہیں گے کہ ہم انہیں چھوڑ کر بھاگ گئے مگر یہاں رہا تو بھی نہیں جاسکتا۔ یہ ہندو لوگ تو ہمیں کھاجائیں گے۔
بس اب چلو چل ہے آج گئے یا کل۔ سب کو کوچ کرنا ہوگا''۔

میرے دادا نے بڑے ہی دکھ سے اور ٹھہر ٹھہر کر یہ بات کی۔

پھر کہا کہ یہ دیکھو ہم نے اپنا سارا مال پسو یہاں لاکھڑا کیا ہے۔ شاید چار پیسے مل جائیں۔ راستے میں کام آئیں گے۔ پتہ نہیں راستہ میں ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔
کچھ کھانے پینے کو ملے گا بھی یا نہیں۔ سنا ہے سکھ مسلمانوں کا قتل عام کر رہے ہیں۔ ہمارے پاس تو ہتھیار بھی نہیں ہیں۔ خالی ہاتھ کیا کرلیں گے..... اچھا اللہ مالک ہے''۔

یہ سن کر سب لوگ خاموش ہو گئے۔ فضا میں اک عجیب سی اداسی اور سوگ ناکی تھی۔ بس اک حقے کی گڑگڑ کی آواز آرہی تھی۔ کسی کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔

مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔ آخر ہمیں روٹی کیوں نہیں ملے گی؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم جب چاہتے ہیں ہمیں روٹی مل جاتی ہے۔ دودھ پینے کو ملتا ہے۔
دن رات ملائی اور مکھن ملتا ہے۔ گندم کی روٹی۔ پراٹھے۔ مکئی کی پیلی مزیدار روٹی اور سرسوں کا ساگ جب چاہیں کھائیں۔ بس ماں کو کہنا ہوتا ہے۔ سب کچھ مل جاتا ہے۔ اب بھی ماں کے پاس جائیں گے اور جو دل کرے گا وہ کھانے کو مل جائے گا۔ یہ لوگ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ کیوں کر رہے ہیں؟

Marfat.com

میں یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ کہیں سے ایک تو نبے والا راگی آ گیا۔ اور نہایت ہی دلگداز آواز میں کچھ اس طرح سے گانے لگا کہ سب محل مڑھیاں ادھر ہی رہ جائیں گی۔ نام رہے اللہ کا۔ اٹھ چل بندیا..... سدا نہ بیٹھے رہنا اتھے کے نیں وغیرہ وغیرہ.....

راگی نے گانا کیا چھیڑا کہ سب لوگ دھاڑیں مار مار کر رونے لگ گئے۔ مجھے یہ سب کچھ بالکل سمجھ نہیں آرہا تھا۔ میں نے سوچا کاش سلطان یہاں ہوتا تو میں اس سے پوچھتا کہ یہ کیا ہے مگر آج سلطان بھی یہاں نہ تھا اور کسی بڑے سے میں پوچھ سکتا نہیں تھا۔ ہمیں بڑوں سے سوال کرنیکی عادت تھی اور نہ ہی جرات۔

میں نے اردگرد دیکھا تو میرے والد بھی وہاں موجود نہ تھے۔ دو چچا بھی غیر حاضر تھے۔ صرف ہمارے ایک چچا دادا کے ساتھ تھے یا باقی رشتہ دار اور گاؤں کے لوگ۔ معلوم ہوا کہ گاؤں کے بہت سے مسلمان مختلف پہاڑیوں اور مورچوں پر بیٹھ کر پہرہ دے رہے ہیں کہ کہیں اچانک سکھ حملہ آور ہمارے گاؤں نہ پہنچ جائیں۔

گفتگو ہو رہی تھی کہ سکھ بہت ظالم لوگ ہیں۔ ذرا ترس نہیں کرتے۔ مردوں کو نیزوں اور بھالوں میں پرو لیتے ہیں۔ عورتوں کو اٹھا لیتے ہیں اور بچوں کو ذبح کر ڈالتے ہیں۔ میں یہ سن کر خوف سے کانپنے لگا اور میں نے دل ہی دل میں سوچ لیا کہ سکھ باگھ اور بھیڑیئے سے بڑا کوئی زیادہ ظالم خونخوار درندہ ہے۔ پھر میں سوچنے لگا کہ میرا ہم جماعت جوگندر سنگھ تو ایسا نہیں ہے۔ وہ تو بڑا بھلا مانس اور بے ضرر سا سکھ ہے۔ پھر میں نے سوچا کہ جن سکھوں کی یہ ہمارے بڑے بات کر رہے ہیں وہ کوئی خاص قسم کے خطرناک جنگلی سکھ ہیں جن کا جوگندر سنگھ سے کوئی تعلق نہ ہے اور ان سے ڈرنا ہی بہتر ہے۔

اتنے میں کسی نے بتایا کہ چک سادو میں سکھوں کے ساتھ بہت بری ہوئی۔ سکھوں نے چک سادو کے مسلمانوں پر حملہ کر دیا مگر ان کی بدقسمتی کہ وہاں کیپٹن ریاض فوج سے چھٹی پر آیا ہوا تھا۔ اس کے پاس پکی گولی والی فوجی بندوق تھی جس کی مار بہت دور تک ہوتی ہے۔

.....اور کیپٹن ریاض نے وہ بندوق سکھوں پر چلا دی۔ سکھوں کو سمجھ ہی نہ آئی کہ ان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے اور وہ دھڑا دھڑ گرنے مرنے لگے اور آخر کار بھاگ اٹھے۔ اپنے مردے بھی نہ اٹھا سکے۔ یوں اب مسلمانوں کی ان پر دھاک بیٹھ گئی ہے۔

Marfat.com

کسی نے کہا کہ اب انہیں مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کی ہمت ہی نہ ہو گی۔ اب آپ لوگ بے فکر ہو جائیں۔ اللہ کو منظور ہوا تو اب سکھ ادھر کا منہ نہیں کریں گے۔ انہیں معلوم ہے کہ کیپٹن ریاض یہاں بھی پہنچ جائے گا اور انہیں بھون ڈالے گا۔ بھائی ریاض مسلمان بھائی ہے۔ وہ ہم سب کی رکھوالی کرے گا اور وہ اب ہر جگہ پہنچ جائے گا۔

یہ سن کر مجھے کیپٹن ریاض کوئی مافوق الفطرت مخلوق محسوس ہونے لگی جو ہر جگہ پہنچ جائیگی اور مسلمانوں کی حفاظت کریگی..... ریاض میرا ان دیکھا ہیرو بن گیا۔ ریاض میرے لئے ایک دوسرا امیر حمزہ تھا جو ہمارے بہت سے قصہ کہانیوں کے مستقل کے ہیرو ہیں۔ یہ سوچ کر مجھے بہت بسہارا محسوس ہوا اور سکھوں کا خوف دور ہو گیا۔

اتنے میں راگی نے بھی زور دار آواز نکالی کہ جدوں **نکلیا** شیر حمزہ میدان وچ تے کانواں دے پد نکل گئے۔

اور میرے دادا کے منہ سے معاً نکلا "**ہوھنی یاوا**۔ کول بندوق نہیں تے گپ آسمان جتنی"۔

راگی یکدم خاموش ہو گیا اور ایک دفعہ پھر بزدلی چھاگئی۔ سب کی خوش فہمی ہرن ہو چکی تھی اور سکھوں کا خوف پھر عود کر آیا۔

مزے کی بات ہے کہ کیپٹن ریاض کوئی فرضی کردار نہیں تھا۔ وہ واقعی گوشت پوست کا بنا انسان تھا جس نے واقعی چک سادو میں سکھوں کے دانت کھٹے کر دکھائے تھے۔ وہ بعد میں پاکستان فوج میں ایک مایہ ناز بہادر افسر بنے اور کرنل کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔ منڈی بہاؤ الدین میں ہجرت کے بعد آباد ہوئے اور ان کی ایک بیٹی اسی شہر مزدول میں اپنے بچوں اور خاوند کے ساتھ رہ رہی ہے جہاں بیٹھ کر میں یہ سطور لکھ رہا ہوں۔ میں اپنے بچپن کے خیالی ہیرو سے زندگی میں کبھی بھی نہ مل سکا مگر وہ ہمیشہ میرے ہیرو رہے اور میرے تخیل میں حملہ آور سکھوں کو ڈراتے تھے اور مجھے محفوظ کرتے تھے۔

اب سورج مزید چمک اور چڑھ کر سائے کھسکا رہا تھا۔ چارپائیوں کی جگہ بدلی جا رہی تھی اور گائیں بھینسیں بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ ہٹائی جا رہی تھیں..... مگر کوئی گاہک نہیں آرہا تھا۔ ہندوؤں کو معلوم تھا کہ مسلمان ان جانوروں کو کہاں لے جا سکیں گے۔ وہ انہیں

Marfat.com

خریدیں کیوں؟ یہ تو چند دنوں میں انہیں مفت ملنے والے ہیں مگر پھر بھی میرے بڑے وڈیرے کسی موہوم سی امید میں اپنی طرح کی منڈی لگائے بیٹھے تھے کہ شاید کچھ وشت ہو جائے۔

اتنے میں میں نے دیکھا کہ ہمارے ایک رشتہ کے چچا جنہیں سب لوگ پہاڑی چچا کہتے تھے نے ایک نہایت ہی خوبصورت خوب پلا ہوا ڈب کھڑ بادھاری دار اور میرا دوست بکرا کانوں سے پکڑ لیا۔ پہاڑی چچا اور ایک دوسرے آدمی نے مل کر بکرے کو زمین پر لٹایا اور ذبح کر ڈالا۔ میں ہکا بکا دیکھتا رہ گیا۔ بکرے کا خون دیکھ کر میں زار و قطار رونے لگا۔ ایک تو میرا وہ بہت ہی پسندیدہ بکرا تھا اور دوسرے میں نے کبھی بھی کوئی جانور ذبح ہوتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ در حقیقت ہمارے ہاں بہت کم گوشت خوری ہوتی تھی بلکہ سمجھئے ہوتی ہی نہ تھی۔ اس علاقہ میں ہندو مت کا بہت غلبہ تھا اور وہ ماس نہیں کھاتے تھے۔ مسلمان بھی ان سے متاثر تھے اور گوشت خوری سے پرہیز کرتے تھے۔ یہ سارا منظر میرے لئے بہت ہی تکلیف دہ تھا مگر میں کچھ کر نہ سکتا تھا۔ ٹک ٹک دیدم والی کیفیت تھی۔ بس مجھے پہاڑی چچا سے چڑ ہو گئی اور میرے دل میں بیٹھ گیا کہ یہ پہاڑی لوگ بہت ظالم اور سفاک ہوتے ہیں حالانکہ ہم سب ہی پہاڑی علاقہ کے رہنے والے تھے مگر یہ حضرت ذرا زیادہ اونچائی پر رہتے تھے اور پینے کا پانی نیچے سے بھر کر لے جاتے تھے۔ اس وقت سے میرے دل میں بیٹھ چکا ہے کہ شاید پانی کی فراوانی انسان کو رقیق القلب بنا ڈالتی ہے۔ اسی لئے میں پانی کا استعمال خوب کرتا رہتا ہوں کہ یہ انسان کو پاک بھی کرتا ہے اور پالتا بھی ہے۔

کچھ دیر بعد میں نے دیکھا کہ ان لوگوں نے میرے پیارے بکرے کی کھال نہایت بے رحمی سے اتار ڈالی اور ایک درخت پر الٹا لٹکا کر اس کی درگت بنا ڈالی۔ نہایت سنگدلی سے اسے ٹکڑے ٹکڑے کیا اور ایک بہت بڑے پتیلے میں ڈالکر وہیں آگ جلا کر پکانا شروع کر دیا۔ میں نے کبھی مردوں کو کھانا پکاتے نہیں دیکھا تھا۔ ہمارے ہاں بلکہ سب گھروں میں عورتیں ہی کھانا پکاتی تھیں۔ صرف بازار میں مرد مٹھائی۔ جلیبیاں' پکوڑے تلتے دیکھتے تھے مگر عورتوں کے علاوہ کھانا پکانے کا تصور میرے ذہن میں کبھی نہ آیا تھا نہ آسکتا تھا۔ اس دن میں نے جب مردوں کو اس طرح کھانا پکاتے ہوئے دیکھا تو مجھے ان سے اور بھی گھن ہو گئی اور دل ہی دل میں میں انہیں برا سمجھنے لگا اور ان کو میں نے انسانیت کے درجہ ہی سے گرا دیا۔

Marfat.com

اب مجھے ساری فضاء ہی بوجھل نظر آ رہی تھی۔ وہ مجلس ہی مجھے بے معنی معلوم ہونے لگی تھی۔ میں نے سوچا یہ سب لوگ پاگل ہو گئے ہیں۔ میرے دادا شاید لالچی ہو گئے ہیں۔ میرا دل کرے کہ میں یہ بات کسی سے کروں مگر میرے والد تو وہاں تھے ہی نہیں اور ہوتے بھی تو کبھی دادا کے خلاف ایک لفظ نہ سنتے بلکہ مجھے تھپڑ رسید کر دیتے۔ والدہ سے بھی جا کر بات میں نہیں کر سکتا تھا کہ بڑوں کے خلاف بات تو در کنار سوچنا بھی گناہ تھا۔

میرے دادا گائیوں بھینسوں کے بہت بڑے بیوپاری اور معالج تھے۔ ان کا شہرہ دلی اور شملہ تک تھا اور ان کے پاس بھینسوں کی بہترین نسل اور انتخاب ہوتا تھا۔ ہمارے پاس ایک ایسی بھینس تھی جس کی اس وقت قیمت ۹۵ روپے سنی گئی تھی۔ بڑی دور دور سے لوگ اس بھینس کو دیکھنے آتے تھے اور خریدنا چاہتے تھے مگر میرے دادا اس بھینس اور اس کی کٹیوں کو کسی قیمت پر بیچنا پسند نہ کرتے تھے۔ آپ حیران ہوں گے کہ اس وقت ہمارے ہاں زمین کی قیمت تقریباً سو روپے فی ایکڑ تھی اور اس بھینس کی قیمت ۹۵ روپے پڑ چکی تھی۔ پھر بھی ہمارے دادا اسے بیچنے کے لئے تیار نہ تھے۔ وہ بھینس مجھے بھی بہت پیاری تھی۔ آج وہ بھینس بھی وہاں کھڑی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا ہمارے دادا اس بھینس کو بھی بیچ دیں گے؟ مگر آج تو کوئی گاہک نہیں آ رہا تھا۔

اتنے میں دیکھا کہ چند اوباش قسم کے ہندو نوجوان آئے۔ وہ سب راجپوت تھے۔ ہم انہیں رانگڑ کہتے تھے۔ ایک برہمن بھی آیا جو عمر میں ذرا بڑا تھا اور سب لوگ اسے مہتہ جی کہتے تھے۔ رانگڑوں میں سے ایک نے میرے دادا سے کہا "چوہدری اپنی لاڈلی کا کیا لینا ہے؟"

میرے دادا نے ایک گھاگ بیوپاری کی طرح کہا "جوہر کی قیمت جوہری ہی جانتا ہے جاہل کیا جانے۔ آپ مہاراج بہت بہتر جانتے ہیں کہ یہ دانا کیا ہے۔ آپ کی نگاہ کمال ہے" مگر آج رانگڑ باتوں میں آنے والا نہیں تھا۔ آج اس کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ ایکدم سے کہنے لگا۔

"چوہدری جی! یہ مال تو اب ہمارا ہے۔ تم کہاں لے جاؤ گے مگر ہم قدر دان ہیں۔ ہمارے باپ دادا سے آپ کے تعلقات چلے آئے ہیں۔ ہم یہ لے جائیں گے اور دام بھی نہیں دیں گے۔ ہاں آپ کو اچھی نسل شناسی اور پرکھ کا انعام ضرور دیں گے"۔

یہ کہتے ہوئے انہوں نے پانچ روپے ہمارے دادا کی ہتھیلی پر رکھے اور بھینس کھول لی۔ ہمارا دادا کی زبان گنگ ہو گئی اور ان کی سفید داڑھی آنسوؤں سے تر تھی۔ میں نے اپنے

Marfat.com

دادا کی آنکھوں میں کبھی آنسو نہ دیکھے تھے۔ یہ دیکھ کر میں بھی رونے لگا۔ باقی سب لوگ بھی رو رہے تھے۔

مجھے وہ رانگڑ اس وقت زہر معلوم ہو رہے تھے۔ میں انہیں راکشش کی صورت میں دیکھ رہا تھا۔ پتہ نہیں مجھے کیا ہوا میں نے بڑھ کر ان سے اپنی بھینس کا رسہ چھین لیا۔ رانگڑوں کو میری گستاخی پر بہت غصہ چڑھا اور انہوں نے مجھے دور دے پٹخا..... اور میں کچھ بھی نہ کر سکا میں تھا اور میرے آنسو۔

میری اور میرے دادا کی سب سے پیاری بھینس ہماری آنکھوں کے سامنے جا رہی تھی ..... کسی نے بس اتنا کہا کہ یہ تو کھلاڑا کہ ہے.....

میرے دادا مرحوم نے بہت ہی نحیف آواز میں بس اتنا کہا۔

"انھی پیئے تے کتا چٹے"۔

"چلو بھائی بن اتھے گزارہ نہیں۔ سب کچھ بوچڑ خانے دے دیو"۔

اور سر نیچے کئے مسجد کو چل دیئے اور میں اپنی ماں کی گود میں جا کر سسکنے لگا۔

میں یہ واقعہ کبھی نہ بھول سکا۔ میرے لئے یہ ایک سنگین صدمہ تھا جس نے میری زندگی پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ اس کے بعد میں کبھی بھی اور کسی بھی شکل میں کسی کی مجبوری یا مشکل سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ جب بھی کوئی ایسی صورت ہوئی میرے سامنے میرے دادا کی وہ کیفیت ایک متشکل حقیقت بن کر آکھڑی ہوتی۔

۱۹۷۱ء میں سید کرار حسین میرے سیکورٹی انسپکٹر تھے اور میں راولپنڈی اسلام آباد کا ایس۔ پی سپیشل برانچ تھا۔ سید کرار حسین ہر روز مجھے کہتے کہ صاحب یہ وقت کبھی ہاتھ نہیں آئے گا۔ بنگالی اپنے اسلام آباد کے رہائشی اور تجارتی پلاٹ کوڑیوں کے حساب سے بیچ رہے ہیں۔ یہ بعد میں بہت مہنگے ہو جائیں گے۔ آپ خرید لیں مگر میں ہمیشہ جواب دے دیتا۔ آخر کار انہوں نے میرے لئے دو عدد پلاٹ صرف چار ہزار روپے میں خرید لئے۔ میں نے کہا میں نہیں لوں گا۔ کیوں؟

اس لئے کرار حسین کہ میرے پاس پیسے نہ ہیں۔

کرار نے کہا کوئی بات نہیں۔ پیسے بعد میں دے دینا صاحب۔

Marfat.com

میں نے کہا نہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ میرے پاس پیسے ہوں بھی تو میں ان بھائیوں کی مجبوری سے فائدہ نہیں اٹھاؤں گا اور پھر مجھے اپنے بچپن کا یہ واقعہ سنانا پڑا۔

"نہیں کرار حسین میں مر جاؤں گا مگر میں ایسا نہیں کر سکتا" مجھے کہنا ہی پڑا۔

بے چارہ کرار حسین۔ اچھا صاحب آپ کی مرضی کہہ کر خاموش ہو گیا مگر آخری بات کہہ گیا کہ آپ بعد میں پچھتائیں گے ضرور .....۔

مگر میں کبھی نہیں پچھتایا۔ وہ رانگز مجھے ایسی باتوں سے بہت دور لے گیا تھا۔

ہاں اگر لے لیتا تو ضرور پچھتاتا۔ میرے جذبات مجھے بہت عزیز ہیں کہ یہی میری زندگی ہے۔ دن دیہاڑے کا یہ ڈاکہ میری کایا پلٹ گیا تھا۔

Marfat.com

اجاڑہ

عید کے تیسرے دن اور رانگڑ کے بھینس بھگانے کے دوسرے دن بلکہ صبح کے وقت کا واقعہ ہے۔ کچھ عجیب واقعہ ہے جس کا نقش آج بھی میرے ذہن میں اسی طرح نقش اور تازہ ہے جیسے یہ کل کا واقعہ ہو۔ ایسا قصہ جو ندی کے بہاؤ کے ساتھ آگے ہی آگے بہتا جائے اور پھر کبھی واپس نہ آسکے یا آئے۔ سنا ہے نہ کہ بہتی ندی کا پانی پھر کبھی واپس اسی جگہ پر نہیں آیا۔ یہی طرفہ تماشا وقت کے دریا کا ہے کہ آگے ہی آگے یکطرفہ بہتا جاتا ہے اور کبھی واپس اس جگہ نہیں آتا جہاں سے گزر جائے۔ میرے ساتھ اس صبح یہی ہونے والا تھا اور ہو گیا۔

صبح سویرے میں اٹھ کر آنکھیں مل رہا ہوں۔ سورج نکلنے کو ہے۔ آسمان ابر آلود ہے۔ چرند پرند چہک رہے ہیں پیاری پیاری سب سے پیاری بھینس جا چکی ہے۔ دوسری بھینسیں۔ کٹیاں۔ گائیاں۔ بیل۔ کٹے۔ بکرے بکریاں کہیں نیچے چراگاہ میں چر رہی ہیں یا آوارہ گھوم رہی ہیں۔ مال ڈنگر کا کسی کو کوئی خیال نہیں ہے۔ میرے دادا گھر پر نہیں ہیں۔ شاید کل سے نہیں آئے۔ شاید مسجد ہی میں رہ گئے ہوں۔ میری دادی بھی آج موجود نہ ہے وگرنہ وہ صبح صبح بیلوں کو آٹا کھلا رہی ہوتی۔ ادھر ادھر دیکھا تو بیل بھی وہاں موجود نہ تھے۔ ہمارے کھیت ہمارے گھر کے ساتھ ہی تھے وہاں پر کوئی ہل نہ چل رہا تھا۔ بیلوں کے گھنگروؤں کی کوئی آواز نہ آ رہی تھی۔ میرا کوئی چچا بیلوں کو ہٹ ہٹ ٹک ٹک کی آوازیں دیکر ہل

Marfat.com

پر سیدھا نہیں رکھ رہا تھا۔ میرے والد بھی رات بھر کے پہرے سے ابھی واپس نہ آئے تھے۔
سب سنسان تھا۔ عجیب تھا۔ سب لوگ موت کا پہرہ دے رہے تھے۔

گھر پر صرف میری والدہ تھی یا میری بڑی اور چھوٹی بہن۔ عجیب اداس سی صبح تھی اور میں ساتھ والے گاؤں لوہارلی کی گھاٹی کی طرف ایسے ہی گھور گھور کر دیکھ رہا تھا کہ ایک بہت ہی تیز..... بہت ہی زیادہ تیز بھاگتا ہوا آدمی نمودار ہوا اور شور مچاتا گیا کہ سکھ آگئے۔ سکھ آگئے۔ سکھوں نے حملہ کر دیا۔ سکھوں نے حملہ کر دیا۔ بچو۔ چھپو اور پتہ نہیں کیا کیا کہتا ہوا یہ جاوہ جا اور ہماری کھڈ کے اوپر کی طرف بھاگتا گیا۔ ہمارے گاؤں کے مسلمان حصہ کی آبادی اس کھڈ کے ارد گرد پھیلی مختلف پہاڑیوں پر آباد تھی۔ میرے نانکے بھی اسی طرف اوپر جاکر رہتے تھے اور بہت اوپر جاکر میرے دادا کے چھوٹے بھائی چاچا (بابا) نور بخش رہتے تھے۔ وہ ذرا زیادہ اونچے پہاڑ پر رہتے تھے اور اس جگہ کو ہم تھیہ کہتے تھے۔ وہ آدمی منٹوں سیکنڈوں میں شور مچاتا چھلیڈے کی طرح ہماری آنکھوں کے آگے سے گزر گیا اور ہر سو خوف پھیلا گیا۔ مجھے وہ اس وقت کوئی آسیب نظر آ رہا تھا یا آسیب زدہ ضرور تھا۔ شاید خوف ہی آسیب بن جاتا ہے اور میں خود ہی آسیب زدہ ہو گیا۔ ڈر کر پیچھے دیکھا تو میری ماں اور بڑی بہن بھی وہاں موجود تھیں۔ دونوں کا رنگ زرد پڑ چکا تھا اور مارے خوف کے کانپ رہی تھیں۔ میرے سوا گھر پر کوئی مرد نہ تھا۔ حسب روایت خوف و خطر کا مقابلہ عورتوں کا نہیں مردوں کا کام تھا مگر میں کس کام کا مرد تھا۔ بس یونہی گنتی کا مرد تھا اور مارے خوف کے کانپ رہا تھا۔

اس وقت میری ماں نے حوصلہ کیا۔ ہمیں پکڑ کر اندر لے گئیں۔ سب سے پہلے انہوں نے قرآن مجید اٹھایا اور اپنے گلے میں ڈال لیا اور کلمہ پڑھ کر کہنے لگیں فکر نہ کریں۔ یہ اللہ کا کلام ہم سب کی حفاظت کرے گا۔ حمائل شریف پنجسورہ انہوں نے میری بہن کے گلے میں ڈال دیا۔ چند سویٹر اٹھائے اور گٹھڑی میں ڈال دیئے۔ چند چادریں اور چیزیں خود اٹھالیں۔ چھوٹی بہن کو میرے کندھے پر بٹھادیا اور کہا میرے پیچھے پیچھے چل پڑو۔ میں نے کہا لالہ کہاں ہے؟ ہم ابا جی کو لالہ کہتے تھے۔ ماں نے کہا اب وقت نہیں۔ تم چلو۔ لالہ خود ہی آجائیگا۔ دل بڑا کر کے ہماری ماں نے ہمارا چارج لے لیا تھا۔ مرغی کی طرح ہمیں اپنے پروں کے نیچے لئے ساتھ والے جنگل ..... نہایت ہی گھنے جنگل کی طرف چل پڑیں۔ یہ وہ جنگل تھا جس میں ہم باگھ' بگھیاڑ' بندر اور دوسرے جنگلی درندوں سے ڈرتے داخل نہیں ہوتے تھے مگر آج

Marfat.com

ہمیں ان درندوں سے ذرا بھی ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ ہم تو ایک اور قسم کے درندے کے خوف میں مبتلا تھے اور ہمیں ہر طرف ہر جھاڑی اور درخت کے پیچھے بھالے اٹھائے سکھ نظر آرہے تھے۔

خوف نے اک عجیب شکل اختیار کر لی تھی اور ہمیں ہر پتے سے سکھ ہی نظر آرہے تھے حالانکہ وہاں پر کسی سکھ کا نام و نشان تک نہ تھا۔ ہماری ماں کلمہ پڑھتی جائے اور شیرنی کی طرح بڑھتی جائے اور ہمیں تسلی دیتی جائے کہ بچو بالکل نہیں ڈرنا۔ تم کلمہ پڑھتے جاؤ سکھ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ وہ تمہیں دیکھ نہیں سکیں گے۔ تم مومن ہو۔ تم اس وقت ان کی آنکھوں سے اوجھل ہو..... اور آپ یقین کریں کہ ہمیں اپنی ماں کی بات پر پختہ یقین تھا کہ جو ماں کہتی ہے درست کہہ رہی ہے اور آج پچاس سال بعد بھی مجھے یہاں امریکہ بیٹھے اپنی ماں کی بات پر اسی طرح پختہ ایمان ہے جس طرح اس وقت اس لمحہ عین الیقین کے ساتھ موجود تھا۔

ہم تھوڑی ہی دور چلے ہوں گے کہ موسلادھار بارش شروع ہو گئی۔ ہم نے ایک بہت بڑے برچھ (درخت) کے نیچے پناہ لے لی مگر بارش تھی کہ وہاں بھی پہنچ گئی اور ہم لوگ بھیگ گئے۔ میری بڑی بہن کہنے لگی کہ سکھ بھی تو بھیگ گئے ہوں گے۔ وہ بھی اسی درخت کے نیچے پناہ کے لئے نہ آجائیں۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ ہم وہاں بارش ہی میں بھاگ اٹھے اور چلتے چلاتے اپنے ماموں کے گھر پہنچ گئے۔ اس دن ماموں کا گھر بہت ہی دور لگا حالانکہ ہم وہاں ہر روز بھاگ کر پہنچ جاتے تھے لیکن آج کا راستہ بہت لمبا اور تھکا دینے والا تھا۔ میں نے سوچا اب یہاں پہنچ کر آرام کریں گے مگر وہ سب لوگ تو خود بھاگنے کی تیاری میں تھے۔ میرے ماموں تو ایک ہی تھے مگر ان کے چچیرے بھائیوں وغیرہ کا بہت بڑا خاندان تھا۔ سب کے سب ذرا خونخوار قسم کے اجڈ لوگ تھے اور ہاتھوں میں بڑی بڑی ڈانگیں رکھتے تھے۔ ان کا گوت کھاری تھا اور ہماری ایک خالہ کے سسرال چھچھی تھے۔ ہمارے خالو اور ان کا سارا خاندان بھی وہاں پہنچ چکا تھا۔ کھاریوں اور چھچھوں کی سارے علاقہ میں بڑی دھاک بیٹھی ہوئی تھی اور سب لوگ خاص طور پر بنئے ان سے بہت ڈرتے تھے۔ ان سب کو وہاں دیکھ کر میں دل ہی دل میں خوش ہو گیا مگر میرے چچا دادا اور والد کہیں نظر نہیں آرہے تھے۔ میری ممانی نے مجھے نئے کپڑے دیئے اور ساتھ ہی کیلے کی بھجیا کے ساتھ ایک نہایت ہی عمدہ گرم پراٹھا تھما دیا۔ مجھے بھوک بہت لگی تھی اور میں اسے اگلے ہی لمحہ نگل گیا۔ کسی نے کہا "اوئے ایہہ بھکے پنڈوں آیا ہے۔ اینہوں ہور کھان نوں دیو" میں نے یہ باتیں سنی ان سنی کر دیں اور بڑھ کر نہایت عمدہ پکی ہوئی کڑھی اٹھالی

Marfat.com

اور خوب مزے لے لے کر پراٹھوں کے ساتھ کھائی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اس کے بعد بہت دیر تک ..... بہت ہی دیر تک ہمیں ایسا لذیذ و پسندیدہ کھانا کبھی نہ ملنا تھا۔

ابھی کھانا ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ کوچ کا حکم ہو گیا۔ میرے ایک رشتہ کے نانا تھے۔ بڑے ہی دراز قد تھے۔ لمبا چوڑا چکلا ان کا جسم تھا اور بالکل دودھ جیسی سفید داڑھی رکھتے تھے۔ اپنے سے اونچی ڈانگ لئے ایک پیغمبرانہ شان سے چل پڑے اور ہم سب ان کے پیچھے چل دیئے۔ سب لوگ کلمہ شریف اونچی اونچی آواز سے پڑھ رہے تھے۔ سب کو ایک دوسرے کا حوصلہ تھا اور ایک دوسرے کو بلہ شیری دے رہے تھے۔ ہماری منزل ہمارے دادا چچا کا تھیہ پر ڈیرا تھا۔

جب ہم تھک ہار کر تھیہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہاں پر تو ساتھ والے تین گاؤں کے مسلمان پہنچ چکے ہیں اور ہر جگہ اسی طرح سکھوں کے حملہ کا شور اٹھا تھا۔ تھیہ میں ایک بہت بڑا تالاب تھا۔ آپ اسے ایک چھوٹی سی جھیل بھی کہہ سکتے ہیں۔ عجیب نظارہ تھا۔ سب طرف اونچے اونچے پہاڑ تھے اور عین درمیاں میں یہ وسیع و عریض جھیل جن کے کناروں پر بڑے بڑے پرانے برچھ درخت لگے ہوئے تھے۔ ہم اکثر وہاں آیا کرتے تھے اور خوب کھیلتے رہتے۔ ذرا بڑی عمر کے لڑکے اس گہرے تالاب میں تیراکی کا شوق بھی پورا کرتے۔ پینے کے لئے تو پانی کے بہت صاف ستھرے چشمے تھے مگر گائیں بھینسیں اسی تالاب سے سب کچھ حاصل کرتیں۔ اس وسیع و عریض تالاب کے کناروں پر آج کچھ اور ہی نظارہ تھا۔ سب لوگوں نے کھیسوں اور کمبلوں سے اپنے چھوٹے چھوٹے جھونپڑے سے بنا رکھے تھے۔ سب انہیں تنبو کہہ رہے تھے۔ اس طرح کے تنبو بیساکھی اور رام لیلہ کے میلوں پر لگتے تھے میں نے سمجھا آج یہاں پر بھی اک میلہ سج گیا ہے مگر یہ میلہ کسی اور ہی رنگ ڈھنگ کا تھا۔

تھیہ پہنچنے پر ہم بہت تھک چکے تھے۔ جسم چور چور تھا۔ ہمارے دادا وہاں تھے اور نہ ہی والد اور چچا۔ ہماری ماں کو اب بہت فکر لگی کہ ان کا کیا بنا۔ شاید راستے کی مار دھاڑ اور ایمرجنسی کی کیفیت نے انہیں یہ سوچنے کا موقع ہی نہ دیا تھا۔ ماں کو پریشان دیکھ کر ہم بھی پریشان ہو گئے اور لالہ کو ڈھونڈنے لگے۔ چچا نبی بخش نے کہا کہ ان کا رب راکھا ہے۔ وہ جوان اور سمجھدار لوگ ہیں۔ سکھوں کا ہر جگہ یونہی شور مچا ہے۔ کوئی حملہ وغیرہ نہیں ہوا۔ شاید یہ ہندوؤں کی کوئی چال ہو کہ ہم اپنا سب کچھ چھوڑ کر بھاگ جائیں۔ بھرجائی جی آپ فکر

Marfat.com

نہ کریں..... چچا نبی بخش نے میری ماں کو مخاطب کر کے کہا۔ ہمارے بھائی اور تایا صحیح سلامت ہوں گے اور خود ہی پہنچ جائیں گے۔ اتنے میں ہمارے لئے سفید چاول اور شکر آئی اور ہم کھانے لگے مگر ساتھ گرم گرم گھی نہ آیا۔ ہماری یہاں ہمیشہ بہت زیادہ خاطر ہوتی تھی کیونکہ تمیہ کی زمین میں ہمارا پورا پورا حصہ تھا مگر ہمارے دادا اپنے بھائی سے کچھ لیتے نہ تھے اور وہ ہماری بہت زیادہ خاطر تواضع کرتے تھے مگر آج گھی نہ ملا تو میں نے ماں سے شکایت کر دی کہ ہمارے دادا چچا بہت کنجوس ہو گئے ہیں۔ میری والدہ نے مجھے جھڑکا اور کہا بزرگوں کے متعلق ایسا نہیں کہتے۔ دیکھا نہیں آج کتنی دنیا یہاں پناہ گیر بن کر اتری ہوئی ہے۔ انکی ہوش اڑی ہوئی ہے اور تمہیں گھی کی پڑی ہے۔

میں سوچنے لگا یہ پناہ گیر کیا چیز ہوتی ہے؟ میری ماں ان لوگوں کو پناہ گیر کیوں کہہ رہی ہے؟ مجھے کیا معلوم تھا کہ ہم سب ہی پناہ گیر بن چکے ہیں۔ بڑوں کے ڈیرے اور گاؤں جن پر ہم اتنا فخر کرتے تھے سب ہمارے لئے اجنبی بن جائیں گے۔ آج گھی کو رو رہے ہیں کل پانی نہیں ملے گا۔ روٹی کو ترسیں گے اور کھیسوں کے تنبو تک نہ ہوں گے۔ کھلا آسمان ہو گا اور ننگ بھوک۔ ہر طرف بیماری اور موت ہوگی اور خوف کے مہیب سایے۔ پناہ گیر کیا ہوتا ہے؟ کسی کو معلوم نہیں۔ جو بنتا ہے وہی جانتا ہے۔

Marfat.com

پناہ گیر

اگلے دن دوپہر تک ہمارے والد صاحب اور چچا صاحبان بھی تھہ ہاں پہنچ گئے۔

میرے دادا بھی ساتھ ہی تھے مگر بڑے ہی آزردہ حال۔ چہرے پر ملال ہی ملال تھا۔ سفید داڑھی مزید پریشان حال تھی۔ پگڑی میلی اور مسلی ہوئی۔ چہرے کی رنگت بدلی بدلی سی اور تاثر بالکل بے نور ..... میں دیکھ کر بہت گھبرایا۔ میں سمجھ گیا کہ میرا دادا اب پناہ گیر بن گیا ہے۔ اسے کہتے ہیں پناہ گیر میرے دل نے کہا۔

ویسے میں صبح ہی سے سوچتا رہا تھا کہ یہ پناہ گیر کس بلا کا نام ہے۔ شاید یہ جہانگیر یا عالمگیر کا کوئی بھائی ہو۔ مگر جہانگیر اور عالمگیر تو مسلمانوں کے بڑے بڑے بادشاہ گزرے ہیں..... ان کا بھائی اس طرح کا تو نہیں ہو سکتا جس طرح کے لوگ ہمارے دادا چچا کے تالاب کے ساتھ ساتھ آکر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ پھر مجھے یاد آیا کہ بہت سے بھائیوں میں سے ایک بھائی ہی بادشاہ بنتا تھا باقی بھائی یا تو مارے جاتے تھے یا بھگا دیئے جاتے تھے۔ بھاگے بھائی پھر دربدر کی ٹھوکریں ہی کھاتے پھرتے تھے۔ شاید ایسے بھاگے بھائی کو لوگ جہانگیر اور عالمگیر کی بجائے پناہ گیر کہتے ہوں اور یہ سب لوگ وہ بھگائے ہوئے بھائی تھے جن کی کوئی جائیداد و جاگیر تھی۔ بھینس نہ بکری، گھر نہ گھاٹ۔ حق نہ زندگی۔ خوف ان کا اوڑھنا بچھونا بنا تھا اور بھوک ننگ ان کی تقدیر بیماری و بیزاری ان کی قسمت تھی اور غریب الوطنی منزل۔

Marfat.com

مگر میں تو ابھی پناہ گیر نہیں تھا۔ ٹھہو ہاں میرے باپ دادا کا اپنا گاؤں تھا۔ یہاں میرا ہر طرح کا حق محفوظ تھا۔ میری زمین تھی اور میرا مکان بھی تھا۔ میرا دادا اور باپ وہاں تھے۔

اتنے میں میں نے دیکھا کہ میرے والد میری ماں کو غصہ ہو رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ تم عجیب عورت ہو کہ گھر سے چلتے وقت تم نے اپنا زیور بھی نہ اٹھایا۔ وہ تو شکر ہے کہ مجھے نظر آگیا وگرنہ وہیں رہ جاتا۔ بھاگوانے راستے میں یہی زیور کام آئیگا۔ ضرورت پڑنے پر کچھ بیچ باٹ لیں گے۔ راستے میں کونسا ہمارا باپ بیٹھا ہے جو ہمیں روٹی دے دے گا۔ اب تو اسی طرح منگ تنگ کر گزارہ ہو گا۔ پھر پاکستان پہنچ کر سب کچھ مل جائے گا۔ مجھے وہاں کی فکر نہیں ہے وہاں بابا قائداعظم پہلے ہی پہنچ چکے ہے۔ وہ ہمارا سب بندوبست کر دے گا مگر یہ راستہ واستہ کیسے کٹے گا۔ ہر طرف بھوترے ہوئے سکھ ہیں۔ سنا ہے جو مسلمان ملتا ہے اسے مار دیتے ہیں۔ کنوئیں زہر سے بھر دیتے ہیں اور آٹے میں پارہ ملا دیتے ہیں۔ بس یہ راستے میں معیبت ہے۔ روکھی سوکھی بھلئے لوکے کاٹ لو پھر پاکستان پہنچ کر سب کچھ مل جائے گا۔ یہ زیور سنبھالو۔ میں اٹھالایا ہوں اور یہ چھ سو روپے بھی۔ یہ بھی تم وہیں بھول آئی تھی۔ اسی پنڈا کلی میں تو پڑے تھے جن میں زیور تھے۔

مجھے یہ کہاں یاد تھے۔ مجھے تو بچوں کی فکر تھی۔ میں ان کو لے کر بھاگ پڑی۔ خصماں نوں کھان زیور تے پیسے۔ شکر ہے میرا سردار بچ گیا۔ چوہدری اسے کچھ ہو جاتا تو میں مرجاتی۔ ہائے میری بچی! شکر ہے سکھوں کے ہاتھ نہیں لگی۔ میں تو زندہ درگور ہو جاتی۔ شکر ہے اس پروردگار کا جس کا یہ سب کچھ ہے۔ اس نے ہمارا سب کچھ ہی بچالیا اور یہ کہہ کر میری ماں زارو قطار رونے لگی۔ ماں کی ہچکیاں بندھ گئیں اور میں بھڑولے کے پیچھے بیٹھا یہ سب کچھ دیکھ کر اور زیادہ سہم گیا۔

''سواتے کھیہ۔ بھلیے کچھ بھی تاں نہیں بچیا۔ مجھاں گنوہاں۔ ڈنگے بچھے گئے۔ کھیت کھلیان اپنے نہ رہے۔ باغ باغیچے کدھر گئے۔ گھر رہیا نہ جھگی۔ ایہہ بال بچے مرجان گے تینوں پتہ کھوہاں وچ کیہہ ہو رہا اے۔ مینوں بھگوان سنگھ نے دسیا اے کہ لوگ خاص طور تے بچے دھڑا دھڑ مرر ہے نیں۔ حالے بھی ویلا اے چل مڑ چلیے۔ بھگوان سنگھ تے پرس رام دوناں نے گارنٹی دتی اے کہ اوہ ساڈی راکھی کرن گے۔ یہ کہہ کر ہمارے

Marfat.com

والد صاحب بھی رونے لگے۔ یہ منظر میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میرے ماں باپ اتنے دلگیر ہوں گے میرے خواب و خیال میں نہیں آسکتا تھا۔

میں بھی بھڑولے کے پیچھے چھپا رونے لگا۔ مگر آہستہ آہستہ کہ کہیں میرے والدین کو میری موجودگی کا اندازہ نہ ہو جائے۔

''چوہدری اب ہم واپس نہیں جائیں گے۔ بھاڑ میں جائے سب کچھ۔ اب ہماری منزل پاکستان ہے اب ہم پاکستان ہی جائیں گے۔ آپ کو یاد نہیں میاں محمد بخش کیا کہہ گئے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ جو مسلمان پکا مومن ہے وہ اب یہاں نہیں رہے گا۔ وہ اب پاکستان چلے گا۔ وہی ہمارا گھر ہے وہی ہمارا وطن..... وہی ہمارا ایمان۔ ہم کلمہ گو مسلمان ہیں۔ ہم پیچھے کیسے رہ سکتے ہیں۔ ہمیں تو اپنے ایمان پر مرنا ہے۔ خدا کرے ہمیں اپنے ایمان پر مرنا نصیب ہو۔ ہم واپس کفرستان نہیں جائیں گے چاہے وہاں پر شہد کی نہریں ہی کیوں نہ چل رہی ہوں۔ میاں محمد بخش ہمارے پیرو مرشد ہیں۔ ان کا ہر حکم حرف بحرف ماننا ہے۔ اگر راستے میں مرگئے تو پھر اللہ مالک ہے''۔ مری ماں نے کہا۔

اب مجھے محسوس ہوا کہ میرے والدین مرے جا رہے ہیں بلکہ یوں لگا کہ شاید ابھی ابھی مر رہے ہیں۔ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور میں زور زور سے رونے لگا اور بھاگ کر اپنی ماں سے چمٹ گیا جیسے میں اسے موت کے منہ سے واپس چھین رہا ہوں۔

میری ماں اور لالہ نے مجھے خوب پیار کیا اور دلاسہ دے کر مجھے چپ کرا دیا مگر میری ماں کی آنکھوں میں آنسو بہنے کی سخت سرخی اور لالگی تھی اور وہ ساری دل کی داستان کھلی کھلی سنا رہی تھی اور پھر یکدم میری ماں نے لالہ سے کہا۔

''اچھا چوہدری ہم اپنا آخری فیصلہ ماما وارث سے مل کر کریں گے۔ پہلے ہم ان کے گاؤں ڈاڈا چلیں گے۔ میری نانی بہت سیانی ہے۔ وہ جو فیصلہ کریں گی وہی ہم کریں گے''۔

ماما وارث میری والدہ کے ماموں تھے اور بہت مشہور پنچ تھے۔ برادری کے مشکل سے مشکل فیصلے ان کے پاس جاتے تھے اور وہ ہمیشہ بہت اعلیٰ اور صحیح فیصلے کرتے تھے۔ سب لوگ ان کی عقل اور ذہانت کی بہت تعریف کرتے تھے۔ مشہور تھا کہ وہ ہر فیصلہ کرنے سے پہلے اپنی ماں سے ضرور صلاح لیتے تھے اور ان کا ہر حکم مانتے تھے۔

Marfat.com

میں نے سوچا کہ اب جو بھی فیصلہ ہو گا وہ صحیح ہو گا۔ آگے جانا ہے یا پیچھے اس کا فیصلہ نانا وارث کرے گا۔ نانا وارث کا کیا رعب دبدبہ تھا۔ جب وہ ہمارے ہاں آتے تو ہم سب بچے انہیں دیکھ کر درختوں کے پیچھے چھپ جاتے۔ سفید کھدر کا کرتہ۔ سفید داڑھی۔ دراز قد اور ایک بارعب لاٹھی ہاتھ میں ہوتی۔ کتنے ہی لوگ تھے جو ان کے پیچھے پیچھے چلتے۔ سر پر اتنی بڑی پر پیچ پگڑی باندھتے۔ ہم نے دیکھا تھا کہ ہمارے گاؤں کے سید بدر الدین بھی ان سے خم کھاتے تھے ..... اور جب بھی وہ آتے ہمیں محسوس ہوتا کہ کوئی بہت بڑا بادشاہ آ رہا ہے..... سب ان کی بات مانتے اور سبھی ان کا پانی بھرتے تھے۔

میں نے سوچا اب جو بھی فیصلہ ہو گا وہ درست ہی ہو گا۔

کچھ دیر بعد وہی چاول شکر کا کھانا ملا۔ گرم گھی نہ ملنے پر میں نے پھر ناک بھوں چڑھایا۔ مگر ساتھ ہی کوچ کا بگل بج چکا تھا۔ سب نے جلدی جلدی کھانا کھایا اور اپنا اپنا سامان اٹھا کر چل پڑے۔ آج میں بالکل فارغ ہاتھ تھا اور کھیلتا ہوا چل رہا تھا۔ میرے دادا اداس اداس چل رہے تھے تو والد نہایت اولوالعزمی کے ساتھ۔ میرے چچا اپنے ہم عمروں کے ساتھ ٹھٹھا مذاق بھی کر رہے تھے۔ ہمارے آگے بھی لوگ چل رہے تھے اور پیچھے بھی۔ عورتیں بھی تھیں اور بچے بھی۔ نوجوانوں کی شرطیں لگ رہی تھیں کہ وہ ڈاڈا جا کر کشتی لڑیں گے اور کچھ کبڈی کی بازی لگائیں گے۔

اتنے میں کچھ خواتین نے گانا گانا شروع کر دیا۔ بول تو مجھے یاد نہیں۔ کچھ بیاہ شادی کے گانوں کی نسل سے تھے اور وہ بھی جب دلہن اپنے پیا کے گھر کو ڈولی میں بیٹھ کر رخصت ہوتی ہے اور یکدم فضاء بوجھل سی ہو گئی۔ ہر کوئی اداس ہو گیا۔ بعض کے تو آنسو نکل آئے۔ مجھے اپنی پھوپھی کی رخصتی یاد آ گئی۔ میری ایک ہی پھوپھی تھی اور اپنے چاروں بھائیوں کی لاڈلی۔ جب اس کی ڈولی اٹھی تھی تو یہی گانا گاؤں کی عورتوں نے گایا تھا۔ میں نے اس وقت سب کو روتے دیکھا تھا۔

اب بھی میں نے اردگرد دیکھا کہ دیکھوں لال ڈولی کہاں ہے بلکہ آگے تک بھاگ کر گیا مگر وہاں کوئی ڈولی نہ تھی۔ کوئی دولہا نہ تھا۔ کوئی سرابلہ نہ تھا۔ میں اپنے سارے چچوں کا باری باری سرابلہ بنا تھا مگر آج تو کچھ بھی نہ تھا۔ گھوڑی تھی نہ بارات سہرا نہ باجا مگر گانا وہی تھا ..... کچھ اداس بلکہ بہت ہی اداس کہ سب کی آہیں نکل گئیں۔

Marfat.com

کسی بڑے وڈیرے نے بڑھ کر عورتوں کو گانے سے منع کر دیا ورنہ اک قیامت خیز کہرام مچنے کو تھا۔

میں آگے پیچھے بھاگتے بھاگتے اس وقت عورتوں کے جھرمٹ میں تھا جب انہیں اپنا گانا بند کرنا پڑا۔ گانا بند ہوتے ہی ایک بوڑھی کی کرخت سی آواز آئی۔

"وادے مگانیوں! سانوں گاتاں لین دیو۔ دھن جگرا عورتاں دا جیہڑیاں ماں پیو چھڈ منوریاں نت جاندیاں۔ آج مرداں نوں اپنے منوریاں جاندیاں ویکھو کتنے اداسے ہوئے نیں۔ سورو! سانوں گاتاں لین دیو"۔

مائی کا یہ کہنا تھا کہ عورتیں پھر گانے لگ گئیں اور بہت دیر تک ان کو کوئی چپ نہ کرا سکا۔ بس آہیں تھیں اور سسکیاں۔

کبھی میں پناہ گیر کا سوچوں اور کبھی سسرال کا۔ عجیب معمہ تھا میرے لئے۔ اتنے میں ہم ڈاڈا کے اس موڑ پر پہنچ گئے جہاں سے ایک راستہ ڈاڈا کو جاتا تھا اور ایک خان بہادر عبدالرشید کے گاؤں جہان کھیلاں کو جاتا تھا۔ وہاں کسی نے بتایا کہ نانا وارث اپنے سارے خاندان کے ساتھ جہان کھیلاں جا چکے ہیں اور سب کو کہہ گئے ہیں کہ وہیں آ جائیں۔ سب وہیں اکٹھے ہو جائیں۔ ادھر بہت خطرہ ہے۔ خان صاحب نے اچھا بندوبست کر رکھا ہے اور ان کے پاس بندوقیں بھی موجود ہیں۔ سکھ ادھر کا منہ نہیں کر سکتے۔

ڈاڈا کی بجائے ہم سب جہان کھیلاں کی طرف چل پڑے۔ اب واپسی محال تھی۔ واپسی کا سوچنا بھی محال تھا۔ اب گوجروں کی حدود ختم ہو رہی تھی اور پٹھانوں کے گاؤں شروع ہونے کو تھے۔ ویسے تو سارے ضلع ہوشیار پور میں پٹھان راجپوت گوجر اور برہمن ساتھ ساتھ رہتے تھے مگر پھر بھی چند علاقے مختلف برادریوں کے زیادہ زیر تسلط تھے۔ اپنی برادری کے علاقے کچھ زیادہ ہی اپنے لگتے تھے اور دوسری برادریوں کے کچھ زیادہ ہی غیر محسوس ہوتے تھے۔

ویسے برادریوں میں آپس میں سلوک بہت زیادہ تھا۔ ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے تھے ایک دوسرے کی مصیبت میں ہاتھ بٹاتے تھے لیکن پھر بھی اپنائیت اپنی اپنی تھی۔

اس موقعہ پر میں نے ایک باریش بوڑھے گوجر کو جہان کھیلاں کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے کہتے سنا او ہن گل مک گئی اے ..... او! بھائی ساڈا دیس نکالا پکا اے ہن دوجیاں دی جو آئی اے ..... اچھا سب دا رب راکھا"۔

Marfat.com

اور پھر زار و قطار رونے لگا۔

میں مبہوت دیکھتا رہا۔ مجھے اس وقت کچھ سمجھ نہ آرہا تھا۔ بس اتنا ضرور احساس ہونے لگا تھا کہ اب ہم بھی واقعی پناہ گیر بن گئے ہیں۔ باپ دادا کی جوء سے دور آگئے ہیں۔ اپنا اب کوئی حق نہیں رہا ہے۔ پناہ نہ جائے پناہ بس پناہ مانگنے کے چکر میں پھنس چکے ہیں۔

اک انجانا خوف تھا وہ میرے ساتھ تھا۔ سب کے ساتھ تھا اور سب کے چہروں سے عیاں تھا مگر ہونٹ سلے تھے اور ٹانگیں چل رہی تھیں۔ کسی کی کوئی سمت نہ تھی۔ سمت تھی تو صرف پاکستان ہر کسی کے اپنے اپنے خوابوں کا پاکستان۔ باقی سب غیر ہو چکا تھا۔ غیر ہوتا جا رہا تھا۔ بس اک کارواں تھا کہ چل پڑا تھا اور چلتا جا رہا تھا۔

شام کے وقت ہم جہاں کھیلاں پہنچے۔ دیکھا تو انسانوں کا اک اژدھام تھا۔ تا حد نظر تنبو ہی تنبو تھے۔ انسان ہی انسان تھے۔ کہیں سے دھواں نکل رہا تھا تو کہیں سے کھانے پکنے کی خوشبو آرہی تھی۔ چادروں کھیسوں کمبلوں علی ہذا القیاس جو کپڑا ہاتھ لگا اس سے سر ڈھانپنے کا بندوبست کر لیا۔ خان صاحب کے وسیع و عریض باغات اب پناہ گیروں کی پناہ بنے کھڑے تھے۔

اتنے بڑے ہجوم میں ہمیں نانا وارث کہیں نظر نہیں آرہے تھے۔

میری ماں نے کہا جہاں سر چھپانے کی جس کو جگہ مل جائے وہ وہیں سر چھپا لے۔ ماما وارث کو صبح تلاش کر لیں گے۔ کسی نے کھانا کھایا کسی نے نہ کھایا۔ میں بہت تھک چکا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں کب سو گیا۔ وہ تو اگلی صبح کی زوردار بارش نے مجھے جگا دیا ورنہ پتہ نہیں کب تک سوتا رہتا۔ ہر طرف بارش اور ہر طرف پانی تھا۔ ہر شخص بھیگ چکا تھا مگر یہ ہمارا مسئلہ نہ تھا۔ ہمارے ہاں بہت زیادہ بارش ہوتی رہتی تھی اور ہر کوئی بارش میں کام کرنے کا عادی تھا۔

ہم نے بھی دوسروں کی طرح اپنا اپنا سامان اٹھایا اور ہوشیار پور کی طرف چل پڑے۔

اس دفعہ میرے سر پر اچھا خاصا بوجھ تھا اور وہ بھی بہت ہی قیمتی بوجھ۔ میرے والد نے کہا کہ بیٹا اس بوجھ کو بہت سنبھال کر رکھنا۔ یہ اب ہمارا سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔ اسے بھیگنے بھی نہیں دینا اور اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھنا ہے۔ ابا جی نے وہ بوجھ ایسے تھیلے میں باندھ کر میری بہن اور میرے سر پر رکھا تھا جس کے اندر پانی داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ برساتیاں بھی اسی کپڑے سے بنتی تھی۔ ابا جی نے یہ قیمتی سامان کسی نہ کسی طرح راتوں رات نہایت مہنگے داموں خرید لیا تھا

Marfat.com

اور آج ہوشیار پور کی طرف روانگی کے وقت وہ ہمارے سروں پر تھا اور وہ قیمتی سامان تھا..... آٹا ..... کھانے کا آٹا..... زندہ رہنے کا سہارا۔

Marfat.com

اسلامیہ کالج ہوشیار پور

یوں ہم انجانے راستوں کے راہ گیرو پناہ گیر چلتے چلاتے ہوشیار پور پہنچ گئے۔ سڑک پر آگے دیکھیں تو انسان پیچھے دیکھیں تو انسان تھے۔ بوڑھے تھے تو بچے بھی۔ عورتیں تھیں تو مرد بھی۔ کوئی بیل گاڑی پر سوار اور کوئی پیدل کسی نے سر پر سامان اٹھا رکھا ہے تو کسی نے کسی سواری پر۔ تاحد نظر انسان ہی انسان تھے۔ اور سب نے اپنا اپنا سامان ضرور اٹھا رکھا تھا۔ میں نے سنا ماں کہہ رہی تھی۔

"کہ روز محشر ہے۔ بس روز محشر ایسا ہی ہو گا۔ ہر کوئی اپنا اپنا بوجھ اٹھائے ہو گا۔ کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھا سکے گا۔ لاالہ الااللہ محمد الرسول اللہ۔ لاالہ الااللہ"۔

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ماں اپنے آپ ہی سے باتیں کر رہی تھی۔ وہ کسی سے باتیں نہیں کر رہی تھی۔ میں حیران بھی ہوا اور کچھ پریشان بھی۔ میرے فرشتوں کو معلوم کہ روز محشر کس بلا کا نام ہے۔ ہاں! میاں محمد بخش اور میاں بدر الدین کو ضرور محشر اور قیامت کی باتیں کرتے سنا تھا۔

مجھے یہ سوچ کر معاً خیال آیا کہ یہ روز محشر بھی کوئی راہگیروں اور پناہ گیروں ہی کا کوئی بھائی بند ہے جو ماں اسے اس وقت یاد کر کر کے کلمہ پڑھ رہی ہیں۔ میرا حشر نشر تو وہ بوجھ رہا

Marfat.com

تھا جو میں نے اٹھا رکھا تھا اور ابا جی کہتے تھے کہ یہی زندگی کا اب سب سے بڑا سہارا ہے..... اور میں نے وہ بوجھ زمین پر پٹخ دیا اور زور زور سے رونے لگا۔

"ہائے میرا لاڈلا" میری دادی کی آواز آئی اور اس نے بڑھ کر مجھے پیار کرنا شروع کر دیا۔

"او دلیاء تو ایہہ کی کیتا میرے لاڈلے دی گردن توڑ دتی اے۔ توں اپنا گڈا کیوں نہ لے آیا۔ سارا سامان اودھے اتے رکھ کے آرام نل چلدے۔ آ میرا پت۔ پانی پی لے۔ ساہ لے لے پھر چلدیں آں" اور میری دادی مجھے پانی پلاتی جاتیں اور پیار کرتی جاتیں۔ اور بار بار کہتیں "میرے پت نے تے کدی بھی بھار نہیں چکیا۔ میرا پت تے سردار اے۔ پیدائشی سردار اے۔ ایہہ بڑا وڈا افسر بنے گا۔ ایہہ میرا پتر تے بادشاہ بنے گا۔ دلیا تو کی کیتا۔ گڈا وی لے آندا۔ میرا پتر تے جہانگیر بادشاہ بنے گا" اور مجھے بے انتہا پیار کرتی جاتیں۔

"جہانگیر تے جدوں بنے گا تے بنے گا۔ ہن تے تیرا ماں لاڈلا پناہ گیر بنیا کھڑا اے۔ میں ایہناں پہاڑاں دے وچوں گڈا کیویں لے آوندا ماں۔ سڑکاں تے سکھ نیں۔ ہن تے اپنا اپنا بوجھ اٹھانا ہی پڑے گا۔

"اچھا خیر صلا اے۔ کجھ کراں اں سے"۔

میری دادی کا یہ کہنا تھا کہ میں اٹھ کھڑا ہوا اور اپنا آٹے کا تھیلا خود ہی اٹھا لیا۔

"شاباش او پت" کی آواز میرے کانوں میں شربت گھول گئی اور ہم چلتے چلتے انسانوں کے ایک بہت بڑے ہجوم میں پہنچ گئے۔ تاحد نظر انسان تھے اور طرح طرح کے خیمے اور تنبو۔ میں نے اتنے انسان ایک جگہ اور ایک وقت میں کبھی نہیں دیکھے تھے۔ میں نے کچھ میلے ضرور دیکھے تھے مگر اتنا بڑا میلہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مجھے کیا معلوم کہ مہاجروں کا میلہ ذرا اور ہی قسم کا ہوتا ہے۔ وہاں جلیبیوں اور پکوڑوں سے زیادہ بھوک اور بیماری بکتی ہے۔ بولیوں اور بھنگڑوں کی بجائے وہاں موت رقصاں ہوتی ہے۔ پناہ گیروں کے لئے پانی سے زیادہ خون و خاک زیادہ ارزاں ہوتا ہے۔ یہ میلہ تو ذرا وکھری قسم کا تھا۔

اور معلوم ہوا کہ یہ اسلامیہ کالج ہوشیار پور کی وسیع و عریض عمارت اور زمین ہے۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں آکر میں نے کالج میں پڑھنے کے خواب دیکھے تھے۔ شیخ عبدالرفیع

Marfat.com

جب بھی اپنی زمین دیکھنے یا شکار کھیلنے ہمارے گاؤں آتے تو ہمیشہ کہتے کہ بیٹا تمہیں ہم اسلامیہ کالج ہوشیار پور میں پڑھائیں گے..... اور میں اعلیٰ تعلیم کے خواب دیکھتا اور آج میں اسی جگہ تعلیم کے لئے نہیں اپنی جان کی عافیت کی تلاش میں اپنا رزق اپنے ہی سر پر اٹھا کر وہاں پہنچ گیا..... اور یہ تھا میرا کسی کالج سے میرا پہلا تعارف۔ اک طالب علم کا نہیں اک پناہ گیر کا۔

اور پھر وہ ظالم صبح بھی مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں اپنے پیارے چچا غلامی (غلام علی) اور چچی کے ساتھ رفع حاجت کے لئے مہاجر کیمپ سے ذرا باہر چلا گیا تھا۔ وہاں پر کچھ اور لوگ بھی تھے۔ لوگ ذرہٹ ہٹ کر اور پردے کے ساتھ فارغ ہو رہے تھے کہ میں نے دیکھا کہ سیدھی چمکتی ہوئیں بلمیں نکالے چند سکھ ہماری طرف لپکے اور اگلے ہی لمحہ میرا چچا اور چچی چڑیوں کی طرح ان ظالموں کے نیزوں میں پھنسے تڑپ رہے تھے۔ میری اک چیخ نکلی اور میں سرپٹ بھاگ پڑا اور بھاگتا ہی گیا۔

"پھڑو اوئے ایس حرام زادے نوں۔ ایس مسلے دے بچے دی ایسی تیسی" میں یہ سنتا گیا اور بھاگتا گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی مجھے جرات ہی نہ پڑی۔ میرا کچھا کہیں گر گیا تھا اور میں ننگا ہی بھاگتا گیا اور اپنے ماں باپ کی آغوش میں پہنچ گیا۔

وہ مجھ سے پوچھیں کیا ہوا۔ کیا ہوا مگر میں تو گونگا ہو چکا تھا۔ مجھ سے مارے خوف کے آواز نہ نکل رہی تھی اور میں اشاروں سے کچھ کہتا رہا۔ اتنے میں سارے واقعہ کی خبر پورے کیمپ میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔ معلوم ہوا آٹھ مسلمان مار گئے ہیں اور بہت زیادہ زخمی ہوئے ہیں۔ ان آٹھ شہیدوں میں میرا چچا اور چچی بھی تھے۔ پتہ نہیں میرے دادا اور دادی پر کیا گزری ہمارے خاندان والوں کو کیا کیا صدمے اٹھانے پڑے مگر مجھ پر اللہ نے کرم کیا کہ میں بے ہوش ہو گیا۔ پتہ نہیں اس واقعہ کے بعد کب مجھے ہوش آیا۔ جب بھی میں ہوش میں آتا میں ہڑبڑاتا ہڑبڑاتا پھر بے ہوش ہو جاتا اور بخار نے مجھ پر مستقل قبضہ کر لیا۔ پتہ نہیں کتنے دن۔ مہینے یا سال گزر گئے۔ وہی بخار وہی ہیضہ وہی آسمان وہی اسلامیہ کالج کے کسی حصہ کا برآمدہ اور میری ماں کا نورانی چہرہ جو ہر وقت کلمہ اور درود پڑھتے پڑھتے اپنے اکلوتے بیٹے کی زندگی اور صحت کی دعا کرتا نظر آتا۔ پھر مجھے ہوش بھی آ گیا تھا مگر بیماری نہ جا رہی تھی۔ اور پھر میری دونوں بہنیں بھی بیمار ہو گئیں۔ ہمارے ہر طرف گند تھا۔۔ ایسا گند اور غلاظت کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔ شاید دنیا میں سب سے زیادہ بدبودار اور غلیظ ترین چیز انسان کا اپنا ہی فضلہ

Marfat.com

ہے۔ سب بیمار تھے۔ سب جگہ بیماری تھی۔ کوئی اٹھ نہیں سکتا تھا کوئی بیٹھ نہیں سکتا تھا اور کوئی چل نہیں سکتا تھا۔ سب کا کھانا پینا۔ دوا دارو۔ پانی دھانی۔ بول پیشاب اور ..... سب کچھ وہیں تھا۔.... باہر خوف کے پہرے لگے تھے۔ سکھوں کا خوف ایسا کہ ہر کسی کی جان جائے۔ کوئی سرکار تھی نہ حکومت۔ کوئی پولیس تھی اور نہ فوج..... صرف نام اللہ کا تھا یا کبھی کبھار مسلم لیگ کے رضا کاروں کا حوصلہ افزا پھیرا۔ جب بھی آتے کھانے پینے کو ضرور لاتے اور سب کو دلاسا دیتے۔ ان سے معلوم ہو جاتا کہ کون کدھر ہے اور کس حالت میں ہے۔ کتنے لوگ پاکستان کی طرف چل دیئے ہیں۔ اور کتنے لوگ پہاڑوں سے چھپتے چھپاتے کیمپ میں مزید پہنچ چکے ہیں۔ معلوم ہوا کہ ہندو سکھوں نے اکثر پانی پینے کے کنوؤں میں صابن ڈال دیا ہے یا پارہ ڈال کر اسے زہریلا بنا دیا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ مسلمان مر جائیں۔ عجیب در ندگی تھی اور عجیب پاگل پن۔ ان رضا کاروں ہی سے معلوم ہوا کہ کئی مسلمان مردوں' عورتوں اور بچوں سے بھری ٹرینوں کو سکھوں نے جنگل بیابانوں میں کھڑا کر کے تہ و تیغ کر دیا۔ یہ سب کچھ سن کر ہم اور بھی ڈر جاتے۔ اب مجھے کچھ کچھ پتہ چل رہا تھا کہ پناہ گیر کسے کہتے ہیں اور پناہ گر کیسا ہوتا ہے۔ جب پہلے پہل سنا تھا تو مجھے گھی نہ ملنے کی شکایت تھی اور اب زبان نہ کھل سکتی تھی۔ پینے کو پانی تھا اور نہ کھانے کو سادہ چپاتی۔ اگر مسلم لیگ کے یہ فرشتہ سیرت رضا کار نہ پہنچا کرتے تو ہم کبھی کے مر گئے ہوتے اور ہمارے علاوہ بہت سے مر گئے تھے۔ سنا تھا کہ مرنے والوں کے لیے قبریں نہیں تھیں اور کیمپ میں ہر روز اتنے لوگ مرتے تھے کہ سب کو اکٹھا کسی بڑے گڑھے میں دفنانا پڑتا تھا۔ اکثر اوقات کتے ان قبروں سے تازہ لاشیں نکال کر چیر پھاڑ کر کھا جاتے۔ پناہ گیری کیا انسانیت سوزی کی انتہا تھی۔ ہر انسان اپنی اپنی بقاء کی سطح پر پہنچ چکا تھا اور باقی تہذیب کے تمام سبق بھول چکا تھا۔ مطمع نظر صرف اور صرف موت سے بچ نکلنا تھا چاہے انسانیت کا جنازہ نکل جائے۔ اب قتل۔ڈاکہ۔چھینا چھپٹی سب جائز تھی اور ہر کوئی اپنی اپنی زندگی کی پناہ مانگ رہا تھا۔ رشتے ناطے ٹوٹ چکے تھے۔ سب لوگ بقائے نسل کے رشتے کی تلاش میں تھے۔ تہذیب کے سب لباس اتار کر انسانیت اب ننگی کھڑی تھی۔

اس ساری فضا میں پتہ نہیں کیسے مگر میری ماں کا واحد چہرہ انسانیت کے درد سے گداز تھا۔ ہر وقت درود اور کلمہ پڑھتیں اور ارد گرد سب کے کام آتیں۔ ایک دن تھوڑا سا پانی میرے منہ میں ڈال رہی تھیں کہ کسی کی آواز آئی ''او مائی میں مر گیا۔ پانی'' ماں نے سنتے ہی مجھے

Marfat.com

چھوڑا اور وہ پانی اس اجنبی مہاجر کو دے دیا وہ بے چارہ تھوڑی دیر بعد مر گیا۔ معلوم ہوا اس کا کوئی رشتہ دار یا پرسان حال نہ تھا۔ میری ماں نے ہمارے والد صاحب کو کہا کہ اسے قبرستان پہنچا دے۔ ابھی ہمارے والد صاحب سوچ ہی رہے تھے کہ کس طرح اس لاش کو قبرستان پہنچائیں کہ مسلم لیگ کے کچھ رضا کار آگئے اور انہوں نے یہ کام اپنے ذمہ لے لیا۔

ان رضا کاروں سے میری ماں نے نہایت معصومانہ انداز میں پوچھا کہ آپ لوگ ہمیں یہ بتانے آئے تھے کہ کل صبح ایک ٹرین پاکستان جا رہی ہے تیار ہو جائیں بھلا آپ لوگ سب سے پہلے خود کیوں نہیں چلے جاتے آپ ابھی نوجوان بچے ہیں آپ کو کیا مصیبت پڑی ہے کہ ہم لوگوں کا دھیان کرتے پھریں۔ ان میں سے ایک نوجوان نے کہا نہیں اماں جی ہم سب سے آخر میں یہاں سے جائیں گے۔ یہ کالج ہمارا ہی ہے۔ ہم یہاں کے طالب علم ہیں۔ مسلم لیگ کی ہائی کمان نے ہماری ڈیوٹی لگائی ہوئی ہے کہ ہم یہاں مہاجروں کا خیال کریں۔ اس لئے ہم آپ سب کو بھیج کر پھر جائیں گے۔

ماں نے پھر معصومیت سے پوچھا "بیٹا کیا تمہیں اس کام کی کوئی تنخواہ ملتی ہے"۔

"نہیں اماں جی آپ کیسی بات کرتی ہیں۔ ہم سب مسلمان ہیں۔ آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ یہ تو ہمارا فرض ہے یہ چیزیں وغیرہ جو ہم آپ لوگوں کے لئے لاتے ہیں یہ ہم چندہ سے خریدتے ہیں۔ کئی مسلمان اس کے لئے رضا کارانہ طور پر روپیہ پیسہ اور رضائیاں روٹیاں وغیرہ دیتے ہیں۔ آپ لوگ تیار رہیں۔ کل آپ کو پاکستان جانے والی ٹرین پر صبح صبح سوار کروا دیں گے"۔

جہاں انسانیت اتنی گر چکی تھی وہاں یہ بھی ہو رہا تھا کہ یہ نوجوان اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر نہایت پر خطر حالات میں انسانیت کی خدمت میں جتے کھڑے تھے۔ واقعی زندگی اک عجیب گورکھ دھندا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔

اگلی صبح ہم نے سوچا اب منزل قریب ہے۔ ٹرین میں بیٹھیں گے اور پاکستان پہنچ جائیں گے۔ مگر ایسا اللہ کو منظور نہ تھا۔ ہوا یوں کہ کہیں سے ہماری والدہ کو پتہ چل گیا کہ بوا بھلی کے بیٹے اپنی مفلوج والدہ کو کیمپ میں ہی چھوڑ کر اس ٹرین پر سوار ہونے چلے گئے ہیں۔ جو پاکستان جا رہی تھی۔ اب ہماری والدہ بضد تھیں کہ چوہدری (میرے والد صاحب) میری بوا کو لاؤ گے تو میں جاؤں گی۔ وگرنہ میں اور میرے بچے تمہارے ساتھ اس ٹرین میں نہیں جائیں

Marfat.com

گے۔ اباجی نے بہت سمجھایا کہ ٹرین نکل جائیگی تو پتہ نہیں کب پھر آئے گی۔ ہم بھی یہیں مارے جائیں گے۔ بہتر ہے چل پڑیں۔ ہم سب بہن بھائی بھی ماں کی اس بات پر اتنے خوش نہ ہوئے۔ ہمیں تو ٹرین پر سوار ہونے کا ویسے ہی بھوت سوار تھا۔

بوا بھلی ہماری والدہ کی پھوپھی تھیں اور پچھلے آٹھ سال سے مفلوج تھیں۔ بول سکتی تھیں نہ چل سکتی تھیں۔ اس کے آٹھ بیٹے تھے اور خوب اپنی ماں کا خیال رکھتے تھے۔ ہمیں اس سنی سنائی بات پر یقین تو نہیں آرہا تھا مگر کچھ دیر بعد ہم نے دیکھا کہ ہمارے والد صاحب بوا بھلی کو اپنے چوڑے چکلے کندھوں پر اٹھائے چلے آرہے ہیں۔ دروازہ گزرنے کے لئے ہمارے والد صاحب ذرا نیچے جھکے مگر پھر بھی بوا بھلی کا سر دروازے کی چوکھٹ سے ٹکرا ہی گیا اور بوا بھلی کی زور دار چیخ نکل گئی۔ ہم سب حیران تھے کہ یہ تو بول ہی نہیں سکتیں یہ کیسے ہو گیا۔ اتنے میں بوا بھلی نے کہا۔

"او! رجی خدا تیرا بھلا کرے۔ اوئے میرے اوترے نکھترے پتر مینوں چھڈ کے ٹر گئے۔ خدا بھلا کرے دلے دا۔ او مینوں تیرے پاس لے آیا۔ خدا کرے تیرا پت بہت بڑا بادشاہ بن جائے..... وغیرہ۔

اب ہم سب دیکھ رہے تھے کہ یہ بڑھیا اتنے سالوں کے بعد کیسے بول رہی ہے۔ ہم سب نے اسے ایک معجزہ سمجھا۔ میں نے بعد میں بہت سے ڈاکٹروں اور سائنسدانوں سے اس واقعہ پر پوچھا ہے۔ سب کا خیال ہے کہ کسی غیر معمولی واقعہ سے اس قسم کی باتیں کبھی کبھار ہو جاتی ہیں۔ کوئی زیادہ حیرانی کی بات نہیں ہے۔ اس وقت ہم نے اسے اللہ کی طرف سے معجزہ ہی سمجھا اور ہمارے والد صاحب بھی خوش ہو گئے۔

.....اور ہم وہ ٹرین مس کر گئے۔

- میری والدہ کا نام رضیہ تھا مگر جیسے گھروں میں ہوتا ہے انہیں ان کے پیار کے چھوٹے نام سے رجی کہہ کر ہی پکارا جاتا تھا۔ اسی لئے بوا بھلی نے انہیں اس نام سے پکارا تھا۔

.....اور مزے کی بات ہے کہ عین آٹھ دن بعد بوا بیٹھے بیٹھے اللہ کو پیاری ہو گئی اور ہماری والدہ نے اصرار کیا کہ کسی نہ کسی طرح ان کے لئے علیحدہ قبر بنوائی جائے اور انہیں اجتماعی قبر میں نہ دفنایا جائے.... مگر یہ ممکن نہ تھا اور وہ بے چاری بوا بھلی کسی اجتماعی قبر میں آرام کے لئے پہنچ گئی۔

Marfat.com

چند دنوں بعد خبر آئی کہ وہ ٹرین جس میں بوا بھلی کے آٹھ بیٹے اپنی ماں کو کیمپ میں ہی چھوڑ کر سوار ہو گئے تھے وہ امرتسر کے قریب ساری کی ساری قتل ہو گئی اور ایک آدمی بھی ان میں نہ بچا۔

یہ خبر سچ نکلی۔ بوا بھلی کے آٹھوں کے آٹھ جوان بیٹے قتل ہو گئے اور پورا خاندان ختم ہو گیا اور میری ماں نے صرف یہ کہا۔

"اللہ کے رنگ نرالے ہیں۔ بوا بھلی نے ہم سب کو بچالیا ہے۔ اس کی دعا سن گئی چوہدری۔"

اور پھر اپنے مقتول عزیزوں کے لئے زارو قطار رو دی۔

Marfat.com

ٹرین ٹو پاکستان

اس کٹ جانے والی بدقسمت ٹرین کے بعد بہت دنوں تک ہوشیار پور سے کوئی ریل گاڑی پاکستان کے لئے روانہ نہ ہوئی۔ یا شاید ہماری باری نہ آئی۔ بہت دنوں کے بعد ایک دن پھر خوشخبری آئی کہ کل صبح ایک ٹرین پاکستان روانہ ہو گی اور اس میں ہم لوگ سوار ہوں گے۔ اس دفعہ ہمارے والد صاحب نے ہم سب کو بہت صبح سویرے ساتھ لیا اور ریلوے سٹیشن کی طرف چل دیئے۔ دیکھا تو رات کے اندھیرے میں ہماری ہی طرح اور بھی بہت سے مسلمان مہاجر گرتے گراتے اسی راہ امید پر چل رہے تھے۔ ہمارے پہنچتے ہی ریل گاڑی آگئی اور ہم ان خوش قسمتوں میں سے تھے جنہیں ریل کے ڈبوں کے اندر جگہ مل گئی ورنہ اک جہان تھا جو ٹرین کی چھتوں پر اٹکا ہوا تھا۔ ریل کے اندر انسان اس طرح گھسے اور دھنسے ہوئے تھے جیسے ڈبوں کے اندر سارڈین مچھلیاں۔ بس سمجھئے انسان پر انسان چڑھا ہوا تھا اور حبس ایسا کہ سانس بند ہو جائے۔

شکر ہے تھوڑی ہی دیر بعد گاڑی چل پڑی اور سب سواریوں نے کلمہ اور درود کا ورد شروع کر دیا۔ مختلف ریلوے سٹیشنوں سے گزرتی ہوئی ٹرین جب امرتسر کے پاس دریائے بیاس سے گزر رہی تھی تو سب لوگ باہر دیکھ کر دھاڑیں مار کر رونے لگے۔ میرے دادا بالکل بے قابو ہوئے جا رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ وہ دیکھو لاشیں۔۔لاشیں ہی لاشیں۔

Marfat.com

وہ فلاں کی لاش ہے اور وہ فلاں کی۔ چھوڑ دو مجھے۔ میں اپنے عزیزوں کے ساتھ مرنا چاہتا ہوں۔ میں نے سوچا شاید وہ پاگل ہو گئے ہیں۔ جس دن سے رانگڑ ہماری بھینس زبردستی لے گیا تھا میرے دادا گم سم سے رہتے تھے اور آج بالکل پاگل ہو گئے تھے۔ میرے والد اور چچا نے انہیں مضبوطی سے پکڑا۔ پانی پلایا اور پھر وہ بے ہوش ہو کر نیچے گر پڑے۔ دریائے بیاس کے کنارے بہت سے مسلمان مہاجر کیمپ لگائے بیٹھے تھے کہ اوپر پہاڑوں پر بہت زیادہ بارش کی وجہ سے یکدم سخت سیلاب آگیا اور ان میں بہت سوں کو بہا کر لے گیا۔ باقیوں کو سکھ جتھوں نے کاٹ ڈالا۔ یہ بات بہت جلد پورے پنجاب کے طول و عرض میں پھیل گئی تھی اور بیاس کا کنارہ اور دریا خون خرابے اور موت کی علامت بن گیا تھا۔ میرے دادا اور دوسرے بہت سے لوگ گزرتی ٹرین سے کچھ حقیقت اور کچھ ڈراونے خیال کو دیکھ رہے تھے ورنہ وہ پل کافی اونچا تھا اور لوہے کے اونچے اونچے ستونوں سے اوپر نیچے دھنسا کھڑا تھا۔ میں نے کل ہی اس سائز اور طرز کے بہت سے پل یہاں امریکہ کے شہر پٹسبرگ میں دیکھے ہیں اور ہو بہو مماثلت پر میرا سر چکرا گیا۔ معلوم ہوا کہ یہ پل بھی ان ہی زمانوں کے نمونے ہیں جن زمانوں میں انڈین ریلوے بچھائی جا رہی تھی اور پٹسبرگ کا شہر سٹیل کا سب سے بڑا پیداواری شہر تھا..... کیا حسن اتفاق ہے۔

جہاں تک مجھے یاد ہے ہماری ٹرین تھوڑی دیر کے لئے امرتسر ریلوے سٹیشن پر ٹھہری۔

امرتسر کا نام سنتے ہی سب ٹرین سواروں کے رنگ فق ہو چکے تھے اور سب کہہ رہے تھے کہ یہ جگہ سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ سب لوگ کلمہ شریف اور درود کا ورد کر رہے تھے۔ ہماری والدہ تسبیح پر تسبیح چلا رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ہمارے والد صاحب بھی کچھ فکر مند نظر آرہے ہیں اور بار بار اپنی داڑھی کو کھجلا رہے ہیں۔ کسی نے کہا آگے اجاڑ ہے۔ یہاں سے پانی لے لو مگر سب نے کہا نہیں یہاں سے پانی مت بھرو۔ سکھوں نے ضرور یہاں زہر پھیلا دیا ہو گا۔

یہاں بہت زیادہ ظالم سکھ ہیں۔ ان کا دربار صاحب یہاں ہے۔ بس دعا کرو کہ ٹرین چل پڑے اور ..... ٹرین چل پڑی۔ سب نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ کچھ دیر کے بعد واقعی اجاڑ بیابان آگئی اور ..... ٹرین ایک سنسان جگہ پر کھڑی ہوگئی۔ سب لوگ ڈر گئے اور سسکیاں بھرنے لگے کہ اب سکھ آئے کہ آئے۔ ساری گاڑی مقتل کی انتظار میں کھڑی تھی اور ہر کوئی مرنے کے لئے تیار تھا..... ہماری والدہ نے مجھے اور میری بہنوں کو سیٹوں کے نیچے چھپا دیا اور ایک چادر ہم پر ڈال دی اور کلمہ پڑھنے لگ گئی اور ساتھ کہتی جائیں..... اللہ دے حوالے ..... تسی اللہ

Marfat.com

دے حوالے ..... سب اللہ دے حوالے ..... ساتھ روتی جائیں اور ساتھ درود کلمہ پڑھتی جائیں ..... کبھی کبھار ایک میکانی انداز میں نکلے اچھا رب راکھا..... رب راکھا.....۔

میری بہن کہنے لگی کہ دیکھا کلمہ اور درود کا کتنا اثر ہے۔ سب سکھ بھاگ گئے ہیں۔ یہاں تو سکھ نہ سکھ کا کوئی نشان ہے اور مجھے اپنی بہن کے ان الفاظ پر اور اپنی ماں کی پاکیزہ دعاؤں پر مکمل یقین تھا۔ اسی وجہ سے میں اس وقت بالکل نہیں ڈر رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد خبر آئی کہ انجن کا ڈرائیور اگلے سٹیشن سے انجن میں پانی بھرنے گیا ہے تھوڑی دیر میں آجائیگا۔ ڈرائیور ہوشیار آدمی تھا۔ اس نے امرتسر سٹیشن پر گاڑی زیادہ دیر نہ ٹھہرائی تھی جہاں اسے پانی لینا تھا تاکہ کہیں حملہ نہ ہو جائے۔ اب وہ گاڑی یہاں کھڑی کر کے اگلے سٹیشن سے پانی لینے گیا ہے۔ یہ باتیں سن کر لوگ کچھ خوش ہو گئے۔ ایک دو منچلے تو ٹرین سے نیچے اتر کر مٹر گشت بھی کرنے لگے۔

مگر انجن پانی لے کر نہ آیا اور شام ہو گئی۔ اندھیرا چھانے لگا اور سورج غروب ہو گیا۔ لوگ پھر گھبرا گئے اور کلمہ درود کا ورد شروع ہو گیا۔ ہمیں دوبارہ سیٹوں کے نیچے گھسیٹر دیا گیا..... اور پھر بہت زیادہ اندھیرا ہو گیا جس نے خوف کو اور بھی بڑھا دیا۔

پتہ نہیں کتنا وقت اس طرح گزر گیا اور پھر یکدم گولیاں چلنے کی آواز آنا شروع ہو گئی کوئی کہے دور سے آواز آرہی ہے اور کوئی کہے بس قریب سے آرہی ہے۔ کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہر طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ اک کہرام مچا تھا اور سب مرنے کو تیار تھے۔ اب تو سکھ آہی گئے۔ کسی نے کہا پکی گولی چلی ہے اور کسی نے کہا کچی گولی چل رہی ہے۔

کچی ہے یا پکی۔ آج مرنا ہے۔ بس مرنے کو تیار ہو جاؤ کسی نے ڈبے میں سے آواز نکالی اور سب عورتیں رونے لگ گئیں۔

ہماری ماں نے کہا: بچو! میں تمہیں اپنا دودھ بخشتی ہوں۔ تم سلامت رہو۔ خدا تمہارا ساتھی ہو۔ فکر نہ کرنا۔ کلمہ پڑھتے رہو۔ کلمہ پڑھتے پڑھتے جو مرتا ہے وہ شہید ہوتا ہے شہید کبھی نہیں مرتا۔ وہ اللہ کے پاس جاکر آرام کرتا ہے۔ عیش کرتا ہے۔ فکر نہ کرو اور کلمہ پڑھتے جاؤ..... یہ کہتے کہتے ان کی ہچکی بندھ گئی اور گولیوں کی آوازیں قریب سے قریب آتی جائیں۔

Marfat.com

اب تو میری بھی پھوک نکلی ہوئی تھی۔ مجھے فرشتے نظر آنے شروع ہو گئے۔ کبھی میں اللہ میاں کے سامنے پیش ہوں اور کبھی آپ حضورؐ کے قدموں میں اور میرے تخئیل نے جو نقشہ بچپن سے بنا رکھا تھا۔ وہ عین میرے سامنے تھا۔ ایک عظیم انسان پر نور تخت تھا جس پر اللہ میاں پوری شان و شوکت سے براجمان تھے ساتھ ہی اللہ کے نہایت ہی خوبصورت اور مہرو ماہ سے بھرپور چہرے والے اس کے حبیب و محبوب تھے..... اور میں سجدہ میں گر گیا۔ زبان گم اور آنسو رواں۔

آواز آئی فکر نہ کرو تمہارا اللہ حافظ ہے۔ ہم موجود ہیں۔ یہ سکھ وکھ کچھ نہیں کر سکتے۔ اصل میں اس وقت بلوچ رجمنٹ کا ایک مسلمان باوردی سپاہی اپنی سٹین گن لئے ہمارے ڈبے میں پہنچ چکا تھا اور وہ سب کو تسلی دے رہا تھا اور میں مارے خوف کے پسینے میں شرابور اللہ میاں کے ہاں پیش ہو چکا تھا۔

میری ماں نے مجھے اٹھایا اور پیار کرنے لگی۔ منہ میں پانی ڈالا اور میرا پسینہ پونچھا اور کہنے لگی :دیکھو اللہ کی مدد آگئی۔ دیکھو بچو اللہ کی مدد آگئی۔ فکر نہ کرو۔ یہ سپاہی اللہ کا بھیجا فرشتہ ہے اور پھر پتہ نہیں کیا کچھ پڑھتی رہیں۔ ہمارے والد صاحب بھی کچھ اور ہی طرح سے نظر آرہے تھے۔ شاید کچھ ڈر گئے تھے' اللہ تعالے کے سپاہی پاس تھے۔ آنکھوں میں آنسو۔ ہم بچے حیران ہو گئے کہ اباجی تو کبھی نہیں روئے تھے کچھ نہ کچھ ایسا ہوا ضرور ہے۔

اتنے میں ایک گولی آکر دروازے میں کھڑے ایک آدمی کو لگی۔ چیخ نکلی اور وہ دھڑام سے گر گیا اور ہم سب لوگ ایک دفعہ پھر سہم گئے ..... کچھ دیر بعد معلوم ہوا کہ وہ آدمی معمولی سا زخمی ہوا ہے۔ گولی کہیں دور سے آئی تھی اور اس کی طاقت ختم ہو چکی تھی۔

ہمارے محافظ بلوچ سپاہی نے بھی ایک دو گولیاں جواباً چلا دیں اور پھر گولیاں چلنے کی آوازیں بند ہو گئیں :

مگر گاڑی وہیں کی وہیں کھڑی رہی۔ گاڑی تو تبھی چلتی جب کوئی انجن آتا..... اور ہماری گاڑی کا بھگوڑا انجن واپس نہ آیا۔

کچھ دیر بعد پتہ چلا کہ اب انجن لاہور سے آئے گا اور ساتھ وہاں سے مسلمان فوج بھی آئے گی اور پھر ہم پاکستان چلیں گے۔

Marfat.com

بلوچ سپاہی نے ہمیں تسلی دی کہ اب آپ کو کوئی خطرہ نہ ہے۔ دوسرے ڈبوں میں میرے ساتھی پہنچ چکے ہیں۔ اب سکھ ادھر کا منہ نہیں کر سکتے۔ انجن آتے ہی ہم لوگ پاکستان چل پڑیں گے۔

آپ یقین کریں اس دن کے بعد بلوچ رجمنٹ اور اس کا ہر سپاہی میرے لئے زندگی کی علامت بن گیا۔ مجھے بلوچ رجمنٹ سے ایک جذباتی لگاؤ ہو گیا اور جب میں نے پولیس کی اعلیٰ سروس کے سلسلہ میں چھ ہفتہ کی آرمی ٹریننگ کرنی تھی تو میں نے منہ سے مانگ کر اپنی Attachment بلوچ رجمنٹ کے ساتھ کروائی۔ میری فوجی تربیت کوئٹہ میں ہوئی اور میں نے وہاں ہر فوجی مشق میں بہت ہی ولولے اور شوق کے ساتھ حصہ لیا کہ میں زندہ ہی ان کی وجہ سے تھا اور میری رجمنٹ کے او سی لیفٹیننٹ کرنل عین الہدا نے بھی میرا اتنا خیال کیا کہ جب ہم تربیت کے بعد رخصت ہونے لگے تو ہم دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ یہ عین الہدا صاحب کا کمال تھا نہ میرا بلکہ اس گمنام عظیم سپاہی کا تھا جس نے امرتسر کے بیابان کی اندھیری رات میں ہماری جان بچائی تھی۔ میں اب بھی سوچتا ہوں کہ کہیں وہ فرشتہ اب بھی مجھے مل جائے تو میں اس کے قدم چوم لوں۔ خیر جہاں کہیں بھی وہ ہو اللہ اسے خوش رکھے اور آخرت میں اجر عظیم دے۔

میں اپنے وطن کے مارشل لاؤں کے غلط کردار پر جب بھی سخت تنقید کرتا ہوں تو بہت سے جرنیل قسم کے لوگ سمجھتے ہیں کہ شاید میں فوج کے بہت سخت خلاف ہوں۔ حالانکہ میں تو فوج اور اپنی فوج کے اصلی کردار کا جنون کی حد تک عاشق ہوں جس کے لئے سب سے زیادہ وہ گمنام بلوچ سپاہی ہے جس نے ہمیں زندگی بخشی اور وہ میرے دل۔ دماغ اور روح و قلب کا حصہ ہے مگر جب جرنیلوں نے اپنی جہالت اور جاہ پرستی کی ہوس میں میرے وطن عزیز اور اس کے عظیم عوام کی بربادی کر دی تو مجھے ان کے اس رول کے خلاف بات کرنے پر ذرا بھر باک نہیں ہے۔ اس وقت وہ فوج کے جرنیل کا کردار نہیں ادا کر رہے ہوتے صرف اپنی جرنیلی کو غلط استعمال کر رہے ہوتے ہیں۔ مجھے ان کی جرنیلی پر نہیں اس کے غلط استعمال پر اعتراض ہے جس کا سب سے بڑا نقصان خود پیشہ سپاہ گری کو ہوتا ہے اور یوں ہمارے ملک کا دفاع کمزور ہوتا ہے۔ ۱۹۷۱ء کا المیہ اس بات کا مکمل مظہر ہے۔ تاریخ سے سبق نہ لینا جاہلوں کا کام ہے یا گمراہ حکمرانوں کا۔

Marfat.com

پتہ نہیں پھر اس گاڑی کا انجن کب آیا اور کہاں سے آیا۔ رات کے کسی پہر ہماری گاڑی چل پڑی سواریوں کے سانس میں سانس آئی اور ٹرین پاکستان کی طرف رواں دواں ہو گئی۔

مجھے وہ لمحہ بہت اچھی طرح یاد ہے جب صبح سویرے ہماری گاڑی بھارت کے آخری ریلوے سٹیشن اٹاری پر پہنچی۔ فجر کا یا ذرا فجر سے پہلے کا نہایت ہی پر نور وقت تھا اور پوری ٹرین یکدم اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھی۔ بہت دیر تک اللہ اکبر کے نعرے لگتے رہے اور واہگہ بارڈر پر داخل ہوتے وقت تو لوگ خوشی سے پاگل ہو رہے تھے۔ میں بھی اتنی زیادہ بیماری کے باوجود نعرے لگانے والوں میں شامل تھا۔ میرا چچا محمد دین مجھے کھڑکی کے پاس لے جا کر دکھاتا رہا کہ دیکھو! یہ دیکھو پاکستان ہے۔ کتنا خوبصورت ہے پاکستان اور کہتا جاتا تھا کہ یہ جنت ہے۔ بیٹا یہ جنت ہے۔ اب یہاں کوئی ظالم سکھ نہیں آئے گا۔ یہاں سب کچھ ملے گا۔ کھانے کو ملے گا۔ دودھ۔ گھی۔ شکر سب کچھ ملے گا۔ گنے چوپیں گے اور مسجد میں نماز پڑھیں گے۔ یہ جگہ ہماری ہے۔ یہ وطن ہمارا ہے۔ یہ لوگ ہمارے ہیں۔ یہاں خوشیاں ہی خوشیاں ہوں گی۔ سب طرف اسلام کا بول بالا ہو گا۔ یہاں ہمارا بابا قائداعظم ہے۔ وہ ہمیں زمین دے گا۔ پتر فکر نہ کر۔ ہن فکر نہیں کرنا۔

چاچا محمد دین پتہ نہیں کیا کچھ کہتا گیا اور پاکستان کی خوبصورت سرزمین مجھے دکھاتا گیا..... اور کچھ دیر کے بعد میں نڈھال ہو کے بے ہوش ہو گیا۔ شاید حبس کی وجہ سے۔ خوف کی اتنی دیر موجودگی کی وجہ سے۔ بیماری اور ضعف کی وجہ سے یا پاکستان پہنچنے کی خوشی کی وجہ سے۔

مجھے ہوش صرف اس وقت آیا جب ہماری ٹرین لاہور مغل پورہ سٹیشن پر آکر رکی۔ اس وقت سورج ابھر رہا تھا اور اپنی مدھم مدھم روشنی سے ہر چیز کو نکھار رہا تھا۔

اوروں کی طرح ہم بھی گاڑی سے نیچے اترے۔ میں نے دیکھا کہ میرے والد اور والدہ وہیں ریلوے سٹیشن پر سجدے میں گر گئے اور میرے دادا چچا اور دیگر سب ہی لوگ بھی۔ سب کی آنکھوں میں آنسو تھے اور سب پاکستان کی اس سرزمین کو چوم رہے تھے.....اور میں بھی اسی طرح اپنے بزرگوں کے پیچھے پیچھے سجدہ ریز ہو گیا۔

کسی کو اپنے سامان کی پرواہ نہ تھی۔ سامان تھا بھی کونسا زیادہ مگر جتنا بھی تھا بہت ضروری مگر مجال ہے کسی کو بھی اپنے سامان کی ذرا بھر پرواہ ہو۔ سجدہ شکر سے اٹھے تو اپنا اپنا سامان لیا۔

Marfat.com

میری ماں نے کہا "چوہدری بچوں کو کھانے کے لئے کچھ دو۔ اتنی دیر سے کچھ بھی نہی کھایا۔"

میری ماں نے ایک دیگچہ میں کچھ چاول ابال رکھے تھے جن کے کھانے کی نوبت ہی نہ آئی تھی کہ راستہ خوف کی کالی گھٹاؤں ہی میں کٹا تھا۔ اب دیکھا تو وہ چاول بس چکے تھے۔ اس وقت میری ماں اور دادی کا مایوسی بھرا چہرہ دیدنی تھا۔ یہ ان کے پاس راشن کے آخری چاول تھے اور باقی کچھ نہ تھا۔

اتنے میں لاہور مسلم لیگ کے رضا کار آئے اور ان کے پاس تازہ آنے والے مہاجروں کے لئے نہایت ہی عمدہ اور تازہ تازہ کھانے تھے۔ ہمارے حصہ میں گرم گرم تازہ پکا مرغ پلاؤ آیا اور وہ ساتھ کچھ کمبل بھی دے گئے۔ نام پوچھا نہ پتہ اور وہ سب کے لئے ہی یہ کچھ کر رہے تھے۔

"دھن مولا! دھن تیری ذات پاک ہے۔ تو ہی سب کچھ ہے۔ شکر ہے مولی تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ تو ہی دیتا ہے اور تو ہی لیتا ہے۔ سب کچھ تیرا ہے۔ سب رنگ تیرے۔ سب ڈھنگ تیرے۔ کوئی کچھ نہیں۔ رانگڑ نہ مہترہ۔ تو ہی تو"۔

میرے دادا کی گرجدار آواز آئی اور وہ سجدہ ریز ہو گئے۔ اپنی بھینس چھننے کے بعد اس دن پہلی دفعہ ان کی آواز میں وہ پہلے والی تمکنت اور گرج آئی تھی اور سب نے بیک زبان ہو کر کہا "او! بابا بالکل ٹھیک ہو گیا۔ اے"۔

یہ تھی پہلی پہلی برکت پاکستان آنے کی۔ ہم نے بہت دیر بعد -- بہت ہی دیر بعد پیٹ بھر کر اتنا اچھا کھانا کھایا تھا۔

مجھے نہیں معلوم کہ پھر میں کب سو گیا یا ہمارے ساتھ کیا ہوا۔ جب آنکھ کھلی تو میں اور میرا خاندان والٹن کیمپ لاہور میں تھا۔ وہاں ہم کیسے پہنچے مجھے معلوم نہ ہے مگر ہم پہنچ گئے۔

Marfat.com

لاہور والٹن کیمپ

والٹن مہاجر کیمپ میں ہم چار دن ٹھہرے۔ یہاں کا انتظام بہت اچھا تھا ہمیں ایسا لگا کہ جہاں سے ہم آئے تھے وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ بس اک نام اللہ کا تھا۔ یہاں ہر روز کچھ نہ کچھ کھانے کو مل جاتا۔ پینے کا پانی اچھا تھا بلکہ ہم سب اتنی دیر کے بعد صاف ستھرے پانی سے نہائے بھی۔ اس وقت نہانا اک زبردست عیاشی محسوس ہوا۔ نئے صاف ستھرے کپڑے پہنے۔ رضائیاں اور کمبل ملے۔ پاکستان کی طرف سے ہمیں سب سے پہلے ملے تحفے ایسے محسوس ہوئے جیسے ہم جنت میں پہنچ گئے ہیں۔ ہمیں اس وقت پاکستان اک جنت سے بالکل کم محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ ہم واقعی اک جہنم سے زندہ بچ کر آئے تھے۔ واہگہ کے اس پار موت تھی اور یہاں زندگی۔ میری آنکھوں کے سامنے اس وقت پاکستان زندگی کی اک خوبصورت علامت بن کر ابھرا اور یقین جانئے تاحیات یہ میرا تاثر قائم رہا اور قائم ہے۔

میری ماں نے کہا کہ پاکستان ہمارے لئے مسجد کا مقام رکھتا ہے۔ یہ پاک ہے اور انہوں نے مرتے دم تک پاکستان کو اک مسجد ہی سمجھا۔ بعد میں ہم پر بہت مشکل مشکل وقت بھی آئے مگر ہماری والدہ کے ایمان میں ذرہ بھر فرق نہ آیا..... اس عظیم صاحب ایمان ماں نے اپنے بیٹے کو مرنے سے پہلے پاکستان کے سب سے بڑے صوبے پنجاب کا I.G (آئی جی) پولیس بھی دیکھا۔ دیکھتی اور خوش ہوتی اور دفتر جانے سے پہلے ہر روز وہی درود اور وہی کلمہ کا دم کرتیں

Marfat.com

جن کی برکت سے اس کالاڈلا سردار موت کے منہ سے بچ کر بلکہ بار بار بچ کر نکلا تھا..... مگر یہ بات بہت بعد کی ہے۔

والٹن کیمپ مہاجروں کی بحالی اور آباد کاری کے لئے سب سے پہلا پڑاؤ تھا۔ آنے والوں کی بنیادی ضرورتیں پوری کی جاتیں۔ بیماروں کے لئے دوا دارو کا بندوبست ہوتا۔ تھوڑا سا زاد راہ ملتا اور پوچھا جاتا کہ کہاں جانا چاہتے ہیں۔ پنجاب کے مشرقی (بھارت) حصہ سے آنیوالوں کے اکثر رشتہ دار مغربی پنجاب (پاکستان) کے کالونی اضلاع میں پہلے ہی آباد تھے۔ لوگ وہیں جانا پسند کرتے اور وہ اپنی ترجیح بتا دیتے۔ مہاجرین کو ان جگہوں کی پرچی مل جاتی اور وہ اس طرف کو بذریعہ ریل۔ لاری یا بیل گاڑی وغیرہ چل دیتے۔ قصبوں شہروں کے رہنے والے اپنی اپنی پسند کے قصبوں اور شہروں کا رخ کرتے تو کاشتکار قسم کے لوگ دیہات میں جاکر بسنا پسند کرتے۔ یوں بحالی اور آباد کاری کی سمت پاکستان پہنچتے ہی پہلے ہی پڑاؤ میں طے ہو جاتی۔ ڈیوٹی پر ہر سرکاری ملازم اور رضا کار کمال لگن سے کام کرتا نظر آتا اور ایسی ایسی محبت و التفات کا مظاہرہ کرتا کہ اجڑے پجڑے لوگ عش عش کر اٹھتے تھے۔ مصیبت' موت' وچھوڑا' بیماری' بے سرو سامانی اور بے رحمی کے بے پناہ مظاہر نے اکثر آنے والوں کو چڑچڑا ہی نہیں بلکہ پاگل بنا رکھا تھا مگر ان چند بے لوث ورکروں کی دلداری نے ہر آنے والے مہاجر کو اپنا اور پاکستان کا گرویدہ بنا لیا تھا۔ وہ بے نام و نشان لوگ کون تھے اب کوئی نہیں جانتا مگر تھے وہ بہت ہی عظیم لوگ۔ ہم ان لوگوں کو کبھی نہیں بھولے اور ہمیشہ ان کے لئے دعا کی۔

آنے والے مہاجر اپنی بقاء کی آخری حدیں چھو کر آئے تھے اور ایسی صورت میں انسان اپنے بنیادی گروہوں اور مصیبتوں کی گود میں ضرور دھکیلے جاتے ہیں۔ ہجرت کا پہلا محرک تو صاف ظاہر ہے ہندو مسلم اختلاف بنا تھا۔ لٰہذا سب لوگ ہندوؤں سے بھاگ کر آتے تھے اور پھر بھاگتے بھاگتے اپنے اپنے قبائلی اور جغرافیائی شناختوں کی بکل میں گھستے گئے۔ گوجر گوجروں کے ساتھ راجپوت راجپوتوں کے ساتھ جاٹ جاٹوں کے ساتھ ارائیں ارائیوں کے ساتھ اور یوں جن کی جو قبائلی شناخت تھی وہ اسی کی آغوش عافیت میں گھستا گیا۔ یوں ضلع وار اور تحصیل وار لوگوں کی قربتیں نظر آنے لگیں بلکہ گاؤں گاؤں اور گوت گوت کی علیحدگی اور اکٹھ کے سبب بنے۔

Marfat.com

ہم لوگ چار دنوں کے کیمپ قیام میں یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ کہاں جاکر آباد ہونا ہے۔ کچھ لوگ گجرات جانے کو ترجیح دے رہے تھے کہ یہ گوجروں کا دیس ہے اور کچھ لوگ لاہور کے قریب ہی آباد ہو جانا پسند کرتے تھے کہ ہمارا پچھلا دیس یہاں سے زیادہ قریب رہے گا۔

کھاریوں' چھچھوں' کالسوں' طوروں اور چند ایک اور گوجر گوتوں نے فیصلہ کیا کہ وہ گجرات جاکر بسیں گے اور وہ پھالیہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ میرے اکثر ننھیال ادھر جا آباد ہوئے اور ڈاکٹر پیر محمد طور کا خاندان بھی وہیں چک نمبر۲۱ میں جاکر آباد ہوا جن کے گھر امریکہ میں بیٹھ کر میں یہ سطور لکھ رہا ہوں۔

میرے والد کی ترجیح ٹوبہ ٹیک سنگھ تھی کہ وہاں ان کی بہن پہلے سے آباد تھی۔ ہمارے دادا اپنے بھائی کے ساتھ رہنا پسند کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ سب دیدڑ ایک ہی جگہ آباد ہوں اور کہتے جاتے کہ خون آخر خون ہے اور اپنا خون زیادہ گاڑھا ہوتا ہے۔ مصیبت کے وقت کام آتا ہے۔ دادا کے آگے کوئی بول نہیں سکتا تھا مگر میری والدہ کا ایک بہت ہی سنگین مسئلہ تھا۔ وہ اپنے اکلوتے بھائی اور ہمارے ماموں فضل محمد سے وچھوڑے کو برداشت نہیں کر پا رہی تھیں جو کہیں ہوشیار پور کیمپ ہی سے غائب تھے اور ہزار تلاش کے بعد بھی نہ مل سکے تھے۔ پاکستان پہنچ کر ماموں فضل کی تلاش ان کا سب سے بڑا مسئلہ اور پہلی ترجیح تھی۔ وہ ہر وقت فضل ہی فضل پکارتی رہتیں۔ کسی نے کہہ دیا کہ وہ لاہور ریلوے سٹیشن کے کیمپ میں دیکھے گئے ہیں۔ اب یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ ماموں فضل کا وہاں پتہ چلے اور وہاں ہم نہ جائیں۔ سب لوگ ہی ادھر چل پڑے۔ میرے دادا چچا اور سارے دیدڑ لاہور ریلوے سٹیشن پہنچ گئے اور میرے ماموں فضل محمد وہاں مل گئے۔ کیا منظر تھا۔ میں آج تک نہیں بھول سکا۔ ہر طرف سسکیاں اور آنسو ہی آنسو تھے۔ روئے دھوئے اور پتہ نہیں کتنی دیر تک حال احوال چلتا رہا۔ شام ہو گئی اور ریلوے سٹیشن پر بجلی کے قمقمے جل اٹھے۔ میرے دادا نے کہا کہ یہ بجلی آپ کو پتہ ہے کہاں سے آ رہی ہے۔ یہ ہمارے پچھلے دیس سے آ رہی ہے۔ آپ کو پتہ ہے ہمارے گاؤں کے عین سامنے جوگندر نگر تھا وہاں سے یہ بجلی آ رہی ہے۔ وہاں بہت بڑی آبشار انگریزوں نے بنائی تھی اور اس میں سے انہوں نے یہ ساری بجلی نکالی تھی۔ میں نے وہ سب کچھ بنتے دیکھا ہے۔ یہ بجلی میرے گاؤں سے آ رہی ہے..... میرے گاؤں سے آ رہی ہے کہتے کہتے میرے دادا آبدیدہ ہو گئے اور پھر سبھی سوگوار ہو گئے۔ اتنے میں کہیں سے ایک نہایت ہی درد ناک آواز

Marfat.com

میں گانے کی آواز آنے لگی۔ وہ کوئی بچھڑنے کے متعلق گانا تھا۔ اس وقت چونکہ ہر کسی کا کوئی نہ کوئی عزیز بچھڑا ہوا تھا تو یہ لے اور بول ہر کسی کو رلا دیتے تھے۔ بڑا ہی دکھی سا گانا تھا۔ ہمارے ماموں نے بتایا کہ یہ گانا ہر روز ریڈیو سے آتا ہے یہ کوئی سائیں مرنا گاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس نے خود ہی ایک ساز تیار کیا ہے جو تونبہ کی طرح ہوتا ہے اور اسے اک تارہ کہتے ہیں۔ ماموں فضل نے کہا کہ میں یہ گانا سن کر ہر روز آپ لوگوں کو یاد کرتا تھا اور روتا رہتا تھا اور آج آپ سب لوگ مل گئے ہیں۔ کتنی خوشی کی بات ہے۔ سنا ہے کہ سائیں مرنا کے سب لوگ مر چکے ہیں اور اپنے خاندان میں وہ واحد بچ سکا ہے۔ باقی سب قتل ہو گئے۔ اس وقت سے یہ روتا رہتا ہے اور گاتا رہتا ہے اور ہم سب لوگ اس ان دیکھے مظلوم سائیں مرنا کے لئے رونے لگے۔ عجیب منظر تھا۔

ہم نے وہ ساری رات ریلوے سٹیشن پر گزاری۔ میرے ماموں اپنے گوت کے ساتھ گجرات جانا چاہتے تھے اور ہمارے گوت کے بڑے وڈیرے وہیں لاہور کے قریب ہی Settle ہونا چاہتے تھے۔ ہماری والدہ کے لئے فیصلہ بہت مشکل تھا۔ لوگ بحث کرتے رہے روتے رہے اور صبح کو ہمارے ماموں ایک قافلہ کے ساتھ گجرات کی طرف روانہ ہو گئے اور ہماری والدہ سینے پر پتھر رکھ کر چپ ہو گئیں۔

پھر پتہ نہیں کیوں اور کیسے ہم شاہدرہ پہنچ گئے اور جہانگیر کے مقبرہ کے سامنے بہت سے اور مہاجروں کے ساتھ ہم نے ڈیرے لگا دیئے۔ راوی کے پرانے پل والی سڑک کے ساتھ لگے اونچے اونچے درخت اور نور جہاں کے مقبرہ کے سامنے لگے کھجور کے درخت مجھے کبھی نہیں بھولتے۔ اب بھی میں جب وہاں سے گزرتا ہوں تو وہاں کی بہت سی باتیں یاد آتی ہیں۔ دو باتیں مجھے خاص طور پر یاد آتی ہیں کہ ایک دن صبح صبح ایک آواز آئی ..... اے دودھے لے لو ..... دودھے لے لو۔ معلوم ہوا کچھ خواتین دودھ بیچ رہی ہیں۔ میری ماں نے کہا میرے بچوں نے اتنی مدت سے دودھ کا منہ نہیں دیکھا۔ یہ تو جے پلے ہی نہیں نہائے بھی دودھ میں ہیں۔ جاؤ دودھ لے آؤ۔ چوہدری ہماری والدہ نے ہمارے والد صاحب سے کہا اور وہ ایک بالٹی دودھ کی لے آئے۔ ہم سب بہت خوش ہوئے۔ دودھ گرم کیا گیا اور ہماری والدہ نے اصرار کیا کہ اس میں سے کچھ دودھ وہ ضرور گیارھویں شریف کے نام پر خیرات کریں گی اتنی دیر ہو گئی یہ فریضہ ادا نہیں ہو سکا۔ میں گیارھویں شریف کا دودھ جہانگیر بادشاہ کے مزار پر دے

Marfat.com

آؤں گی۔ بہت ثواب ہو گا۔ جب ہم نے دودھ پیا تو وہ کچھ نمکین نمکین سا تھا۔ ہم تو بھینسوں کا گاڑھا میٹھا دودھ پینے کے عادی تھے۔ میں نے اور میری بہن نے ناک بھوں چڑھائے اور ہم نے کہا کہ یہ نمکین دودھ ہے۔ سب نے سمجھا کہ بیماری کی وجہ سے ہمارے منہ کے ذائقے خراب ہو گئے ہیں۔ پھر کسی اور نے دودھ چکھا تو معلوم ہوا کہ واقعی دودھ نمکین ہے۔ کسی نے کہا کہ بیچنے والوں نے اس میں نمک ڈال رکھا ہے اور کسی نے کہا خراب ہے۔ بہر صورت ایک دانائے کل نے عقدہ کشائی کی کہ یہ دودھ اونٹنیوں کا ہے اور اسی لئے اتنا سستا بھی ہے۔ چند دنوں کے وہاں قیام کے دوران ہم وہ دودھ پیتے رہے اور یہ سب اللہ کی عنایت تھی کہ ہماری مہاجر کیمپوں سے لی گئی بہت سی پیٹ کی بیماریوں کا یہ بہترین علاج نکلا اور ہم رو بصحت ہو گئے۔

دوسرا واقعہ میری والدہ اور دادی کا دودھ لے کر نہایت عقیدت کے ساتھ بادشاہ جہانگیر کے مقبرہ پر جانا ہے اور نہایت خشوع و خضوع سے دعائیں مانگنا ہے اور خاص طور پر میری دادی کی دعا کہ یا اللہ میرے پوتے کو اس بادشاہ کی طرح نیک اور بڑا بنا دے۔ کیمپ میں کسی عالم فاضل نے جب یہ بات سنی تو اس نے ان سادہ لوح خواتین سے کہا کہ یہ بادشاہ تو کوئی اچھا انسان نہ تھا یہ شراب پیتا تھا اور برے کام کرتا تھا۔ یہ ساتھ اس کی بیگم نور جہاں کا مقبرہ ہے جو کسی اور کی بیوی تھی اور بہت حسین تھی۔ اس بادشاہ نے اس کے خاوند کو مروا کر خود اس کے ساتھ شادی کر لی تھی اور آپ لوگ اس قبر پر جا کر دعا مانگ رہی ہیں۔ یہ سن کر میری دادی نے صرف یہ کہا نہیں پت تینوں نہیں پتہ۔ بادشاہ دے اندر ایک سو ولی دی طاقت ہوندی اے..... تاں جا کے او بادشاہ بندا اے۔ میرا لاڈلا بڑا ہو کے ضرور جہانگیر بادشاہ بنے گا۔

مجھے جب بھی وہ نہایت ہی معصوم سی باتیں اور خواہشیں یاد آتی ہیں تو خواہ مخواہ میری ہنسی نکل جاتی ہے اور میرے ارد گرد کھڑے لوگوں کو قطعاً معلوم نہیں ہوتا کہ میں کیوں ہنس رہا ہوں اور مجھے امام رازی کی وہ دعا یاد آ جاتی کہ جو انہوں نے مرتے وقت کی تھی کہ یا اللہ مجھے نیشا پور کی بڑی بوڑھیوں کے ایمان پر اٹھانا اور جب ان کے کسی مرید نے ان سے پوچھا کہ یا حضرت آپ تو اتنے بڑے عالم اور مفسر قرآن ہیں آپ ان بوڑھی عورتوں کے ایمان پر کیوں مرنا چاہتے ہیں تو امام صاحب نے فرمایا..... بھائی جتنا ایمان ان بوڑھی عورتوں کا غیر متزلزل اور پختہ ہے اتنا ہم عالم فاضل قسم کے لوگوں کا نہیں ہو سکتا۔

Marfat.com

شاید میری دادی اور ماں کا ایمان بھی ایسا ہی تھا۔ وہ واقعی یومنون بالغیب کی مکمل تصویر اور تفسیر تھیں۔

وہاں سے ہم چلتے چلاتے لاہور کے ایک قریبی گاؤں مراکہ میں پہنچ گئے۔ وہاں کے مقامی لوگوں نے ہماری بہت آؤ بھگت کی۔ ملک محمد حیات اور چوہدری بوٹا کے نام مجھے ابھی تک یاد ہیں جو دن رات ایک کئے ہوئے تھے کہ ان آنیوالے اجڑے پجڑے مہاجروں کی جتنی تکلیف کم ہو سکے کم کی جائے۔ ہمیں ایک مکان مل گیا۔ ساتھ دالان تھا اور چھوٹا سا ایک چھپر بھی۔ کھانا پکانے اور پانی رکھنے کے لئے کچھ برتن ملے مگر ان میں سے کچھ برتنوں پر ہندی میں کچھ کندہ تھا۔ شاید ان کے پرانے مالکوں کے نام تھے۔ ہماری والدہ نے ان برتنوں کو ہاتھ لگانے سے اس لئے انکار کر دیا کہ اس پر کلمہ کفر لکھا ہے۔ اب یہ ایک اور مصیبت بن گئی۔ ہمارے والد صاحب نے کہیں سے ریتی لی اور وہ حروف مٹائے تب جاکر ہماری والدہ انہیں استعمال کرنے پر رضامند ہوئیں۔

چند دنوں بعد ہمیں کچھ زمین اور ایک کنواں بھی الاٹ ہو گیا مگر بیل نہ مل سکے۔ بیل خریدنے کی سکت تھی نہیں۔ لہٰذا زمین کس کام کی؟ بیل کے بغیر کنواں چلے نہ ہل۔ بیج ملے نہ پھل۔ جائیں تو جائیں کدھر۔ کھانے کو اب کچھ رہا نہ تھا۔ پناہ گیر ضرور تھے مگر کیمپ کی روٹیاں بھی یہاں میسر نہ تھیں۔ بیج بیل کے لئے سرمایہ کاری اور فصل پکنے کے انتظار کی سکت رہی نہ تھی۔ یہاں تو صبح شام کھانے کو چاہئے تھا اور وہ بھی محض بنیادی جنس گندم یا چاول۔ ابھی دال بھی دور کی بات تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دن ہماری والدہ نے راشن سے بچے آخری چاول ابالے جن میں کہیں سے ڈالنے کے لئے عام نمک اور لال مرچ مل گئی تھی۔ گھی اور تیل کی عیاشی کا تو سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ ایسا مزیدار پلاؤ یا اسے بریانی کہہ لیں میں نے پھر زندگی بھر کبھی نہیں کھائی۔ واقعی بھوک بہترین چٹنی ہے۔

خدا کا کرنا ہوا اگلے ہی روز ہمارے والد صاحب کو مراکہ کے ساتھ گزرتی معروف شاہراہ ملتان روڈ پر گلاب نامی ایک مہربان فرشتے نے مزدوری دے دی۔ پتہ نہیں کیا انہیں ملتا تھا شاید ایک روپیہ روزانہ مگر ہمارے نان و نفقہ کا بندوبست ہو گیا۔ ہمارا سارا خاندان اس گلاب نامی فرشتہ کا آج تک ممنون خاطر ہے۔ میں خود والد صاحب کے ساتھ جاکر ان کی مدد کرتا اور کبھی کبھی لک پر ڈالی روڑی کو ایک بھاری مگدر سے سخت دھوپ میں کوٹتا رہتا اور پھر ہم دونوں

Marfat.com

باپ بیٹا روہی نالہ کے پل کے نیچے دھوپ سے بچنے کے لئے دوپہر کو سو جاتے۔ یہ روہی نالہ جو اب لاہور شہر کے پھیلاؤ کی وجہ سے گٹر بن چکا ہے اصل میں اک برساتی نالہ تھا جو بارشوں کا فالتو پانی لے جا کر دریائے راوی میں ڈالتا تھا۔ اب تو ذرا نقشہ ہی بدل چکا ہے۔ خود مراکہ گاؤں شہر کا حصہ بن چکا ہے۔ اس وقت کا مراکہ کچھ اور ہی تھا۔

گاؤں کے ایک حکیم نما بزرگ نے ہماری والدہ کو مشورہ دیا کہ اپنے بچے کو گلاب کے پھولوں میں ہی کھچڑی کھلاؤ اس کی سب بیماریاں اور دلدر دور ہو جائیں گے کیونکہ کیمپوں کی کم خوراکی اور بیماری کی وجہ سے میری پسلیاں نکل آئی تھیں اور پیٹ پانی وغیرہ سے بھر کر بہت پھیل گیا تھا ہماری والدہ نے کہیں سے گلاب کے خشک پھول لئے اور مجھے ہر روز کھچڑی کھلانا شروع کر دی ..... اور میں بالکل تندرست اور صحیح سلامت ہو گیا۔ دوڑنے بھاگنے لگا۔ گلی ڈنڈا کھیلتا اور والد صاحب کے لئے سڑک پر کھانا لے کر جاتا۔ ایک دن دیکھا کہ سڑک کے ساتھ ایک پرائمری سکول ہے۔ میں نے ہندوستان میں پرائمری پاس کر لی تھی بلکہ میں وظیفہ کے امتحان میں اپنی پوری تحصیل اونہ میں اول رہا تھا اور میری قابلیت کا بڑا شہرہ تھا یہاں تک کہ چند ہندوؤں نے مجھے فرسٹ آنے پر خوب مارا تھا کہ یہ مسلہ کیسے فرسٹ آگیا ہے۔ اس وقت پرائمری چار جماعت تک ہوتا تھا جو اب پانچ جماعت تک ہے۔ میں اس مراکہ سکول کے باہر کھڑا تھا تو وہاں کے ماسٹر صاحب نے مجھے دیکھ لیا اور کہا آجاؤ بیٹا۔ تم بھی آجاؤ۔ پڑھنا چاہتے ہو..... میں نے کہا ہاں ماسٹر جی میں پڑھنا چاہتا ہوں۔

پھر میں نے اپنی تعلیم کا سارا ماضی انہیں بتا دیا۔ اور بتایا کہ میرے پاس قلم ہے نہ دوات۔ قاعدہ ہے نہ کتاب۔

ماسٹر جی نے کہا فکر نہ کریں۔ یہاں کسی کے پاس کچھ بھی نہیں۔ سب زبانی زبانی چل رہا ہے۔ تم بھی آجاؤ اور دوبارہ چوتھی جماعت میں داخل ہو جاؤ کیونکہ یہاں صرف چوتھی جماعت تک ہی تعلیم ہوتی ہے اور میں اس سکول میں داخل ہو گیا۔ ماسٹر جی نے خود ہی میری تاریخ پیدائش ۱۱ مارچ ۱۹۳۷ء لکھ دی جو آج تک میری سرکاری تاریخ پیدائش ہے۔ اصل تاریخ پیدائش مجھے پتہ ہے اور نہ میرے مرحوم بڑوں کو۔ بس ماسٹر جی نے لکھ دیا اور کام چل گیا۔

مجھے یاد نہیں کہ وہ کونسا مہینہ تھا جب میں سکول میں داخل ہوا مگر تھوڑی ہی دیر بعد ماسٹر جی نے کہا کہ مانگا منڈی کے سکول میں وظیفہ کا امتحان ہو رہا ہے اور تم ہمارے سکول کی طرف

Marfat.com

سے اس امتحان میں بیٹھو گے۔ میں نے کہا میں وہاں کیسے پہنچوں گا۔ ماسٹر جی نے کہا فکر نہ کریں میں تمہیں خود ساتھ لے کر چلوں گا۔ میرا اپنا گھر وہیں ہے اور میں نے ماسٹر جی کے ساتھ پیدل جا کر مانگا منڈی میں وظیفہ کا امتحان دیا اور جب نتیجہ آیا تو میں ایک دفعہ پھر پوری تحصیل لاہور میں فرسٹ تھا۔ شاید اس لئے کہ میں نے یہ کام پہلے بھی کیا ہوا تھا۔ وہی سوال تھے جو ہمیں اونہ میں پوچھے گئے تھے اور اسی قسم کے ممتحن تھے۔ بہر صورت میری قابلیت کا ڈھنکہ ایک دفعہ پھر سب رشتہ داروں پر بیٹھ گیا اور میری دادی کو کہنے کا موقع مل گیا کہ میرا لاڈلا ضرور بادشاہ بنے گا۔ میرا خیال ہے ایسے سادہ لوح انسانوں کے ذہنوں میں یا پٹواری بڑا آدمی تھا یا پھر بادشاہ۔ درمیان میں شاید کوئی جچتا ہی نہ تھا یا پھر کوئی جانتا ہی نہ تھا۔

ان ہی دنوں میں میری پھوپھی ..... ہماری واحد پیاری پھوپھی کرمت بی بی ٹوبہ ٹیک سنگھ سے آئی ہوئی تھیں۔ انہوں نے اصرار کیا کہ وہ سردار کو اپنے ساتھ لے جائیں گی اور وہاں اس کی تعلیم کا اچھا انتظام کریں گی۔ ٹوبہ میں ایک بہت اچھا ہائی سکول ہے اور ان کے گھر سے بالکل ہی قریب۔ چنانچہ میں ان کے ساتھ ٹوبہ ٹیک سنگھ چلا آیا۔ اس دفعہ ٹرین کا سفر بہت اچھا اور آرام دہ محسوس ہوا۔ میرے چچا محمد دین بھی ہمارے ساتھ چلے آئے۔ ہمارے پھوپھا کو سارا شہر جانتا تھا اور ان کی وہاں بہت عزت تھی۔ انہوں نے کسی کو کہہ کہلا کر چاچا محمد دین کو ایس۔ ڈی۔ او ٹوبہ ٹیک سنگھ کی کچہری میں چوکیدار بھرتی کروا دیا اور چاچا چوکیدار بن کی یکدم صاحب روز گار بن گئے۔ ہم سب خوش ہوئے کہ چلئے روٹی تو چلے گی۔ مراکہ میں تو بیل بیج نہ ملنے کی وجہ سے ہم روٹی ہی سے عاجز ہو گئے تھے۔

چند دنوں بعد میری والدہ میرے بغیر بہت زیادہ اداس ہو گئیں اور میں بھی والدہ کے بغیر بے حد اداس ہو گیا۔ میں کبھی بھی والدہ سے دور نہیں رہا تھا۔ مجھے چٹھی لکھنا آتی تھی اور میں نے چپکے سے پھوپھی کو بتائے بغیر مراکہ چھٹی لکھ دی کہ میں بہت اداس ہوں ..... اور پھر میری والدہ نے سب کو مجبور کر دیا کہ وہ فوراً ٹوبہ چل پڑیں اور پھر ہمارا سارا کنبہ ٹوبہ ٹیک سنگھ چلا آیا۔ ہمارے دادا چچا زور ہی لگاتے رہے مگر اس دفعہ ان کی ایک نہ چلی اور یوں ہم لوگ کوٹھیڑہ سے چلتے چلتے ٹوبہ ٹیک سنگھ آن پہنچے۔ یہاں ہمیں پناہ گیر سے آباد کار اور "مستقل" رہائشی بننا تھا۔ اور بن گئے۔

Marfat.com

کیسے اور کیونکر بنے؟ وہ بھی ایک عجیب و غریب کہانی ہے۔ سننے کی نہ سنانے کی۔ کیا سوچا تھا اور کیسا بن گیا۔ سب اس کی قدرت کا کرشمہ ہے

جو کچھ بھی ہوا وہ چند ایک عجیب و غریب اتفاقات و واقعات کا مجموعہ ہے۔ سوچ سمجھ کر کسی منصوبہ بندی کے تحت یہ ہونے کو تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔ سب کچھ تقدیر کا کھیل تھا اور واقعات کی کڑیاں خود بخود ہی ملتی گئیں اور اس کی قدرت کاملہ کو ہر مرحلہ اور ہر لمحہ آشکارہ کرتی ہیں۔ سبحان اللہ۔ وہی ذات ہے۔ وہی کمال ہے وہی اول وہی آخر۔

فبای الاء ربکما تکذبان۔

Marfat.com

ٹوبہ ٹیک سنگھ

ٹوبہ ٹیک سنگھ سعادت حسن منٹو کے افسانہ کا نہیں ایک حقیقت کا نام ہے جس کا نام نامی ایک نہایت ہی نیک سیرت انسان ٹیک سنگھ کے نام پر رکھا گیا ہے۔ سنا ہے وہ نیک انسان اس بیابان میں پانی کا ایک ٹوبہ بنا کر صرف اس لئے بیٹھا تھا کہ جھنگ' کمالیہ۔ شورکوٹ۔ ملتان وغیرہ سے آنے جانے والے یا بھولے بھٹکے انسانوں حیوانوں کی زیست کا سامان اس بے آب و گیاہ بیابان میں کرے جو چاروں طرف سے تقریباً برابر مسافت پر واقع تھا اور بعد میں نہری نظام آنے پر ایک اہم قصبہ منڈی بننے والا تھا۔ نہریں کھدنے سے پہلے یہ تمام علاقہ بے آباد جنگل اور صحرا تھا۔ یہاں کوئی نہیں بستا تھا۔ بسا تھا تو صرف ایک ٹیک سنگھ کہ مخلوق خدا کو پانی پلا سکے۔ سنا ہے شیر چیتے بھی اس کے ہاں سے پانی پیتے تھے اور اسے پیار کرتے تھے۔

کوئٹہ کے شوالکی پہاڑوں سے اڑے پنچھیوں کو اسی جگہ آکر پناہ ملتی تھی۔ محبت اور مقام بھی ملتا تھا مگر کچھ محنت کے بعد' کچھ دشواری کے بعد کہ قدرت امتحان ضرور لیتی ہے اور جو امتحان میں پاس ہو جائے اسے انعام میں بھی ضرور دیتی ہے اور بے حد و حساب دیتی ہے۔ سبحان اللہ۔ الحمد اللہ

جب تک ہمارا خاندان ادھر ادھر کے دھکے کھا کر ٹوبہ ٹیک سنگھ پہنچا تقسیم ہند کو شاید دو سال ہو چکے تھے اور پہلے آنیوالے مہاجروں نے تمام زرعی اراضی الاٹ کرا لی تھی۔ شہر میں

Marfat.com

کوئی جگہ تھی نہ گاؤں میں۔ دیر سے پہنچنے والوں کے ساتھ ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔ والد صاحب نے زمین الاٹ کرانے کے لئے بہت پاپڑ بیلے مگر کوئی بات نہ بنی۔ زندہ رہنے کے لئے کچھ تو کرنا تھا۔ آخر فیصلہ کیا کے ایک کلہاڑی خرید کر لکڑیاں پھاڑنے کی مزدوری کا کام شروع کرتے ہیں۔ ابھی یہ سوچ ہی رہے تھے کہ ٹوبہ تحصیل میں چپڑاسی کی ایک آسامی نکل آئی اور خوش قسمتی سے والد صاحب کو وہاں رکھ لیا گیا اور ان کی ڈیوٹی ٹوبہ ٹیک سنگھ کے ایس۔ ڈی۔ ایم (سب ڈویژنل مجسٹریٹ) کے ساتھ لگا دی گئی۔ ایس۔ ڈی۔ ایم صاحب کی کچہری اور کوٹھی کے ساتھ ہی ایک کمرے کا کوارٹر رہنے کے لئے مل گیا اور ہم سب وہاں رہنے لگے۔ بنیادی رزق روٹی کا اللہ تعالی نے بندوبست کر دیا تھا۔

ہماری والدہ نے اب تمام بچھڑے عزیز و اقارب کی مختلف طریقوں سے تلاش شروع کر دی اور ہر آنے جانے والوں سے ہر کسی کا کرید کرید کر پوچھتیں۔ مجھ سے چٹھیاں لکھواتیں اور ایک کا دوسرے سے پتہ کرواتیں۔ یوں ہمارا چھوٹا سا کوارٹر عزیز و اقارب اور بچھڑے واقف کاروں کا ہیڈ کوارٹر بن گیا۔ اس وقت جب کہ ایک ایک کاغذ ملنا محال تھا مجھے ایک بہت بڑا رجسٹر لاکر دیا گیا جن پر میں مختلف بچھڑے لوگوں کے کوائف اور پتے درج کرتا تھا۔ یوں مجھے بچپن ہی سے ایک طرح کی مردم شماری کی تربیت ملنا شروع ہو گئی۔ اس ظاہری بے معنی مگر لگن سے بھرپور Activity جلد ہی بہت عمدہ نتائج برآمد ہونا شروع ہو گئے۔ میرے ماموں اور ممانی گرچہ گجرات چلے گئے تھے مگر میری ممانی کے والد پتہ نہیں کیسے اور کس طرح خانیوال پہنچ گئے اور ان کا باقی سارا خاندان سرگودھا۔ ان سب کا مل جانا صرف ہماری والدہ کی کاوش سے ہی ممکن ہوا۔ اسی طرح ہمارے گاؤں کا رمضان نامی ایک لڑکا ہجرت کے دوران اپنے ماں باپ سے کہیں بچھڑ گیا اور کسی بھلے انسان کی مدد سے گوجرہ پہنچ گیا۔ رمضان کی ماں اپنے بچھڑے بیٹے کو مراکہ میں روتی رہی اور ہماری ماں نے ہر ایرے غیرے سے پوچھ پوچھ کر اور نہایت تربیت یافتہ پولیس والوں کی طرح رمضان کا حلیہ بتا بتا کر آخر اسے ڈھونڈ ہی نکالا۔ جب رمضان کی والدہ اسے ہمارے ہاں سے لینے پہنچی تو وہ ماں کے ملنے کا منظر دیکھنے والا تھا۔ ہر آنکھ پر نم تھی اور ہر ہاتھ دعائے خیر کے لئے اٹھا ہوا تھا۔ یوں ہماری والدہ کی کاوش سے سینکڑوں بچھڑے رشتہ دار بہن بھائی ایک دوسرے کو مل پائے۔ لیکن اس سارے عمل کا معاشی بوجھ بہت بڑھ گیا تھا۔ ہمارے چچا اور والد صاحب کی تنخواہ مل کر بھی گزارے کے لئے کافی نہ تھی۔ ہمارا کوارٹر آہستہ آہستہ

Marfat.com

کوائر آہستہ آہستہ کیمپ بن گیا تھا۔ میرے ماموں کمر کی سخت تکلیف کے باعث ہمارے پاس آکر صاحب فراش ہو چکے تھے۔ جگہ کم تھی اور ہر روز کوئی درجن بھر مرد عورتیں اور بچے آتے اور جاتے تھے۔ ان سب کے کھانے پینے کا بندوبست کرنا پڑتا تھا۔

لہٰذا ہم سب بوڑھے بچے کوئی نہ کوئی کام کرتے۔ میں اور میری بہن لکڑیاں اکٹھے کرتے۔ پانی بھر کر لاتے۔ میری بہن موتیے کے پھول چن کر ہار بنا دیتی اور میں بھاگ کر انہیں ریلوے سٹیشن پر گزرتے مسافروں کے پاس جاکر بیچ لیتا اور اگر کوئی مسافر سامان اٹھوا لیتا تو قلی کا کام بھی کر لیتا اور آنہ دو آنے مزید مل جاتے۔ یوں ہم سب اس مہاجر اکھٹ و آباد کاری میں حصہ لے رہے تھے جسکا اصل سہرا اور جذبہ صرف اور صرف ہماری والدہ کا تھا۔

ایک دن ایک شخص نے مجھ سے اپنا ہلکا سا بیگ اٹھانے کو کہا اور میں اٹھا کر اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ وہ ٹوبہ بازار میں پہنچ کر ایک چائے خانہ پر بیٹھ گیا اور چائے کے دو پیالوں کا کہا۔ چائے خانہ جو ایک معمولی سے لکڑی کے کھوکھے میں واقع تھا کا مالک پتھر کے کوئلے کی انگیٹھی گرم کرنے میں مصروف تھا۔ مسافر نے مالک کو جس کا بعد میں مجھے نام شیخ سردار محمد معلوم ہوا کو جلدی کرنے کو کہا۔ میں نے شیخ سردار کو کہا میں اس کی بھٹی جلاتا ہوں اور وہ جلدی سے مسافر کو چائے بنا دے۔ میں نے پنکھا چلا کر جلدی سے بھٹی جلا کر تیز کر دی اور چائے بن گئی۔ مسافر نے مجھے بھی ایک چائے کا کپ پلایا۔ ایک ابلا ہوا انڈہ کھانے کو دیا۔ میں اس عمدہ سلوک پر بہت خوش ہوا کیونکہ ایسا سلوک میرے ساتھ پہلے کبھی کسی مسافر نے نہیں کیا تھا اور پھر مجھے چار آنے مزدوری دے کر اپنا بستہ خود ہی اٹھا کر چلا گیا۔ مجھے اس سے پہلے اتنی زیادہ مزدوری بھی کبھی نہیں ملی تھی۔ مجھے تجسس ہوا کہ معلوم کروں کہ یہ کون شخص ہے۔ معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ یہ عیسائیوں کا پادری ہے اور لائلپور سے آیا ہے۔ اب میری بلا جانے کہ پادری کیا چیز ہوتی ہے۔ میں نے شیخ سردار سے پوچھ ہی لیا کہ یہ پادری کس چیز کا نام ہوتا ہے۔ اس نے مجھے بڑے آرام سے سمجھایا کہ جیسے ہم مسلمانوں میں مولوی ہوتے ہیں اسی طرح عیسائیوں کے ہاں پادری ہوتے ہیں۔ بیٹا تم اسے عیسائیوں کا مولوی ہی سمجھ لو..... اور پھر کہنے لگا

بیٹا کیا کام کرتے ہو

میں نے کہا کچھ نہیں۔ یونہی مزدوری کر لیتا ہوں۔ ریلوے سٹیشن پر ہار بیچ لیتا ہوں اور کوئی کہے تو قلی کا کام کر لیتا ہوں۔

Marfat.com

Marfat.com

ایک دن ماسٹر شاہ محمد مرحوم ..... اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ہمارے کھوکھا پر چائے پینے آئے اور انہیں پتہ چلا کہ میں پرائمری پاس ہوں بلکہ میں نے پرائمری دو دفعہ پاس کی ہے تو کہنے لگے کہ تم ہمارے ہاں سکول میں کیوں نہیں داخل ہو جاتے؟

میں نے کہا کہ میں پڑھنا چاہتا ہوں مگر میرے پاس فیس کی رقم اور کتابیں کاپیاں نہیں ہیں میں ایک دو ماہ اور کام کر کے پیسے کمالوں پھر سکول داخل ہوں گا۔

شیخ سردار محمد ہماری یہ باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔ یکدم کہنے لگا۔

ماسٹر جی! آپ اس بچے کو ضرور سکول میں داخل کریں۔ سارا خرچہ میں دوں گا۔ یہ بڑا برکت والا بچہ ہے۔ جب سے میرے پاس آیا ہے میرا کام چمک اٹھا ہے۔ میری آمدنی دوگنی ہو گئی ہے۔ یہ سب اس نے کمایا۔ آپ اسے پڑھائیں خرچہ میں دوں گا۔

خدا شیخ سردار محمد کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ کتنا بھلا انسان تھا پھر اس نے مجھے کہا:

بیٹا تم صبح صبح دونوں انگیٹھیاں بکھا جایا کرو اور سکول چلے جایا کرو۔ چھٹی ہونے پر پھر دوکان پر آجایا کرو۔ پنکھا ہی جھلنا ہوتا ہے۔ جھلتے رہا کرو اور ساتھ کتاب پڑھتے رہا کرو۔ تمہیں پوری تنخواہ بھی ملا کرے گی اور سکول کا خرچہ بھی۔

.....اور میں ڈسٹرکٹ بورڈ ہائی سکول ٹوبہ ٹیک سنگھ کی پانچویں جماعت میں داخل ہو گیا ایک مہینہ بعد ہی میں کلاس کا مانیٹر تھا۔ ماسٹر غلام قادر انگریزی کے استاد تھے۔ نہایت سخت اور محنتی میں نے تھوڑی سی انگریزی ہندوستان میں ہندو ماسٹروں سے پڑھی تھی۔ بنیاد تو موجود تھی جلد ہی میں انگریزی میں سب سے اچھا طالب علم بن گیا۔ شیخ سردار کی دوکان پر پڑے بعض لفافوں پر بس میں انگریزی پڑھتا رہتا اور یوں میں ماسٹر غلام قادر اور ماسٹر شاہ محمد کی آنکھ کا تارہ بن گیا۔ میرا ریاضی بھی اچھا تھا اور ہمیشہ میں سو فیصد نمبر لیتا تھا۔ سالانہ امتحان ہوا تو میں سب سے اول تھا۔ اسی طرح چھٹی اور ساتویں جماعت میں بھی میں ہر مضمون میں سب سے اول رہتا۔ مزدوری بھی کرتا۔ تنخواہ لیتا اور خوب پڑھتا بلکہ بعد میں تو شیخ سردار محمد نے مجھے صرف صبح کے وقت انگیٹھی سلگانے کی زحمت دی اور باقی سارا دن میری چھٹی ہوتی۔ اور خوب پڑھتا پڑھتا آٹھویں جماعت میں پہنچ گیا۔

Marfat.com

ادھر میں گھر میں بھی کچھ نہ کچھ کرتا رہتا اور گھر والوں کا ہاتھ بٹاتا۔ میونسپلٹی کے نلکے سے پانی بھاگ کر بھر لاتا۔ میری صحت بھی بہت اچھی ہو گئی تھی۔ کبڈی اور والی بال بھی کھیل لیتا۔ اور ایس۔ڈی۔ایم صاحب کے بچوں کو بھی کھلاتا یا ان کے ساتھ کھیلتا۔

Marfat.com

نیا ایس - ڈی - ایم

ایس-ڈی-ایم ٹوبہ ٹیک سنگھ کا سب سے بڑا افسر تھا۔ سب لوگ اس سے ڈرتے تھے۔ وہ محکمہ مال کا بھی افسر تھا اور پولیس کا بھی۔ لوگوں کو سزا بھی دیتا تھا اور جوڈیشنل حوالات کا بھی وہی کرتا دھرتا تھا۔ میونسپل کمیٹی کا بھی وہی سب کچھ تھا۔ سب لوگ ایس۔ ڈی-ایم سے بہت ڈرتے تھے۔ اتنے ڈرتے کہ کوئی اس کی کوٹھی کے پاس سے بھی نہ گزرتا اور ہم اس کے اندر رہتے تھے چاہے کوارٹر ہی میں کیوں نہ ہوں۔ لوگ ہم سے بھی خم کھاتے تھے۔

میں دل ہی دل میں سوچتا پڑھ لکھ کر آدمی کو ایس-ڈی-ایم بننا چاہیے۔

کیسے اور کس طرح؟

یہ مجھے کچھ پتہ نہ تھا۔ بس اک زور دار خواہش ضرور اٹھتی تھی مگر میں کسی سے کہتا نہیں تھا کہ کہیں لوگ مجھے پاگل سمجھ کر مارنا ہی نہ شروع ہو جائیں۔

پھر ایک بالکل ہی مختلف نوعیت اور رنگ ڈھنگ کا ایس-ڈی-ایم آگیا۔ شاید یہ ۱۹۵۰ء کی بات ہے۔ پہلا ایس-ڈی-ایم بدل چکا تھا اور نئے کی آمد آمد تھی۔ کچہری کے تمام لوگ سمجھتے تھے کہ پہلے اطلاع آئیگی۔ پھر سب لوگ ہار لے کر ریلوے سٹیشن پر پہنچیں گے اور نئے ایس-ڈی-ایم کو بینڈ باجے کے ساتھ لیکر آئیں گے۔ دعوتیں ہوں گی بلکہ بعض لوگ تو بڑے اہتمام سے دعوتوں کا پیشگی اہتمام بھی کر رہے تھے۔

Marfat.com

ایک دن میں ریلوے سٹیشن پر اپنی مزدوری کی تلاش میں گیاہوا تھاتو میں نے دیکھا کہ ایک نہایت ہی وجیع و شکیل دراز قد مسکراہٹ سے بھرپور نورانی چہرے والا شخص ٹرین سے اترا۔ ہاتھ میں ایک بڑا سابیگ لئے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چل رہا ہے۔ میں نے سمجھا کوئی اچھا گاہک ہے۔ سامان اٹھانے کو کہے گا۔ میں نے نہایت پر امید نگاہوں سے اس طرف دیکھا تو کہنے لگا۔

بیٹا یہاں ایس-ڈی-ایم کا گھر کدھر ہے؟

میں نے انگلی کے اشارے سے ایس-ڈی-ایم کی کوٹھی کی نشاندہی کی اور بتایا کہ وہ بالکل سامنے ہی ہے اور وہ شخص اپنا بوجھ خود اٹھائے ادھر چل پڑا۔

مجھے گاہک ہاتھ سے نکلنے کی مایوسی تو ہوئی مگر میرا تجسس میری مایوسی پر غالب آگیا اور میں اس شخص کے پیچھے پیچھے چل پڑا مگر اس اللہ کے بندے نے اس وقت تک ادھر ادھر نہ دیکھا جب تک وہ عین کوٹھی کے گیٹ تک نہ پہنچ گیا۔ اسی لمحہ میں بھی وہاں پہنچ چکا تھا۔

مجھے دیکھ کر اس نے ایک دفعہ پھر پوچھا کہ کیا یہی ایس-ڈی-ایم صاحب کی کوٹھی ہے

میں نے کہا جی ہاں

تم کہاں رہتے ہو؟

میں نے کہا میں بھی یہیں رہتا ہوں۔ میرا باپ یہاں ملازم ہے

کیا نام ہے تمہارے والد صاحب کا؟

دل محمد

چوہدری۔ میاں۔ ملک؟

کیا کہتے ہیں لوگ آپ کے والد کو

بس جی دل محمد ہی کہتے ہیں۔ وہ چپڑاسی ہیں یہاں پر' ہمارے گاؤں میں تو سب انہیں چوہدری کہتے تھے۔

بھئی چپڑاسی بہت بڑا افسر ہوتا ہے۔ بلاؤ چوہدری دل محمد صاحب کو میں یہاں کا نیا ایس-ڈی-ایم ہوں۔ وہ نہ ہوں تو کسی اور کو بلا لاؤ

Marfat.com

میرا ایس۔ ڈی۔ ایم کا لفظ سننا تھا کہ میرے تو ہوش گم ہو گئے۔ یہاں تو ایس۔ ڈی۔ایم صاحب کا بڑا رعب اور دبدبہ ہوتا ہے۔ یہ عجیب شخص ہے۔ وہ مجھے اچھا بھی لگا اور عجب بھی

.....اور میں گھبرا کر بھاگ گیا۔ اباجی تو نہ ملے۔ مجھے سید اعجاز حسین شاہ مل گئے۔ شاہ صاحب بہت ہی عمدہ اور نفیس الطبع نیک پارسا انسان تھے۔ وہ ہمارے ساتھ والے کوارٹر میں رہتے تھے۔ وہ اور ان کی بیگم صاحبہ بہت ہی عمدہ انسان تھے۔ ہم سے وہ بہت ہی پیار کرتے اور ان کی بیگم صاحبہ ان سے بھی بڑھ کر۔ اس خاندان کا میں تفصیل سے بعد میں ذکر کروں گا۔

میں نے شاہ صاحب کو جب بتایا کہ نئے ایس۔ڈی۔ایم صاحب کوٹھی پہنچ چکے ہیں تو پہلے تو انہیں یقین ہی نہ آیا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ نیا ایس۔ڈی۔ایم آئے اور پہلے سے دھوم نہ مچے۔ جب میں نے دوبارہ سہ بارہ کہا تو شاہ صاحب ذرا نروس ہو گئے اور کوٹھی کی طرف بھاگ پڑے اور مجھے بھی پیچھے پیچھے آنے کو کہا۔

یہ نئے ایس۔ڈی۔ایم صاحب تھے میاں محمد شفیع صاحب۔اک مرد عظیم۔اک مرد شفیق اقبال کے مرد مومن' رقیق القلب عاشق رسول۔انسانیت کا معراج

اک خوبصورت انسان

اک خوبصورت مسلمان

پاک و پارسا۔ بندہ خدا۔ مجسمہ انسانیت

دلوں کو بھانے والا

دلوں کو موہنے والا

موہنی صورت والا

نیک سیرت والا

لاکھوں میں ایک

ملے نہ گر ڈھونڈو چراغ لیکر

کہیں مسیحا تھا

دکھی دلوں کا مسیحا

Marfat.com

مونس و ہمدرد
لاکھوں میں ایک
غریبوں کی ڈھارس
بے کسوں کا سہارا انسان تھا
ہزاروں میں ایک
نہیں لاکھوں کروڑوں میں ایک
چلا گیا جب
تو بہتوں کو چھوڑ گیا بے سہارا
سب تجھے یاد کرتے ہیں آج بھی
او میاں محمد شفیع!
محبت تیرا کام
محبت تیرا نام
رحمدلی کی تو مثال تھا
انسانیت کی رحمتیں تم پر تمام
رحمتیں تم پر خدا کی ہوں تمام
اللہ کے حبیب کے سائے میں رہے تو ہمیشہ
خدا تیرا تیرے ساتھ رہے ہمیشہ
سردار فقیر کی یہی دعا ہے ہمیشہ
تو سراپا الفت تھا
اس کی الفت میں رہے تو ہمیشہ

چونکہ میاں محمد شفیع صاحب کا میری زندگی اور کیریر پر بہت زیادہ گہرا اثر ہے اس لئے ان کے متعلق ذرا بعد میں اور تفصیل سے لکھوں گا۔ فی الحال ان کے اور ان سے متعلق ایک دو واقعات لکھنا چاہتا ہوں۔

ایک دن صبح صبح میں اپنا سبق یاد کرنے کے لئے ایس۔ڈی۔ایم صاحب کی کوٹھی کے ساتھ والے میدان میں گھوم رہا تھا اور آنکھیں بند کر کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق

Marfat.com

اپنے استاد کا لکھوایا ہوا مضمون زبانی یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ ایس۔ڈی۔ایم۔صاحب بڑے غور سے میرا سبق سن رہے ہیں۔ میں ٹھٹھر سا گیا اور ذرا سہم بھی گیا۔

کہتے ہیں کہ یہ سبق تم کہاں سے یاد کر رہے ہو؟

میں نے کہا اپنی کاپی پر سے

دکھاؤ کاپی

میں نے کاپی پیش کر دی

اور وہ نہایت غور سے پڑھتے رہے

اور پھر نہایت ہی مشفقانہ انداز میں فرمانے لگے "بیٹا تم تو بہت خوشخط ہو۔ بس ایک غلطی ہے۔ استاد نے درست لکھوایا تھا۔ تم نے اپنے ہاتھ سے پھر اس لفظ کو غلط لکھ دیا"

وہ لفظ تھا بطن۔ ہمارے استاد نے بلیک بورڈ پر لکھا تھا کہ حضرت سارہ کے بطن سے حضرت اسمٰعیل پیدا ہوئے۔ مجھے بطن کے معنی ہی معلوم نہ تھے۔ میں نے سمجھا استاد سے غلطی ہو گئی ہے اور میں نے اسے اپنے قلم سے بدن کر دیا اور میاں صاحب نے نہایت ہی خوشخط تحریر میں اسے اپنے ہاتھ سے دوبارہ بطن کر دیا۔

مجھے بعد میں پتہ چلا کہ میاں محمد شفیع بڑے اعلیٰ پائے کے شاعر و ادیب ہی نہیں باقاعدہ خطاط بھی تھے اور مزے کی بات ہے کہ وہ میری خوشخطی کی تعریف کر رہے تھے۔

اس دن کے بعد وہ مجھے ہر روز پڑھاتے۔ میرا سبق سنتے۔ قدرتی بات ہے انہیں ہر مضمون میں بہت دسترس حاصل تھی مگر تاریخ سے انہیں بہت دلچسپی تھی اور تاریخی واقعات یوں سناتے جیسے کوئی جاسوسی ناول کی کہانی ہو اور یوں مجھے تاریخ کے مضمون سے لگاؤ ہو گیا۔

دوسرا واقعہ گرمیوں کی چھٹیوں میں ان کے بیوی بچوں کی ٹوبہ میں آمد تھی۔ اس وقت ان کے ہاں دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ ان کی بڑی بیٹی کا نام بلقیس تھا۔ اس کے بعد ان کا بیٹا احمد تھا۔ پھر بیٹی آمنہ اور پھر عباس جن کی عمر اس وقت چھ ماہ سے زیادہ نہ تھی۔ ان کی بیٹی نجمہ اور سب سے چھوٹا بیٹا ہمایوں اس کے بعد پیدا ہوئے۔

میاں صاحب کی بیگم صاحبہ نہایت ہی نیک اور خلیق خاتون تھیں۔ مولوی عبدالعزیز چیف جسٹس فرید کوٹ کی صاحبزادی۔ پانچ وقت کی نمازی اور بہت ہی رحمدل اور مخیر تھیں۔

Marfat.com

چودھری دل محمد (والد)

Marfat.com

رضیہ بی بی (والدہ)

Marfat.com

میاں محمد شفیع (م ش)

Marfat.com

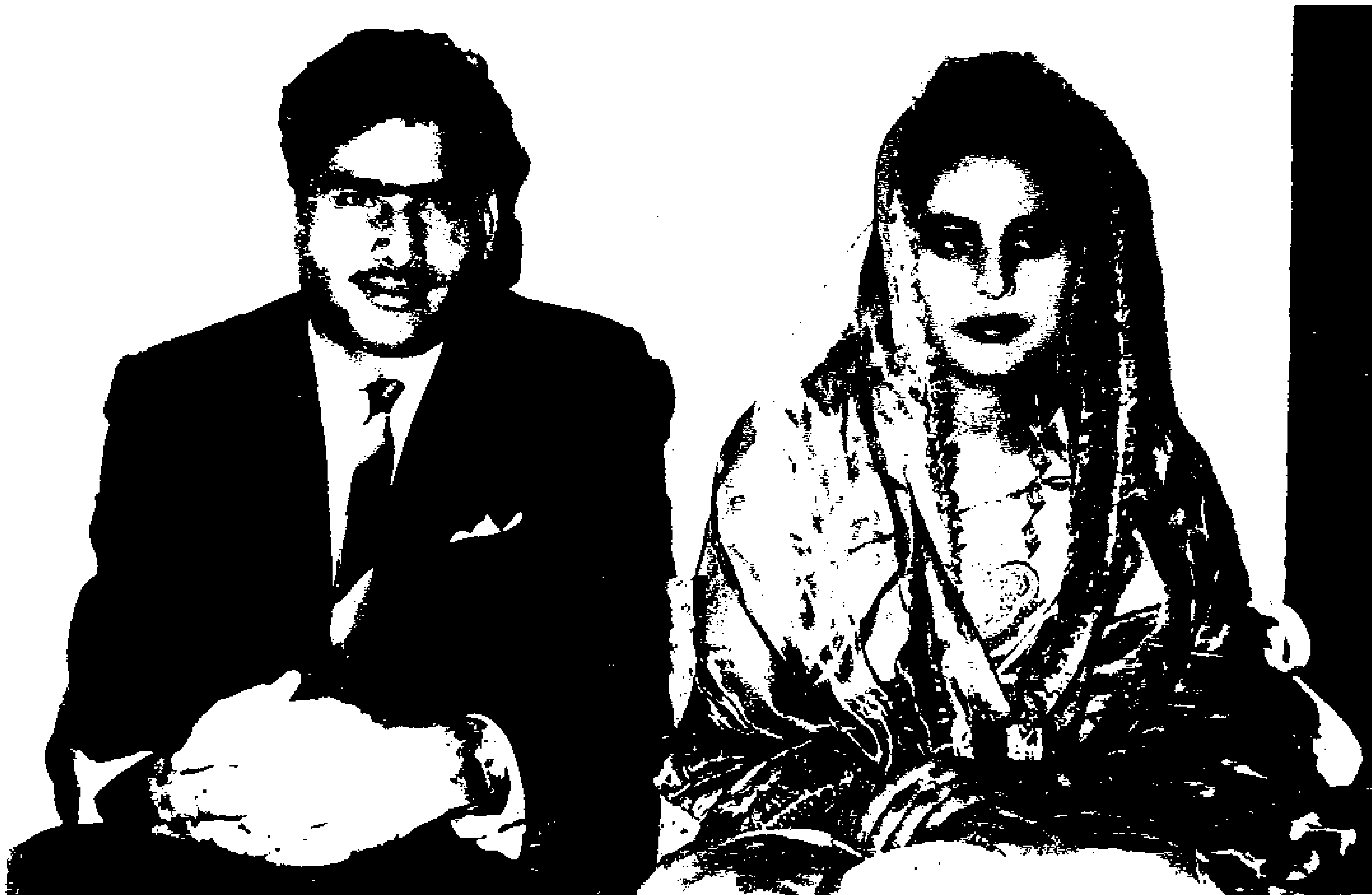

انیس اور مصنف 1965

Marfat.com

انجم (بیٹی)، ہارون (بیٹا)، سائرہ (بیٹی)۔ 1965ء

Marfat.com

مصنف، عرفان، ہارون اور بلقیس 1971

Marfat.com

بلقیس بیگم 1978ء

Marfat.com

ڈاکٹر امجد (داماد) اور انجم (بیٹی) 1985ء

Marfat.com

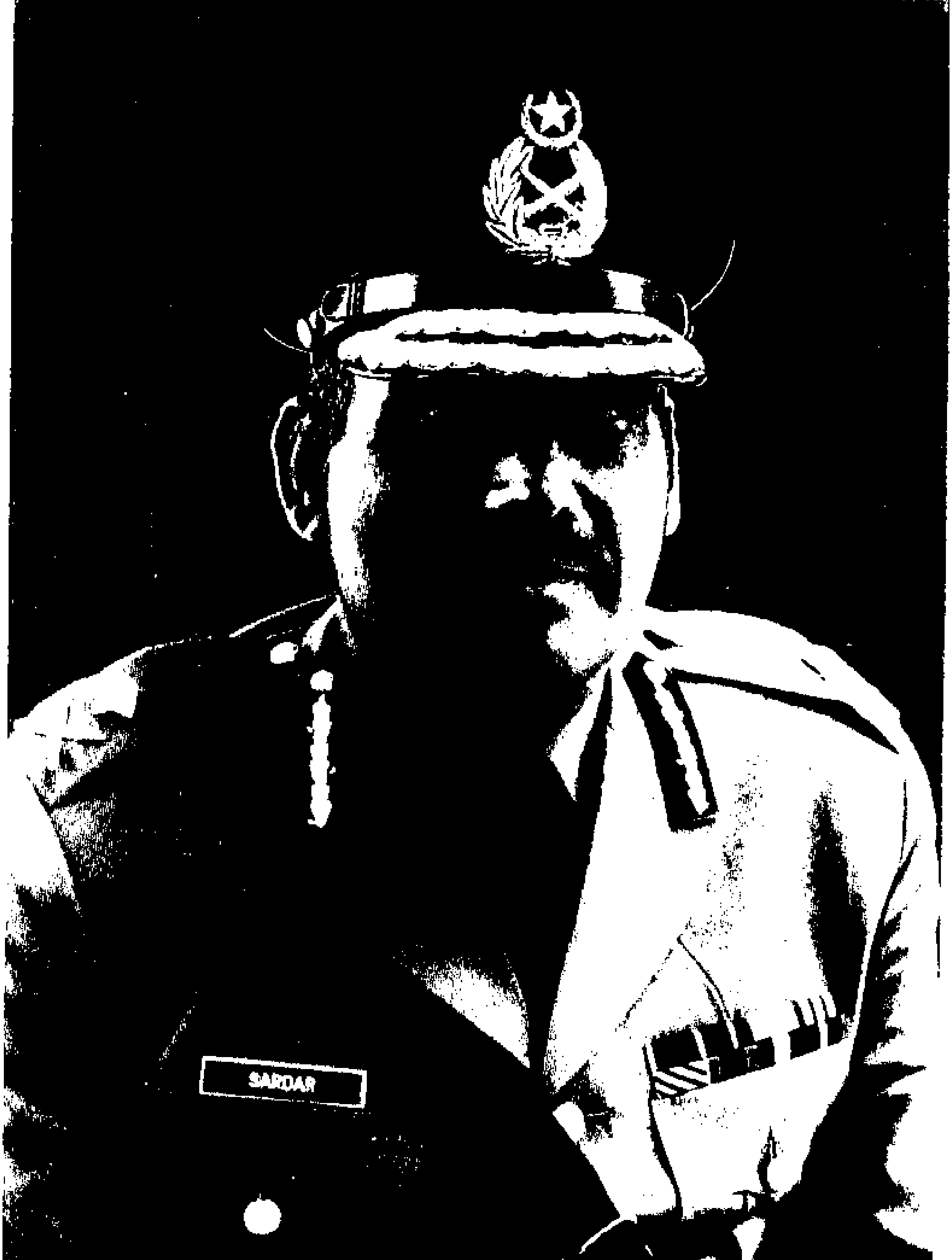

مصنف۔آئی جی پولیس پنجاب 1992ء

Marfat.com

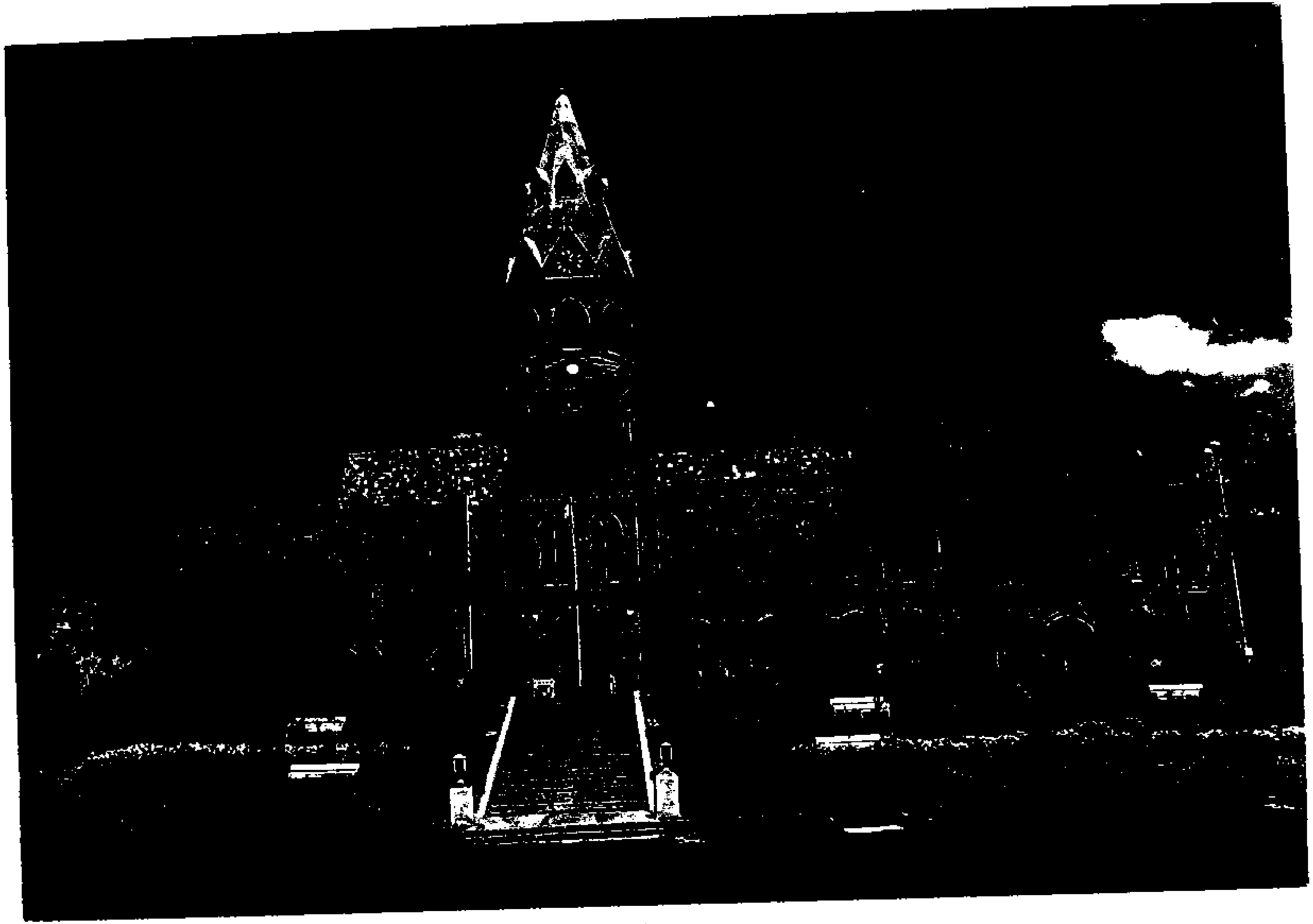

گورنمنٹ کالج، لاہور۔

Marfat.com

چودھری غلام سرور (پھوپھی زاد بھائی)

ناصر شمسی (قریبی دوست)

Marfat.com

مصنف، عرفان، صائمہ، ہارون اور بلقیس۔ 1992ء بلقیس کی ناگہانی موت سے چند دن پہلے

Marfat.com

شار مین (بہو)، سردار محمد اسفندیار (پوتا)، علیزہ (پوتی)، ہارون عزیز (بیٹا)

Marfat.com

صائمہ ، عبداللہ ، امن ، ایمان ، نوید کریم ۔ (داماد ، بیٹی ، نواسے اور نواسیاں)

Marfat.com

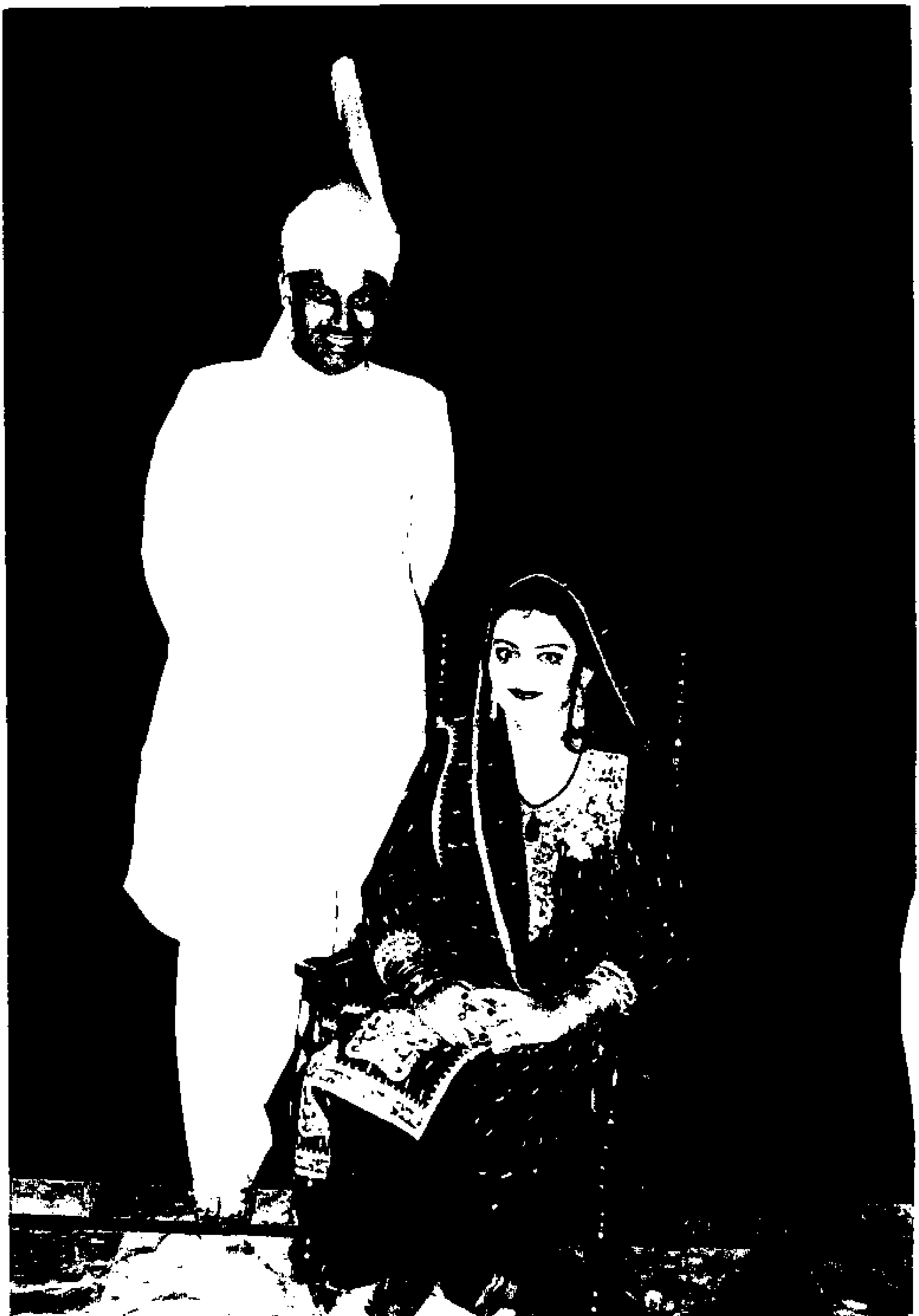

راضی (رادھی) بہو اور عرفان عزیز (بیٹا) 12۔ فروری 1999ء

Marfat.com

اشہد، صدف، ڈاکٹر شائستہ اور ڈاکٹر پی۔ ایم۔ طور (امریکہ)

Marfat.com

ان کے آتے ہی ایس-ڈی-ایم صاحب کی کوٹھی بس گئی بلکہ بھر گئی۔ طرح طرح کے کھانے پکنے لگے اور بچے ادھر ادھر اچھلنے کودنے لگ گئے۔ ہر طرف رونق ہی رونق تھی۔ ایس-ڈی-ایم صاحب کے بچے میرے اور میری بہن کے ساتھ کھیلتے اور ہم لوگ خوب اودھم مچاتے۔

میں نے جب بلقیس کو پہلی دفعہ دیکھا تو اس کی معصوم خوبصورتی کو دیکھ کر دم بخود ہو کر رہ گیا۔ وہ اس وقت چوتھی جماعت کی طالبہ تھی۔ ایس-ڈی-ایم صاحب کی بیٹی تھی اور کہیں لاہور میں پڑھتی تھی۔ میرے لئے وہ اسی طرح سے تھی جیسے کوئی پری کوہ قاف سے اتر آئے۔ میں دیکھتا تو حیران رہ جاتا اور بنانے والے کی قدرت کی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ میں اس وقت چھٹی جماعت کا طالب علم تھا اور میرے دو سال کیمپوں میں بھی ضائع ہو چلے تھے۔ لہٰذا میں بلقیس سے عمر میں شاید چار پانچ سال بڑا تھا مگر تھا بالکل بچہ۔ کوئی محبت وغیرہ والی بات نہیں تھی۔ محض حسن و جمال کی کرشمہ سازی کا سحر ضرور اثر انداز ہو رہا تھا۔

احمد شاید دوسری یا تیسری جماعت کا طالب علم تھا اور نہایت ہی حسین و جمیل لگتا تھا جیسے کوئی شہزادہ ہو۔ آمنہ کو سب لوگ منی منی کہتے تھے اور ہم نے اس کا نام نمی رکھ دیا کیونکہ اس وقت بھارت کی ایک ایکٹریس نمی کا بہت شہرہ تھا۔ بلقیس کو سب لوگ بقی کہہ کر پکارتے تھے۔

ہوا یہ کہ میں ان کا استاد بن گیا اور ان سب کو چھٹیوں کا کام کروایا کرتا تھا۔ ساتھ ساتھ ہم کھیلتے اور ساتھ ہم پڑھتے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ اپنی کلاس کے کام میں یکدم بہت اچھے ہو گئے اور سب لوگ مجھ سے بے حد خوش رہتے خاص طور پر میاں صاحب اور ان کی نیک سیرت بیگم۔ میں ایس-ڈی-ایم صاحب کے بچوں کے ساتھ بیٹھ کر عمدہ عمدہ کھانے کھاتا اور انہیں خوب کہانیاں سناتا۔ ان کے ماں باپ بھی مجھ سے اور میری بہن سے بہت پیار کرتے۔ نیکی باغ میں پکنک کے لئے جاتے تو ہمیں ساتھ لے جاتے اور ہر کھانے والی چیز اپنے بچوں سے پہلے ہمیں دیتے جو ادا ہمیں بہت ہی پسند آئی۔ یہ اصل میں ان کا خاندانی حسن اخلاق اور تربیت تھی جس کا مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا۔ اس میں کوئی بناوٹ یا تصنع قطعاً نہ تھا۔ میاں شفیع مولوی چراغ دین ایڈووکیٹ کے بیٹے تھے اور ان کی بیگم صاحبہ بھی مولوی عبدالعزیز صاحب کی بیٹی تھیں اور اس خاندان کی دینی خدمات و تعلیمات کی بہت پرانی تاریخ تھی بلکہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے مجاہدین میں سے تھے۔ اس لئے وہ دوسرے عام افسروں سے ذرا مختلف تھے ہمیں تو معلوم نہ تھا مگر بھاتے بہت تھے۔

Marfat.com

ایک دن بلقیس اور احمد نے اصرار کیا کہ وہ بیڈ منٹن کھیلنا چاہتے ہیں۔ اب میرے فرشتوں کو بھی بیڈ منٹن قسم کی چیز کا پتا نہ تھا کہ یہ کیا بلا ہے۔ میں تو کبڈی فٹ بال ہی سے واقف تھا۔ انہیں پتہ چل گیا کہ مجھے اس کھیل کا کچھ پتہ نہیں ہے۔ پہلے تو انہوں نے میرا خوب مذاق اڑایا اور پھر بتایا کہ کس طرح اسے کھیلا جاتا ہے اور اسے عرف عام میں چڑی کھیلنا کہتے ہیں اور میں نے چڑی کھیلنا سیکھ لی۔ اور ایسی سیکھی کہ ایک ہفتے کے اندر اندر میں ان دونوں سے زیادہ اچھا کھلاڑی بن گیا۔

اور پھر گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہو گئیں۔ بیگم شفیع اور ان کے بچوں کے روانگی پر ہم بہت اداس ہوئے بلکہ میں اور میری بڑی بہن انہیں یاد کر کر کے کئی دن تک روتے رہے۔

مجھے پہلی ہی نظر میں بلقیس بہت اچھی لگی تھی اور کہیں دل میں بس گئی تھی مگر میں اس وقت سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کبھی وہ میری رفیقہ حیات بن کر میرے روح و قلب کی مالک بن جائے گی اور پھر ایسے ہی ہوا۔

کیسے ہوا؟ بس اللہ ہی جانتا ہے یہ اس کی رضا تھی۔ مجھے تو نکاح سے چند دن قبل تک اس بات کا خواب و خیال بھی نہ تھا۔ یہ ایک لمبی اور عجیب کہانی ہے۔ وہ ذرا بعد میں۔ اس وقت صرف اتنا بتاتا چلوں کہ بلقیس کی رفاقت نے میری کایا ہی پلٹ دی۔ اب اسے رخصت ہوئے چھ سال ہو چکے ہیں مگر مجھے ایک پل چین نہیں آیا۔ ہر لمحہ اس کے بغیر میرے لئے قیامت ہے۔ اتنی پیاری اولاد دے گئی مگر جب جانے لگی تو یکدم اسی طرح چلی گئی جیسے وہ میری زندگی میں داخل ہی نہ ہوئی تھی۔ چند گھنٹوں کی معمولی سی بیماری اور پھر ہمیشہ کا فراق۔

اللہ تو بلقیس اور اس کے والدین کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنا قرب بخش دے
اس فقیر بے نوا کی بس اتنی ہی دعا ہے۔ تیرا کرم ہمیشہ میرے ساتھ
رہا ہے کہ بات بن گئی اور بنی رہی ورنہ میں کیا تھا۔ خدایا اب
بھی بنائے رکھنا۔ بلقیس کی اولاد پر اپنا سایہ عاطفت رکھنا۔ آمین

Marfat.com

روشنی کا سفر

آٹھویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے میری ایک اچھے اور ہونہار طالب علم ہونے کی شہرت کافی پھیل چکی تھی راجہ محمد رفیق اور بشیر عرشی کے ساتھ میرا مستقل مقابلہ رہتا لیکن میں ہمیشہ ہر مضمون میں جیت جاتا۔ میں خوش قسمت تھا کہ ہمیں بہترین اور محنتی استاد ملے تھے۔ اس وقت پرائیویٹ ٹیوشن کا کوئی رواج نہ تھا۔ پورے شہر میں استادوں کی بے انتہا عزت تھی۔ ہر شخص انہیں اٹھ کر ملتا اور جھک کر سلام کرتا تھا۔ ہر استاد کی کوشش ہوتی کہ وہ بہترین شاگرد تیار کرے اور اس کا نتیجہ سب سے اعلیٰ ہو۔ سکول انسپکٹر صاحبان ہر سال سکول کا تفصیلی معائنہ کرتے اور تمام استاد اپنی اپنی کلاس اور شاگردوں کو اس انسپکشن کے لئے دن رات محنت کر کے تیاری کرواتے۔ بہترین کارکردگی ان کا سب سے بڑا فخر ہوتا تھا۔

آٹھویں جماعت میں اس وقت ایک امتحان ہوتا تھا جس کا نام تھا اینگلو ورنکولر فائنل امتحان اور وہ پورے پنجاب کی سطح کا امتحان ہوتا تھا جس میں بہترین نمبر لینے والے طلباء کو وظائف ملتے تھے۔ ہمارے سکول سے مجھے' راجہ رفیق' بشیر عرشی' رشید اور ضیاء کو اس امتحان کے لئے منتخب کیا گیا۔ شیخ غلام قادر ہمارے انگریزی کے استاد تھے۔ وہ ہمیں چھٹی کے بعد کافی دیر تک اس امتحان کی تیاری کے لئے پڑھاتے رہتے۔ لاہور اردو بازار سے بہت اچھی اچھی کتابیں اپنے خرچے پر ہمارے لئے منگواتے اور پڑھاتے۔ اتوار یا دوسری کسی چھٹی کے دن ہمیں اپنے گھر پر

Marfat.com

پڑھاتے۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا اور کرسمس ہالیڈیز پر بھی اور اس کا وہ کوئی معاوضہ نہیں لیتے تھے۔ معاوضہ ہم دینے کی حیثیت ہی میں نہ تھے۔ بلکہ زیادہ وقت گزر جائے تو وہ اپنے گھر سے ہمیں کھانا بھی کھلاتے۔ وہ کبھی بھی کسی بھی صورت چھٹی نہیں کرتے تھے۔ پاگل پن کی حد تک محنتی انسان تھے۔ انہیں صرف ایک ہی شوق تھا کہ ان کے شاگرد بہترین طالب علم بنیں اور یہی ان کا پرائیڈ تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ کبھی تو چھٹی ہو جیسے کہ بچوں کی ایک فطری عادت ہوتی ہے مگر چھٹی کہاں لمحہ بھر کے لئے بھی فارغ نہ چھوڑتے

ایک دن ہم ان کے گھر پڑھنے کے لئے صبح صبح پہنچے تو معلوم ہوا کہ ماسٹر صاحب گھر پر موجود نہ ہیں۔ رات کو ان کی جوان بیٹی جو تپ دق کی مریضہ تھی کا انتقال ہو گیا ہے اور وہ اسے دفنانے گئے ہیں۔ قبرستان ساتھ ہی تھا۔ ہم نے سوچا ہم بھی قبرستان چلتے ہیں لیکن دیکھا تو ماسٹر جی کچھ اور لوگوں کے ساتھ واپس آرہے ہیں اور ہم دبک کر بیٹھ گئے اور منہ رونا سا کر لیا۔ ہم نے سوچا آج تو ضرور چھٹی مل جائے گی۔ مگر چھٹی نہ ملنا تھی اور نہ ملی۔ ماسٹر صاحب نے آتے ہی پڑھانا شروع کر دیا۔ ہمیں افسوس بھی نہ کرنے دیا۔ لوگ افسوس کے لئے آتے' ہاتھ اٹھاتے دعا ہوتی اور ان کے رخصت ہوتے ہی دوبارہ حسب دستور پڑھائی شروع ہو جاتی۔ ان کے ایک رشتہ دار شیخ انوار الحق افسوس کے لئے آئے تو دیکھا کہ ماسٹر جی خوب انہماک سے پڑھا رہے ہیں وہ بہت حیران ہوئے۔ کہنے لگے

غلام قادر آج تو چھٹی کر لیتے

کیوں؟

کہ تمہاری بیٹی فوت ہوئی ہے

اسی کے لئے تو میں انہیں پڑھا رہا ہوں۔ اس پڑھانے کا جو ثواب ہو گا سب اس کو بخش دوں گا اور پھر رو پڑے

اور ہم سب بھی رو پڑے

یہ تھی ان استادوں کی اپنے فرض سے لگن کہ ہم ایسے بے ڈھنگے اور علم سے لاتعلق انسان بھی زیور تعلیم سے آراستہ ہو سکے۔

امتحان ہوا۔ ہم سب بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوئے اور میں پورے ضلع لائلپور میں اول رہا بلکہ پورے پنجاب میں میری بہت ہی امتیازی پوزیشن تھی کہ مجھے خاص طور

Marfat.com

پر لارنس کالج گھوڑا گلی میں مزید تعلیم کے لئے اس وقت (۱۹۵۳ء) پچھتر =/۷۵ روپے ماہوار کا وظیفہ ملا۔

میرے سکول بلکہ پورے شہر میں اس کامیابی پر زبردست خوشی منائی گئی۔ مجھے بتایا گیا کہ اس سکول کو ہائی سکول بنے اس وقت ۲۶ سال گزرے تھے اور ۲۶ سال میں' میں نے سب سے زیادہ نمبر حاصل کئے تھے۔ فطری امر ہے کہ میں بہت خوش ہوا۔ شیخ سردار محمد نے مجھے کہا اب بیٹا تمہیں انگیٹھی بھکانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس تم پڑھا کرو اور سارا خرچہ میرے ذمہ ہے۔ میں نے کہا کہ میری فیس معاف ہے اور اب مجھے وظیفہ بھی ملا کرے گا اس لئے پیسوں کی ضرورت نہ ہے۔ گزارہ چل جائے گا۔ نوکری تو میری مجبوری تھی شوق قطعاً نہیں تھا۔ یوں میں اس کام سے بھی فارغ ہو گیا اور کلی طور پر علم کے حصول میں جت گیا۔ سکول میں کوئی لائبریری نہ تھی۔ میں اخبار میونسپلٹی جاکر پڑھتا تھا اور کچھ کتابیں جماعت اسلامی ٹوبہ ٹیک سنگھ کے امیر مفتی انصاف سے لیکر پڑھتا تھا جو تمام کی تمام جماعت اسلامی کی اشاعت شدہ تھیں۔ قرآن مجید میں نے اپنی والدہ ہی سے پڑھا تھا اور مزید مقامی مسجد میں بھی مولوی صاحب سے عربی کی تعلیم حاصل کرتا رہا۔ ویسے سکول میں بھی ماسٹر عبد الصمد ہمیں عربی پڑھاتے تھے۔ مجھے بہت افسوس رہا کہ میں کبھی فارسی نہ پڑھ سکا۔

اینگلو ورنیکولر فائنل ایگزامینشن کے اتنے اچھے نتیجہ کے بعد ہمارے سکول میں ایک زبردست جلسہ منعقد ہوا جسے یوم والدین کے نام سے موسوم کیا گیا۔ تمام شہر کے معززین اس میں مدعو تھے اور مجھے اس میں تقریر کرنا تھی۔ مقامی تحصیلدار صاحب نے صدارت فرمائی تھی۔

شیخ غلام قادر نے ہم چار لڑکوں کو تقریر کے لئے تیار کیا اور جو تقریر مجھے لکھ کر دی وہ پندرہ صفحوں پر محیط تھی۔ حکم ہوا کہ ایک ہفتہ کے اندر اندر زبانی یاد کرنا ہے اور اس کا بہترین طریقہ ہے کہ باہر کھیتوں کھلیانوں میں نکل جاؤ اور درختوں فصلوں کو سامعین سمجھ کر خوب زور زور سے تقریر کرو۔ یاد ہو جائیگی اور جلسہ میں ذرا دقت نہ ہوگی۔ یہ میری زندگی کی پہلی تقریر تھی اور میں بے حد نروس تھا..... جیسا ماسٹر صاحب نے کہا میں نے ویسا ہی کیا۔ چھٹی کے بعد میں کھیتوں کی طرف نکل گیا اور زور زور سے تقریر کرتا رہا۔ اگلے دن صبح پھر میں نے یہی کام شروع کر دیا۔ اس دن اتوار تھا۔ میں سارا دن یہی کام کرتا رہا۔ میری یادداشت اچھی تھی اور میں نے سبق یاد کرنے کے بہت سے اپنے ہی طریقے نکالے ہوئے تھے۔ کیونکہ میں بہت غریب

Marfat.com

غریب تھا۔ کاپیاں مہنگی تھیں کم از کم میرے لئے مہنگی تھیں لہٰذا میں اکثر مضامین اور ریاضی کے سوال ذہنی نشانیاں رکھ رکھ کر زبانی یاد کر لیتا تھا۔ میری یاد داشت کی نشانیاں چند الفاظ پیراگراف' حروف و ہندسہ ہوتے تھے۔ یہ مشق بعد کی زندگی میں بھی مجھے بہت کام آئی۔ اور میں نے دفتری زندگی میں زیادہ سٹیشنری کبھی ضائع نہیں کی۔ شاذ ہی میں نوٹس بناتا تھا۔ سب کام اپنے ذہن سے کرتا رہتا تھا۔

مشہور ڈرامہ نویس اشفاق احمد خان اکثر ایک مستری کی بات سنایا کرتے ہیں کہ ان کے پوچھنے پر کہ اتنے اتنے پیچیدہ اور نازک کام آپ لوگ بغیر کسی نقشہ کے کیسے کر لیتے ہیں تو مستری نے کہا کہ بابا جی ہم کوئی پڑھے لکھے لوگ تو ہیں نہیں کہ لکیر کے فقیر ہوں۔ ہم تو اپنے دماغ سے کام لیتے ہیں اور سب کچھ بنا لیتے ہیں۔ وہ جب بھی یہ قصہ سناتے ہیں تو میں ہمیشہ مسکرا دیتا ہوں۔ انہیں کیا معلوم کہ میں بھی کبھی دماغ ہی سے کام لیا کرتا تھا۔ یہ سب میری غربت کا کرم تھا۔

ہوا یوں کہ جب اگلے دن یعنی سوموار کو دوبارہ سکول کھلا تو شیخ غلام قادر نے مجھے تقریر کے دو پہلے صفحے سنانے کو کہا اور میں نے پندرہ کے پندرہ صفحے سنا دیئے۔ وہ حیران پریشان میرے منہ کی طرف دیکھتے رہے پہلے تو انہیں یقین ہی نہ ہوا۔ انہوں نے دوبارہ سہ بارہ سنا۔ پھر میرے ہاتھ اور بازو وغیرہ کی اچھی طرح تلاشی لی..... سکول کی دیواروں کو دیکھا اور جب انہیں یقین ہو گیا کہ میں نے واقعی ساری تقریر زبانی یاد کر لی ہے تو بہت زیادہ خوش ہوئے اور کہنے لگے تم تو کوئی Genius ہو۔ اب مجھے جینئس کے معنی نہیں آتے تھے۔ بعد میں میں نے راجہ رفیق سے پوچھا کہ اس کے معنی کیا ہیں تو اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا "شیطان" اور میرا منہ لٹک گیا۔ میں نے سمجھا کہ شاید ماسٹر جی ناراض ہو گئے ہیں حالانکہ راجہ رفیق صرف میری ٹانگ کھینچ رہا تھا مگر اپنی بات کو مزید پکا کرنے کے لئے کہنے لگا ماسٹر جی ٹھیک ہی تو کہتے ہیں کوئی انسان ۱۵ صفحے ایک دن میں کیسے یاد کر سکتا ہے۔ یہ تو شیطانی صفتیں ہو سکتی ہے۔ مجھے بہت بعد میں پتہ چلا کہ Genius کے معنی کیا ہوتے ہیں۔ میں کچھ پریشان بھی رہا مگر مجھے اس بات کا یہ فائدہ ہوا کہ ماسٹر غلام قادر نے مجھے اس کے بعد کبھی نہ مارا۔ ماسٹر صاحب کی عادت تھی کہ وجہ بلاوجہ اور وقت بے وقت مارتے بہت تھے اور ہمیں ان سے بہت ڈر لگتا تھا مگر میری یاد داشت نے میری مدد کر دی۔

Marfat.com

جلسہ کے وقت تک مجھے اپنی تقریر مکمل طور پر حفظ ہو چکی تھی۔ ماسٹر جی نے تقریر کے زیر و بم بھی خوب سکھا دیئے تھے۔ میری آواز ویسے ہی ذرا بھاری اور گرجدار تھی۔ بس آخری بات انہوں نے یہ کہی کہ جب تم تقریر کرنے لگو تو سمجھنا کہ تمہارے سامنے سب الو کے پٹھے بیٹھے ہیں۔ تحصیلدار سے ڈرنا اور نہ ہیڈ ماسٹر صاحب سے اور اپنی تقریر جاری رکھنا۔ ٹھہر ٹھہر کر اور مناسب طور پر رک رک کر جیسے تمہیں سکھایا گیا ہے۔

.....اور میں نے بھری مجلس میں ماسٹر جی کے بتائے ہوئے طریقے پر ایک دھواں دھار تقریر جھاڑ ڈالی۔ کسی کی پرواہ نہ کی۔

تقریر ختم ہوتے ہی صدر نشین تحصیلدار صاحب اپنی کرسی سے اٹھے اور میرا ماتھا چوم لیا اور مجھے ایک Orator یعنی خطیب کا خطاب دے دیا۔ سب لوگوں نے زبردست تالیاں بجائیں۔ مجھے یہ سب کچھ دیکھ کر یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ میرے لئے ہو رہا ہے۔ میں خوش بھی ہوا اور جذباتی بھی اور جب میں اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھا تو کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ میرے آنسو جاری ہیں۔ میرے آنسو غیر شعوری طور پر نکل گئے تھے جس کا بعد میں میرے دوستوں نے خوب مذاق بنایا۔ اس دن کے بعد مجھے تقریر کا تمام حجاب جاتا رہا اور بعد کی زندگی میں مجھے اس معاملہ میں کبھی دشواری نہ ہوئی۔ یہ سب شیخ غلام قادر کی راہنمائی اور بے لوث مدد کا نتیجہ تھا۔ خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ میری انگریزی بھی ان ہی کی وجہ سے اچھی ہو گئی تھی۔ ایسے استاد قسمت ہی سے ملتے ہیں اور میں بہت زیادہ خوش قسمت تھا۔

اس تقریر کی وجہ سے مجھے ایک اور بزرگ ہستی کی شفقت ملی اور وہ تھے مرحوم شیخ محمد یوسف صاحب' ہمارے شہر کے رئیس اعظم اور سب سے معروف تاجر۔ وہ بہت ہی سمجھدار اور دانا انسان تھے۔ ذاتی زندگی میں نہایت سادہ اور کفایت شعار مگر کار خیر میں سب سے آگے اور خاموش خاموش۔ انہیں شوق تھا بلکہ ان کی زندگی کا مشن تھا کہ وہ ہونہار غریب طلبا کی نہایت خاموشی سے مدد کرتے کہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں۔ اور اس بات کا سوائے ان لوگوں کے جو اس کے Beneficiary ہوتے تھے کسی اور کو علم تو کیا کانوں کان خبر نہ ہوتی تھی۔ کہیں دل میں شیخ صاحب نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اس تقریر کرنے والے طالب علم نے اگر اپنی تعلیم ایسی ڈگر

Marfat.com

پر جاری رکھی تو اس کی بہترین اعلیٰ تعلیم کے لئے ملک کے بہترین تعلیمی ادارے میں اس کا اہتمام کریں گے۔

اور جب میں نے پھر ۱۹۵۵ء کے میٹرک کے امتحان میں ضلع بھر میں فرسٹ پوزیشن حاصل کی تو وہ خاموشی سے ہمارے گھر آئے اور مجھے سیر کے لئے ساتھ لے گئے اور مجھ سے آئندہ کا پروگرام پوچھتے رہے۔ میرے فرشتوں کو معلوم نہ تھا کہ ان کے دل میں کیا ہے۔ قصہ کوتاہ فرمانے لگے کبھی تم نے کالج میں تعلیم حاصل کرنے کا سوچا ہے

ہاں! میں نے کہا

مگر میں کس طرح پڑھ سکتا ہوں۔ مجھے جو وظیفہ ملے گا وہ کافی نہیں۔ کاپیاں کتابیں علیحدہ خرچہ مانگیں گی۔ میرے پاس تو مناسب کپڑے بھی نہ ہیں۔

کہتے ہیں تم بالکل فکر نہ کرو۔ یہ سب کچھ اللہ کے ذمہ ہے۔ تم گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لو۔ وہ سب سے بہترین کالج ہے۔ میں تو کالج میں پڑھ نہیں سکا۔ تم وہاں پڑھ لو تو میں سمجھوں گا کہ میں نے خود وہاں پڑھ لیا۔ جتنی رقم درکار ہو وہ پتہ کر کے مجھے ایک دو دن میں بتادو وہ تم مجھ سے آکر لے لینا اور جو ماہوار خرچہ ہو گا وہ تمہیں ہر ماہ بذریعہ منی آرڈر مل جایا کرے گا۔ تم نے مجھے صرف یہ بتانا ہے کہ ہر ماہ کتنا درکار ہے۔ خواہ مخواہ چٹھی بھی نہ لکھنا۔ لوگوں کو پتہ چل جاتا ہے۔ بس میری ایک شرط ہے کہ کسی سے اس بات کا کبھی ذکر نہ کرنا اور کبھی بھی یہ نہ سمجھنا کہ میں غریب ہوں۔ اچھی طرح سے رہنا اور اچھی طرح سے پڑھنا۔ زندگی میں اپنی عزت نفس کا کبھی سودا بھی نہ کرنا۔ اللہ کی زمین بہت وسیع ہے۔ محنت کرنا اور کبھی فکر نہ کرنا

ہاں! اگر ہو سکے تو جب تم صاحب روزگار ہو جاؤ تو پھر ایک لڑکا اپنے ہی جیسا ڈھونڈھ لینا اور اسے پڑھا سکو تو پڑھا دینا۔ اس کے علاوہ میرا تم سے اور کوئی تقاضا نہ ہے تم جانو اور تمہارا خدا۔ میں تم سے کوئی حساب نہیں مانگوں گا۔

ہاں! گھر میں کسی کو نہ بتانا۔ اپنے ابا جی کو بھی بتانے کی ضرورت نہ ہے۔ کہہ دینا کہ مجھے اچھی پڑھائی پر حکومت کی طرف سے بہت وظیفہ ملتا ہے

اور میں ۱۹۵۵ء میں گورنمنٹ کالج لاہور کا ایک نہایت معتبر اور معزز ہونہار طالب علم تھا۔

Marfat.com

اب میں سوچتا ہوں کہ یہ کیسے لوگ تھے۔ کیا سے کیا ہو گیا۔ ایسے لوگ کیوں میرے معاشرہ سے چلے گئے۔ میں پڑھ کر ایک بہت بڑا افسر بن گیا۔ آئی۔ جی۔ پنجاب بن گیا مگر شیخ محمد یوسف صاحب نے مجھے کبھی کام نہ کہا۔ کبھی کوئی سفارش نہ کی۔ میری حسرت ہی رہی کہ وہ کوئی کام کہیں اور میری قسمت کھل جائے مگر اس اللہ کے بندے نے کبھی کوئی کام نہ کہا۔

ڈھونڈھو انہیں چراغ لے کر
یہ لوگ کہاں ملتے ہیں
ہزاروں میں
لاکھوں میں
کہیں نہیں ملتے
یہ سب اس کی قدرت تھی جس نے یہ سب جہان پال رکھا ہے
اور اس جہان نیرنگ میں
میرا حصہ کچھ زیادہ ہی رکھ دیا تھا
شکر ہے اس کا
اس کے نیک بندوں کا
جو اس کی بتائی راہ پر چلتے ہیں

شیخ محمد یوسف صاحب مدظلہ کا انتقال پچھلے سال ہوا ہے۔ بس بولتے بولتے اللہ کو پیارے ہو گئے اور بعد از موت ان کے چہرے کا نور دیدنی تھا۔ ہمارے ایک ساتھی عرفان محمود نے دیکھا تو پکار اٹھے

He looks like a Greek God in death

کیا سکون کی نیند سوئے نظر آ رہے تھے۔ چہرے پر مسکراہٹ تھی جیسے اللہ سے مل کر فرحت مار رہے ہیں شاید جنت ایسے ہی لوگوں کا مقسوم ہے۔ خدا کرے وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کے سائے میں رہیں۔

ان کے صاحبزادے طاہر یوسف صاحب اپنے عظیم والد کی روایات کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ ایک بہت ہی اعلیٰ معیار کا ٹرسٹ سکول نیاز بیگ ٹھوکر میں چلا رہے ہیں جہاں غریب اور

Marfat.com

ہونہار طالب علموں کی بالکل مفت تعلیم کا بندوبست ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے کام میں برکت ڈالے۔ میں بھی کچھ نہ کچھ طاہر صاحب کے ساتھ شریک ہوں مگر کم کم حالانکہ میرا فرض زیادہ بنتا ہے۔

میری اس تقریر کا ایک اور عجیب و غریب اثر ہوا۔ جب تحصیلدار صاحب کو پتہ چلا کہ میں ان کی تحصیل کے ایک چپڑاسی کا بیٹا ہوں تو وہ اور بھی خوش ہوئے اور اگلے دن ہمارے گھر تشریف لائے اور میرے والد صاحب کو اس بات پر راغب کرتے رہے کہ سردار کو ضرور ہی لارنس کالج گھوڑا گلی بھجوائیں۔ پاکستان کو ایسے ہونہار طالب علموں کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ پاکستان ایک نیا ملک ہے۔ اسے سائنسدانوں اور ڈاکٹروں کی ضرورت ہے۔ آپ اپنے بیٹے کو ضرور گھوڑا گلی بھجوا دیں۔ باتوں باتوں میں جب انہیں معلوم ہوا کہ ہمیں اپنی ہندوستان میں چھوڑی زرعی زمین کے بدلے کوئی زمین ابھی تک نہیں ملی تو انہوں نے اگلے ہی دن تمام تحصیل کے پٹواریوں کی ڈیوٹی لگا دی کہ ہمارے لئے فوراً متروکہ زمین ڈھونڈی جائے اور چند دنوں بعد ہی ہمیں ٹوبہ شہر سے بالکل ملحقہ گاؤں چک نمبر ۳۲۲ ج۔ب میں ایک قطعہ اراضی الاٹ ہو گیا۔ ہمارے والد صاحب تو مجبوراً نوکری کر رہے تھے۔ زمین ملتے ہی نوکری چھوڑی اور اپنا آبائی پیشہ کاشتکاری شروع کر دیا اور کوٹھیڑہ کے اجڑے کاشتکار آخر کار چک نمبر ۳۲۲ ج۔ب میں آباد ہو گئے..... اور پناہ گیری کا ایک لمبا دور ختم ہو گیا۔

ملک محمد اسلم تحصیلدار مرحوم و مغفور جنہوں نے میری قابلیت سے متاثر ہو کر ہمیں آباد کیا کے بڑے صاحبزادے میرے کلاس فیلو تھے اور ان کے دوسرے بیٹے حمید اسلم میرے پولیس میں رفیق کار بنے۔ آجکل پولیس کے ڈی۔ آئی۔ جی ہیں۔ مجھے امید ہے وہ آئی۔ جی بھی ضرور بنیں گے۔ باپ کی طرح بیٹا بھی بڑی ہی علمی دسترس رکھتا ہے اور ایک فہیم افسر ہے۔

ہم ۱۹۴۷ء میں عید کے فوراً بعد کوٹھیڑہ جسوالاں سے سکھوں کے حملوں کے خوف سے بھاگے تھے اور ۱۹۵۳ء یعنی پورے چھ سال بعد کہیں زمین پر پاؤں رکھ سکے جسے ہم اپنی زمین کہہ سکتے۔ ہم سب لوگ گاؤں چلے گئے اور وہاں پر حسب حیثیت کچے کوٹھے بنائے اور وہیں سے پھر مزید زندگی کے شگوفے نکلے۔ میری بہنوں کی شادیاں ہوئیں۔ میری تعلیم ہوئی شادی ہوئی اور زندگی کی مزید نشوونما شروع ہوئی اب میرا وطن چک نمبر ۳۲۲۔ج۔ب کی سرزمین کے حوالہ سے پاکستان ہے۔ لاہور تعلیم ملازمت یہ سب کچھ بعد کی باتیں ہیں۔

Marfat.com

جو کچھ بعد میں ہوا وہ کسی افسانہ یا عجوبہ سے کم تو نہیں ہے۔ اس کی تفصیل ذرا بعد میں مگر میں اس وقت بھی محسوس کرتا ہوں کہ میری جڑ میرے اس نئے گاؤں ہی میں ہے۔ کوٹھہڑہ میں گزرا بچپن بھولتا تو نہیں بلکہ بہت ہی سہانا نظر آتا ہے مگر ٹوبہ ٹیک سنگھ اور چک نمبر ۳۲۲۔ج۔ب کا بھی کوئی جواب نہ ہے۔ وہیں میرا چچا اور انکی اولاد رہتی ہے۔ وہیں میرے دادا دادی کی قبریں ہیں۔ وہیں میرے ماموں اور انکی اولاد رہتی ہے اور میری دونوں بہنیں بہنوئی اور ان کی پیاری پیاری اولاد۔ خدا کرے کسی کو اب وہاں سے اجڑنا نہ پڑے۔ پناہ گیری عذاب ہے۔ خدا ہر کسی کو اس سے محفوظ رکھے۔

Marfat.com

گورنمنٹ کالج' لاہور

تاج شاہی میں جڑا تابناک کوہ نور ہو یا کسی حسینہ کی زینت کا بقعہ نور ہیرا تبھی ہیرا بنتا ہے جب اسے کوئی صاحب ذوق جوہری اپنے کمال فن سے تراش خراش کر اس کی صورت گری کر دے وگرنہ کوئلہ کی کان سے نکلا پتھر کب ہیرا کہلا سکتا ہے۔

اور گورنمنٹ کالج لاہور ایسا ہی مرکز فن تھا جہاں سے علامہ اقبال ایسے عظیم شاہکار بن سنور کر نکلے تھے۔ جس سردار کو بہت سے لوگ جانتے ہیں وہ وہی سردار تھا جسے گورنمنٹ کالج لاہور کے ماحول اور اساتذہ نے تراش تراش کر محنت سے تراشا اور ڈھالا تھا۔ وہ نہیں جو کوڈھوڈہ کی پہاڑیوں اور وادیوں میں اچھلتا کودتا رہا تھا اور نہ ہی وہ جو ٹوبہ ٹیک سنگھ کی گلیوں میں محنت مزدوری کر کے گزارہ کرتا تھا۔ گرچہ پالش ہو کر چمک اٹھنے والے کی ٹھوس بنیاد وہی خمیر تھا جو اس کے بے انتہا سادہ اور محبت کرنے والے والدین اور خاندان نے اٹھایا تھا یا اچھے انسانوں کی صحبت نے اسے مزید پروان چڑھایا تھا۔

گورنمنٹ کالج کے علاوہ سردار محمد کی تشکیل شخصیت و کردار میں سب سے بڑا حصہ میاں محمد شفیع صاحب کی نیک اور عالمانہ صحبت کا تھا کہ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔۔ ایسا سرچشمہ فیض کہ جس کے حوض کوثر سے سردار محمد اور ناصر حسین ہاشمی نے مسلسل دن رات فائدہ

Marfat.com

اٹھایا۔ میاں صاحب کی مجلس میں بیٹھنا ہی تہذیب گری و تعلیم کے اول و آخر ہونے کے لئے کافی تھا۔ علم و فضل اور خلق احسن کا ایسا بے کراں سمندر کہ جو چاہے اس سے سیراب ہوتا رہے.....

لاہور شہر میرے لئے بالکل اجنبی تھا۔ سوائے اس کے کہ میں ہجرت کے وقت اس میں سے گزرا تھا یہاں میرا کوئی رشتہ دار یا واقف کار نہ تھا۔۔۔ صرف میاں محمد شفیع سے شناسائی تھی اور وہ بھی پانچ سال پرانی۔ مجھے تو ڈر تھا کہ شاید وہ مجھے پہچان بھی نہ سکیں کہ ٹوبہ کے بعد میں کبھی انہیں ملا تک نہ تھا۔ خیر لاہور پہنچ کر میں سب سے پہلے میاں صاحب کے پاس پہنچا۔ وہ اس وقت لاہور کارپوریشن کے چیف انگیزیکٹو آفیسر تعینات تھے۔ ریلوے سٹیشن سے سیدھا ان کے دفتر پہنچا۔ اطلاع ملتے ہی فوراً اندر بلا لیا اور بڑے ہی تپاک سے ملے۔ انہیں میرا نام یاد تھا۔ میں بہت خوش ہوا اور جب میرے گھر والوں کی خیریت معلوم کی تو مجھے ایسے معلوم ہوا جیسے کسی نے بیابان میں بہار کی پوروا چلادی ہو اور جب میں نے اپنے میٹرک کے نمبر بتائے تو کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور میرا ماتھا چوم لیا جیسے میں ان کا اپنا بیٹا ہوں اور میرے کہے بغیر کہتے ہیں کہ فوراً گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لے لو۔ بہت اچھا کالج ہے میں بھی وہاں پڑھتا رہا ہوں اور فوراً نہایت ہی شستہ اور خوبصورت اردو میں پروفیسر جی۔ایم۔اثر کے نام چٹھی لکھ دی اور فرمانے لگے رہائش کے لئے جگہ نہ ہو تو برڈ روڈ گھر آجانا۔ بستر مل جائیگا۔ اس کے بعد مجھے لاہور بالکل گھر محسوس ہونے لگا اور تمام کی تمام اجنبیت منٹوں میں ختم ہو گئی۔

میں میاں صاحب کی چٹھی لیکر پروفیسر جی۔ایم۔اثر صاحب کے پاس پہنچا۔ وہ مجھے محمد دین ہیڈ کلرک کے پاس لے گئے اور داخلہ فارم وغیرہ لے کر دیئے۔ میں نے فارم پر کئے اور دوبارہ محمد دین صاحب کے پاس لے گیا۔ اسی دوران مجھے ناصر شمسی صاحب اپنے تھرڈ ایئر کے داخلہ کے سلسلے میں وہیں مل گئے۔ ناصر پرائمری سکول ٹوبہ ٹیک سنگھ کے ایک بہت ہی قابل قدر اور معزز ہیڈ ماسٹر سید احمد حسین صاحب کے صاحبزادے اور سید اعجاز حسین شاہ جنکا پہلے ذکر آچکا ہے کہ بھتیجے تھے۔ انہیں دیکھ کر میں اور بھی خوش ہوا اور لاہور بالکل ہی غیر نہ رہا۔ ناصر کو میں نے بتایا کہ میں شام کو میاں صاحب کے ہاں ٹھہرنے کا سوچ رہا ہوں مگر وہ مجھے اپنے ایک عزیز جو کالج کے قریب ہی رہتے تھے کے گھر لے گئے کہ یہاں ٹھہرو۔ پھر جب ہوسٹل میں جگہ مل جائیگی تو پھر وہاں شفٹ ہو جائیں گے۔

Marfat.com

درخواست سے اگلے دن میرا انٹرویو ہوا۔ خواجہ منظور حسین اس وقت کالج کے پرنسپل تھے اور وہ پندرہ پروفیسر صاحبان کے ساتھ ہم لوگوں کا انٹرویو لے رہے تھے۔ میں نے تمام سوالوں کے جواب تسلی بخش دیئے تو خواجہ صاحب نے وہیں اعلان کر دیا کہ تمہیں ہم داخل کرتے ہیں۔ میں نے اس وقت داخلہ سائنس کے مضامین میں لیا تھا تاکہ ڈاکٹر بن سکوں۔ باہر نکلا تو شمسی میرے انتظار میں کھڑا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ مجھے داخلہ مل گیا تو وہ بہت خوش ہوا۔ اسی طرح سے شمسی کو بھی داخلہ مل گیا تو میں نتیجہ سننے کے لئے باہر کھڑا تھا اور ہم دونوں ملکر یہ خوشخبری سنانے ان کے والد صاحب کے پاس پہنچے۔ اللہ انہیں غریق رحمت کرے وہ بہت خوش ہوئے اور ناصر سے پہلے انہوں نے مجھے پیار کیا۔ یہ ان بزرگوں کا نہایت ہی خوبصورت خاصہ تھا کہ دوسروں کو اپنی اولاد سے بھی زیادہ عزیز سمجھتے تھے۔

چند دنوں میں مجھے کواڈرنہ گل (اقبال) ہوسٹل میں کمرہ مل گیا اور شمسی کو نیو ہوسٹل میں۔ اور ہم نے اکٹھے گورنمنٹ کالج کی تعلیمی ثقافتی اور کھیلوں کی زندگی کا آغاز کیا۔ گورنمنٹ کالج میں سارے پاکستان کے بہترین سکولوں کے بہترین طلبا پہنچتے تھے۔ یہاں پر معروف ماڈل سکول لاہور سے محمد عارف اور اقبال معین تھے تو سینٹ انتھونی' لارنس کالج گھوڑا گلی ایچی سن کالج کے ساتھ ساتھ دہاڑی اور ٹوبہ ٹیک سنگھ کے دیہی علاقوں کے سٹوڈنٹس بھی موجود تھے۔

ہم لوگ چند دن کالج کے ماحول سے اجنبی رہے مگر جلد ہی ہم سب کے ساتھ گھل مل گئے۔ ہم ہوسٹل میں رہنے والوں کے اور بھی وارے نیارے تھے کہ دن رات اکٹھے رہنے سے جلد ایکدوسرے کے حجابات ختم ہو گئے۔ قربتیں اور دوستیاں بڑھنے لگیں اور بہت جلد ہم At-home محسوس کرنے لگے۔

کلاسیں شروع ہوئیں تو کالج کے ماحول کو سکول سے بہت ہی مختلف پایا۔ یہاں ہر طرح کی آزادی تھی۔ ہر پروفیسر آپ کو بہت ہی ادب سے پکارتا تھا اور سکول ایسی گھٹن قطعاً نہ تھی۔ یہاں پر ذہن اور روح کی بالیدگی کے لئے سب کچھ تھا۔ پروفیسر صاحبان ہر طرح کے سوالات کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ پہلے پہلے تو ہم ذرا خوفزدہ تھے مگر آہستہ آہستہ ہم کھلتے گئے۔ اور ہماری شخصیت میں اعتماد اور نکھار آنے لگا۔ کسی کو شاعری سے شوق ہے تو کسی کو کھیلنے کی مہارت ہے۔ جو بھی کسی کا جوہر تھا اس کی پروفیسر صاحبان حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

Marfat.com

یہاں تک کہ گانے اور موسیقی سے شغف رکھنے والے طلبا کے شوق کی ترقی و ترویج کا بھی اہتمام تھا۔ یہ دیکھ کر ہمیں اک نشہ سا ہو گیا جیسے کوئی جنت مل گئی ہو۔

چند دنوں بعد میں نے محسوس کیا کہ میرا فطری رجحان آرٹس کی طرف ہے لہٰذا میں نے فیصلہ کیا کہ میں سائنس کی بجائے آرٹس کے مضامین لے لیتا ہوں۔ میں نے صرف ناصر سے مشورہ کیا اور اس نے مجھے کہا کہ تمہیں جو اچھا لگے وہی کرو۔ میں نے درخوست لکھی اور خواجہ منظور حسین صاحب کے پاس مضامین کی تبدیلی کے لئے پہنچ گیا۔ وہ بہت حیران ہوئے کیونکہ سائنس میں داخلہ بہت مشکل سے ملتا تھا۔ فرمانے لگے "بیٹا اچھی طرح سوچ لیا ہے؟"

ہاں جناب اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کر رہا ہوں

میرا جواب سن کر کچھ دیر سوچتے رہے اور پھر منظوری دیکر فرمانے لگے "بیٹا اگر کبھی خیال آئے کہ تم نے غلطی کی ہے اور تم دوبارہ سائنس کی طرف آنا چاہو تو ہچکچانا نہ۔ میں تمہیں پھر دوبارہ سائنس سبجیکٹس لینے کی اجازت دے دوں گا۔"

میں نے سوچا کتنے اچھے اور مشفق استاد ہیں۔ انہیں اپنے طالب علموں کا اپنے بچوں سے بھی زیادہ خیال رہتا تھا۔ اور وہ لوگ ہر وقت اور ہر لحہ طلباء کی بہتری اور راہنمائی کرتے تھے یہ بعد کے عاجلانہ اور جاہلانہ نمبرمار کے داخلہ اور اس کے نتیجہ میں آنیوالی بد عنوانی سنگدلی اور بداخلاقی نے اس تمام خوبصورت نظام کا ستیاناس ہی کر کے رکھدیا ہے۔ اب تو بات نمبروں کی ہے۔ آپ رشوت سے لیں یا ڈرا دھمکا کر۔ آج کے ناقص نظام نے جسے نہایت جاہلانہ طریقہ سے میرٹ کا نظام کہا جا رہا ہے تمام اساتذہ کی عزت اور ذمہ داری کی مٹی پلید کر کے تمام تر اختیارات بے ایمان کلرکوں کو دے رکھے ہیں۔ جو کام طالب علم کی پوری شخصیت کو جانچنے اور تولنے کا پندرہ پروفیسروں کا پینل کرتا تھا اب کوئی گمنام اور رشوت خور کلرک کرتا ہے اور یہ سب کچھ جاہل جرنیلوں اور بیوروکریٹس کی حکومتوں کا کیا دھرا ہے۔ فائلوں میں بات کتنی اچھی لگتی ہے مگر زمینی حقائق کچھ اور ہی کہانی بتاتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ والدین جن کے ذمہ بچوں کی تربیت ..... اخلاقی تربیت کا عظیم ذمہ ہے وہ مجبور ہو کر اپنے بچوں کو ساتھ لیکر نمبر لگانے والے ممتحنوں کے پاس پہنچتے ہیں اور کیا کرتے ہیں؟ اپنی اولاد کو اچھے نمبر دلا کر ڈاکٹر اور انجینئر بنانے کے لئے ان کی موجودگی میں رشوت دیتے ہیں اور تعلیم و تربیت کے ذمہ دار لیتے ہیں۔

Marfat.com

وائے بدقسمتی یہ سب کچھ کرنے کے بعد ہم اخلاق باختگی اور رشوت ستانی کا واویلا کرتے ہیں؟ کس لئے کہ ہم جاہلوں نے یا ہمارے جاہل حکمرانوں نے نہ ناسمجھی میں مارکس کا نام میرٹ رکھدیا اور پورے معاشرہ کا اخلاقی جنازہ نکال کے رکھدیا۔

مگر اس وقت خواجہ منظور حسین ایسے چند اساتذہ کو خود اپنے آپ پر اور اپنے طالب علم پر مکمل اعتماد تھا اور وہ حالات و واقعات کے مطابق نوجوانوں کی راہنمائی کرتے تھے۔ پھر اس بھٹی سے کیوں نہ بہت سے کندن بن کر نکلیں۔

میں نے آرٹس کے لئے انگریزی ادب۔ عربی۔ فلسفہ اور تاریخ کو منتخب کیا۔ پروفیسر سراج ایسے معروف انگریزی دان ہمیں انگریزی ادب خاص طور پر شیکسپیئر کے ڈرامے پڑھاتے تھے۔ پروفیسر ایس۔ جی رضا ورڈز ورتھ' ٹینی سن' بائرن' کٹھ،٭٭س 'اور شیلے کی شاعری پڑھاتے پڑھاتے محو رقص ہو جاتے اور لفظ لفظ ہماری ارواح میں اترتا جاتا۔ پروفیسر اعجاز مضمون نویسی اور نثر کے ماہر تھے اور لکھا لکھا کر تھکا دیتے۔ پروفیسرز فیاض اور بٹ صاحبان تاریخ کی گتھیاں سلجھاتے سلجھاتے ہمیں گبن اور ٹائن بی بنانے کی کوشش میں جتے نظر آتے بلکہ لاہور آنے پر دنیا کے مشہور ترین تاریخ دان ٹائن بی سے ہم لوگوں کی نشست کروائی پروفیسر سی۔ اے۔ قادر فلسفے کا درس دیتے اور منطق کی گتھیاں سلجھاتے۔ پروفیسر سعید شیخ اسلامی فلسفہ کے ایسے ماہر تھے کہ ایک ایک لیکچر میں سو سو کتابوں کے زبانی ایسے ایسے حوالے دیتے کہ صفحہ نمبر اور سطر نمبر تک لکھوا دیتے۔ اسی طرح صوفی ضیاء الحق عربی کی شاعری پڑھاتے تمام اردو شعراء کی شاعری خاص طور پر غالب پڑھا جاتے۔ نفسیات کے عظیم پروفیسر ڈاکٹر اجمل تو آپ کو ایسا مسحور کرتے کہ شاید مسمرزم کے فن کا فائدہ اٹھا رہے ہوتے نظر آتے۔ فلسفہ اقبال سے لیکر مولانا روم اور سارترے کے فکر کا نچوڑ یوں پیش کرتے جیسے ان کے گھر کا کوئی پکوان ہو۔

گورنمنٹ کالج کی لائبریریں بہترین تھی تو لائبریرین بھی کمال کے لوگ تھے۔ آپ کو ایک ایک مضمون اور کتاب کے لئے بہترین راہنمائی دیتے اور ہمارے وقت کا ہر طالب علم ساری لائبریری ہی کھنگال ڈالنا چاہتا تھا۔ یہاں کی لائبریری سے کتاب نہ ملے تو ساتھ ہی پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری تھی۔ اس کی سہولت بھی آپ کو میسر تھی۔۔ پنجاب پبلک لائبریری بھی چند قدم ہی دور تھی۔ جدھر دیکھیں علم کی بہار تھی اور ہر طالب علم کے لئے اپنی علمی پیاس بجھانے کا بہترین سامان موجود تھا۔ ماحول علمی بھی تھا اور ثقافتی بھی۔ کھیلوں کا بہترین انتظام تھا۔

Marfat.com

اسلامیہ کالج اور گورنمنٹ کالج کے کرکٹ کے مقابلے تو خیر زبان زد عام تھے۔ باقی سب کھیلوں اور جمناسٹک کا بہترین انتظام تھا۔

ہوسٹل کی اپنی بہت سی علمی اور ثقافتی Activities تھیں جن پر اکثر اساتذہ ضرور پہنچتے۔ کھانا کھانے کے سلیقے سے لیکر رہنے سہنے کے طور طریقوں پر بات ہوتی۔ لباس کا خاص خیال رکھا جاتا کہ تہذیب کا یہی نشان ہے۔ بھڑکیلے لباس کی حوصلہ شکنی ہوتی تو سادگی کی قدر افزائی۔ اکثر پروفیسر صاحبان کی پتلونوں پر جوڑ لگے ہوتے تھے مگر وقار میں ذرا بھر فرق نہ آتا تھا۔ امارت کے بیہودہ اظہار پر پابندی تھی بلکہ بہت ہی کراہت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ قدر تھی تو صرف اچھے عمل اور علم کی۔ آل راؤنڈ شخصیت کی نہ کہ محض پڑھائی کی۔ افلاطونی روایت کے عین مطابق علم اور جسمانی کسرت کی برابر اہمیت حاصل تھی۔

کالج کی سب سے اہم اور فعال مباحثہ کی مجلس تھی بلکہ ینگ سپیکرز کی تربیت کے لئے علیحدہ یونین تھی۔ کالج یونین کا سب سے اہم فریضہ مباحث کا اہتمام تھا۔ کہ یہ عقل و خرد کو تیز کرنے کی کسوٹی تھی۔ بڑے مباحثے ہوتے اور بڑے بڑے انعام ملتے۔ آپس میں بھی مباحثے ہوتے تو دوسرے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے ساتھ بھی مقابلے ہوتے۔ یوں آئندہ کے پارلیمنٹیرین کی تربیت کا سامان ہوتا

مباحثہ کے علاوہ اور بہت سی ادبی اور سماجی محافل کالج میں موجود تھیں کہ طلباء کے لئے قلب و روح کی نشو و نما کا سامان ہو سکے۔ مجلس اقبال۔ اسلامک سوسائٹی۔ انگلش لٹریری سوسائٹی۔ میوزک سوسائٹی۔ ڈرامیٹک سوسائٹی۔ اور سائنس سوسائٹی کے علاوہ بہت سی محافل تھیں جہاں بڑے اچھے اچھے ریسرچ پیپر پڑھے جاتے' سوال و جواب ہوتے اور یوں نوجوانوں کی ذہنی نشو و نما کا سامان ہوتا۔

پانچ پانچ طلباء پر مشتمل ایک ٹیوٹوریل گروپ ہوتا جس کی راہنمائی ایک سینیئر استاد کرتا اور ان طلبا سے ذاتی سطح پر رابطہ رکھتا اور ہر ذاتی مسئلہ پر بھی اپنے گروپ کے طلبا کی راہنمائی اور مدد کرتا۔ میرے ٹیوٹر معروف استاد ڈاکٹر نذیر احمد تھے جو بعد میں کالج کے پرنسپل بھی بنے۔ کیا انسان تھے۔ میوزک' شاعری' سائنس' رقص و سرور د تاریخ' ثقافت حتی کہ زندگی کے تمام پہلوؤں پر کمال عبور حاصل تھا۔ داستان گو ایسے کہ آپ کو مسحور کر جائیں۔ آپ کا ذاتی مسئلہ

Marfat.com

ہو تو دس میل آپ کے ساتھ پیدل چل پڑتے۔ ہاکی' فٹ بال' گلی ڈنڈا' کرکٹ حتی کہ ڈھول بجانے کا بھی انہیں شوق تھا۔ کیسا خوبصورت درویش منش انسان تھے۔

یہ مختصر سا خاکہ ہے اس علمی درس گاہ کا جہاں پڑھنے کا مجھے موقعہ ملا۔ پڑھنے سے زیادہ وہاں کے تہذیبی' ثقافتی' ادبی اور شخصیت گری کے ماحول سے متمتع ہونے کا شرف حاصل ہوا ..... پھر کونسا وہ انسان ہے جو تبدیلی اور ترقی کے اس سانچے میں ڈھل کر متشکل نہیں ہوتا جائے گا۔

گورنمنٹ کالج کی سب سے اچھی بات جو مجھے پسند تھی وہ وہاں کی ذہنی اور روحانی آزادی کا ماحول تھا۔ آپ ہر موضوع پر وہاں کھل کر بات کر سکتے تھے اور سیر حاصل بحث کر سکتے تھے جس کا ستیاناس ہماری آنکھوں کے سامنے ایوبی مارشل لاء نے کیا اور تمام کا تمام ماحول تباہ کر کے رکھدیا۔

دادی کی وفات

۱۹۵۷ء کے آخیر کی بات ہے کہ ایک دن گاؤں سے یہ المناک اطلاع آئی کہ میری دادی اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ میرے لیے یہ ایک سوہان روح خبر تھی۔ میں کچھ دیر تو صدمے کی وجہ سے نڈھال سا ہو گیا لیکن میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور بھاگم بھاگ بس کے اڈہ پر پہنچا۔ جب بس روانہ ہوئی تو میں اس عظیم ہستی (دادی) کے متعلق سوچنے لگا تو میرے خیالوں کا بتکدہ جاگ اٹھا۔ یکایک ماضی کے نگار خانے میں ایک ہلچل سی ہوئی اور میں ایکا ایکی اس دنیا میں پہنچ گیا جہاں ماضی کا پورا عہد جوں کا توں میرے سامنے تھا۔ اب مجھے اپنی دادی کا سفید بالوں سے مزین مقدس چہرہ آئینہ کی طرح صاف صاف نظر آ رہا تھا' جو ہمہ وقت اپنے پوتے اپنے سردار کے لیے دعا گو رہتا تھا۔ اور جس کو رب العزت کے بھروسے اپنی دعاؤں پہ کامل یقین تھا کہ اس کا سردار لکھ پڑھ کر ایک دن ضرور بہت بڑا بادشاہ بنے گا۔ جہانگیر بادشاہ۔

میری دادی کی یہ دعائیں ہر وقت ہر لمحہ میرے شامل حال رہیں۔ اس وقت بھی جب اس کا سردار کو ڈھوڈہ جسوالاں (انڈیا) میں پرائمری کے وظیفہ کے امتحان میں

Marfat.com

تحصیل بھر میں اول آیا تھا اور اس وقت بھی جب ہجرت کے دوران ہوشیار پور کے مہاجر کیمپ پر اچانک سکھوں کے حملے سے جس میں اس کے چاچا چاچی شہید ہو گئے۔ لیکن اس کا سردار محفوظ رہا اور بخیریت اپنے وطن پاکستان پہنچ گیا۔

اور یہ دعائیں ہی تھیں جب انکا (پوتا) انکا سردار میٹرک کے امتحان میں ضلع لائل پور (فیصل آباد) اول آیا اور اعلیٰ تعلیم کے لیے ملک کی سب سے اچھی درس گاہ گورنمنٹ کالج لاہور میں زیر تعلیم ہے۔

اور میری سوچوں کا سلسلہ جب ٹوٹا جبکہ میری بس لائل (فیصل آباد) پہنچ چکی تھی۔ میں جلدی سے اترا اور آئندہ اپنے گاؤں جانے کے لیے ٹرین میں سوار ہوا اور ٹوبہ ٹیک سنگھ اتر کر پیدل گھر کی طرف چل پڑا۔ ٹوبہ سے گھر کی مسافت تقریباً ۲ میل ہے۔ میں گھر پہنچا تو پتہ چلا کہ میری پیاری دادی کو تو دفنا دیا گیا ہے۔ سب گھر والوں نے بتایا کہ وہ آخری سانس تک اپنے پوتے اپنے سردار کو یاد کرتی رہیں اور اسے دعائیں دیتی رہیں۔ مجھے بہت ہی دکھ اور رنج ہوا کہ میں آخری بار انکا چہرہ نہ دیکھ سکا مجھے اطلاع دیر سے ملی تھی۔ دادی کی وفات کا وہ کونا کٹا پوسٹ کارڈ کئی آوارہ پتوں سے گھومتا گھامتا مجھ تک پہنچا تھا کیونکہ اس وقت تک میرے وطن میں ڈاک 'تار کا سلسلہ اتنا سریع الحرکت نہ ہوا تھا۔

میں جب اپنی دادی کی قبر پر فاتحہ کے لیے گیا تو میری آنکھوں سے آنسوؤں کی پھوار برسنے لگی اور میں بلک بلک کر بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ میرے دادا اور میرے چچا جو کہ میرے ساتھ تھے مجھے تسلیاں دیتے ہوئے واپس گھر لائے 'گھر پر میری والدہ اور والد نے میری ڈھارس بندھائی۔ میں تین چار دن اپنے گاؤں میں رہا پھر واپس لاہور آ گیا اور تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جس دن ۱۹۵۸ء میں مارشل لاء نافذ ہوا بہت سے لوگوں نے خوشی منائی کہ جھگڑالو سیاستدانوں سے جان چھوٹی۔ ہم لوگوں کو تو مارشل لاء کے مضمرات اور نقصانات کا کچھ معلوم ہی نہ تھا۔ کالج پہنچتے ہی ہماری کلاس نے چھٹی کے لئے شور مچا دیا کہ مارشل لاء کی خوشی میں آج چھٹی ہونی چاہئے۔ اس وقت تاریخ کے پروفیسر فیاض صاحب کلاس لے رہے تھے۔ وہ بچوں کی باتیں سنتے رہے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے اپنی عینک اتار دی۔ یہ

Marfat.com

نشانی تھی اس بات کی کہ اب کوئی زبردست لیکچر نازل ہونے کو ہے۔ انہیں تو تاریخ سے شغف تھا اور تاریخ کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ اپنی گرجدار آواز میں فرماتے ہیں۔

میرے پیارے طالب علموں! میں آپ کے اصرار پر چھٹی کر دیتا ہوں مگر ایک بات یاد رکھنا آج جو کچھ ہوا وہ اس ملک کی تاریخ کا سیاہ ترین دھبہ بنے گا۔ تمہارے بڑوں کی تمام محنت ایک جاہل جرنیل کی حرص اقتدار کی نظر ہو کر ضائع ہو گئی۔ محبت کے پھل بکھر گئے ہیں۔ آپ کی آزادی چھن چکی ہے جو اقبال کے عظیم افکار اور قائد کی بے مثل محنت اور قیادت کا ثمر تھا۔ آج تم تباہ ہو گئے۔ اب صوبائی اور علاقائی مصیبت کے عفریت پھنکارے ماریں گے۔ اگر تمہارا وطن لسانی۔ علاقائی اور نسلی مصیبتوں سے بچ گیا تو یہ ایک معجزہ ہو گا۔ دیکھنا تم قرضوں میں جکڑے جاؤ گے۔ تمہیں سنہری زنجیریں پہنائی جائیں گی۔ جس ڈوری سے یہ گلدستہ بندھا تھا وہ توڑ دی گئی ہے اور وہ ڈوری تھی جمہور کی آزادی جمہور کی آواز۔ آج وہ ختم ہو گئی اور آج میرے خوابوں کا پاکستان چکنا چور ہو گیا..... جاؤ چھٹی مناؤ۔ سب کو چھٹی ہے:۔

بستیوں پہ جب درندے نگران ہوتے ہیں
ہم غریبوں کا لہو پی کے جوان ہوتے ہیں

اور پروفیسر فیاض زار و قطار رو رہے تھے۔

کچھ دنوں بعد پتہ چلا کہ پروفیسر فیاض صاحب لندن چلے گئے ہیں پھر واپس کبھی نہ آئے۔ یوں مارشل لاء نے جہاں سارے ملک کا حلیہ بدل ڈالا وہاں گورنمنٹ کالج کی آزاد فضا کے ماحول کو تباہ و برباد کر دیا۔ مگر میرا وہاں آخری سال تھا۔ میں نے امتحان کی تیاری رکھی۔ پروفیسر فیاض کی بات کا مجھ پر کافی اثر ہوا مگر میں یا میرے جیسے نوجوان کیا کر سکتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ پروفیسر فیاض کی باتیں ہو بہو درست ثابت ہوئیں جو انکی علمی دور رس نگاہ نے اس وقت دیکھ لی تھیں۔

میں نے انگریزی ادب میں Honours کے ساتھ بی۔ اے ۱۹۵۹ء میں پاس کیا اور قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے یونیورسٹی لاء کالج میں داخلہ لے لیا۔ میرا ارادہ وکیل بننے کا تھا کہ میرا سب سے بڑا Inspiration اور آئیڈیل قائداعظم محمد علی جناح بانی پاکستان و محسن پاکستان تھا۔ یہ صرف میرا ہی نہیں قائداعظم اس ساری نسل کے تمام لوگوں کا ہی آئیڈیل

Marfat.com

تھا۔ میں نے قانون کی ڈگری ۱۹۶۱ء میں حاصل کر لی اور وکیل بن گیا۔ کہ یہ میرے قائد کا معزز پیشہ تھا۔

دادا کی وفات

۱۹۶۰ء کی بھرپور گرمیوں کی بات ہے۔ میں ایک دن لاء کالج کے ہوسٹل میں اکیلا بیٹھا تھا۔ دل یکایک اداس ہونے لگا اور میرا اپنے گاؤں جانے کو دل چاہنے لگا۔ ایسی اداسی اور کشش جیسے مجھے کسی آسیب نے آدبوچا ہو۔ میں گاؤں چل دیا۔ بس میں بیٹھا اور پھر لائل پور (فیصل آباد) سے ٹرین میں سوار ہو کر ٹوبہ ٹیک سنگھ پہنچ گیا۔ اس وقت تک شام ہو چکی تھی۔ کوئی سواری دستیاب نہ تھی اور میں پیدل گاؤں کی طرف چل پڑا۔ ہمارے گاؤں کے سامنے سے ایک راجباہ گزرتا ہے۔ میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ چچا محمد دین شہر کی طرف آرہا ہے۔ ہم ملے تو چچا کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور کہنے لگے کہ وہ شہر جا رہے تھے کہ وہ مجھے دادا کی وفات کی اطلاع لاہور کر سکیں۔ کیونکہ دادا نے مرتے وقت کہا تھا کہ مرا پوتا سردار خود اپنے ہاتھوں سے انہیں آخری غسل دے۔

اب مجھے اس بے چینی کی سمجھ آگئی جو میں نے اپنے ہوسٹل کے کمرے میں محسوس کی تھی۔ اللہ کے رنگ نرالے ہوتے ہیں اور شاید وہ ہواؤں کو بھی زبان دے دیتا ہے۔ بس ہماری کثیف ہستی وہاں تک کم ہی پہنچتی ہے۔

میں نے اپنے دادا کے حکم کے مطابق خود انہیں غسل دیا اور خود انہیں لحد میں اتارا۔ میں نے یہ سارا کام ایک میکانوی انداز میں کیا۔ اس دوران کوئی جذبہ امڈا نہ آنسو مگر جب مٹی پڑی تو مرا سب ضبط ڈھیر ہو گیا۔ آنکھوں سے ایک سیل رواں تھا اور مجھے ان کی تمام زندگی یاد آرہی تھی۔ ان کی وہ پرانی ٹھاٹھ باٹھ اور پھر بھینس لٹنے کے بعد کی مسلسل خاموشی اور اب وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے اور ایک بہت بڑا خلاء چھوڑ گئے۔

Marfat.com

اور کئی گھنٹے لگاتار روتا رہا۔ بلکہ جب تک میں گاؤں میں رہا میرا یہ معمول بن گیا روز اپنے دادا کی قبر پر فاتحہ کے لیے جاتا اور گھنٹوں ان کی قبر پر بیٹھ کر روتا رہتا اور ان سے ہمکلامی میں مصروف ہو جاتا۔

اپنے دادا کو لحد میں اتارنے کے بعد جب میرا برا حال ہوا تو میرے والد اور دیگر بزرگوں نے گلے لگایا اور تسلیاں دیں گھر واپس لائے۔

کچھ دنوں کے بعد جب میری طبیعت سنبھلی تو اچانک میرے چچا محمد دین نے مجھ سے وہی سوال کیا کہ سردار یہ بتا کہ تجھے اپنے دادا کی وفات کی اطلاع لاہور میں کس نے دی کہ تو اتنی جلدی گھر پہنچ گیا۔ میں نے جب انہیں بتایا کہ مجھے کسی نے بھی کوئی اطلاع نہیں دی بس اچانک میرا دل گھر آنے کو چاہا اور میں چل دیا اور گھر پہنچ گیا۔

ہو سکتا ہے کہ میرے والد صاحب اور چچا اسے محض اتفاق سمجھ کر چپ ہو گئے ہوں لیکن میں تو یہی کہوں گا کہ یہ میرے دل کی آواز تھی۔

میری خداوند کریم سے دعا ہے کہ رب العزت ہمیشہ میرے دادا کی لحد پر اپنے انوار کی بارش برسائے اور انہیں جنت الفردوس میں مکانی فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

Marfat.com

شہر لاہور

پچاس کی دہائی کا شہر لاہور وہ بے ہنگم اور کثیف لاہور نہ تھا جو اب بیسویں صدی کے آخر میں نظر آتا ہے۔ وہ لاہور بڑا ہی خوبصورت' مختصر اور صاف ستھرا تھا۔ دریائے راوی کا شفاف اور گہرا پانی آپ کا اس طرح استقبال کرتا تھا کہ ایک طرف شہنشاہ جہانگیر اور اس کی ملکہ نور جہان آپکو اپنے شاہانہ اور خوبصورت آرامگاہوں سے خوش آمدید کہتے اور ایک طرف کامران کی بارہ دری کا نظارہ تھا۔ پھر بادشاہی مسجد اور قلعہ کی وسیع و عریض مغل عمارتیں آپ کے ماضی اور تاریخ کی غمازی کرتیں۔ ان کے پہلو میں ذوق سلیم اور زندہ دلی و موسیقی کا سامان تھا جو ایک زمانہ کی بجھتی ہوئی خاص ثقافت کی نمائندگی کرتی نظر آتی تھی۔ اس کے ساتھ لاہور کا اصلی اور دیرینہ فصیل میں گھرا شہر تھا۔

پرانے شہر کے بھاٹی گیٹ کے ساتھ ہی روحانی مرکز تجلی حضرت علی ہجوری المعروف داتا گنج بخش کا مزار تھا جو ہر خاص و عام کی روح کی غذا کی تسکین کرتا۔ زائرین کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ حاضری دیتے اور قوالی اپنی پر جوش روحانی دھنوں سے ہر صاحب دل کو رقص بسمل سے آشناء کرتی جاتی۔

Marfat.com

اور پھر ایک طرف ضلع کچہری کی پر شکوہ عمارت تھی اور دوسری طرف گورنمنٹ کالج کا پروقار مینار علم تھا۔ ساتھ ہی پنجاب یونیورسٹی لاء کالج اور اورینٹل کالج تھے۔ تو گول باغ جو اس وقت واقعی گول تھا اور جناح ہال کے سامنے سے گزرنے والی بھدی سڑک نے موجودہ کمی پیدا نہیں کی تھی کے پہلو میں بلدیہ کا ایوان تھا بلکہ اس کے ساتھ ہی تاریخ کی نشانیوں کا مجموعہ عجائب گھر تھا۔ یہاں سے ٹھنڈی سڑک جسے بنانے والوں نے مال روڈ کا نام دے رکھا تھا شروع ہوتی تھی۔

مال کے شروع میں معروف ٹولنٹن مارکیٹ تھی اور پھر پرانی اور نئی انارکلی کے بازار جن کو چیرتی ہوئی یا ملاتی ہوئی مال روڈ گورنر ہاؤس کی طرف جاتی تھی۔ جس مال روڈ کو آج ہم جانتے ہیں اس وقت کی مال روڈ یہ نہ تھی اس وقت یہ واقعی ٹھنڈی سڑک تھی۔ دو رویہ اتنے خوبصورت اور گھنے ہرے درخت تھے کہ باقاعدہ ہروقت سڑک پر سایہ رہتا تھا۔ سڑک کے ساتھ نہایت ہی خوبصورت پھولوں اور ہرے گھاس کی کیاریاں مستقل آنکھوں کی طراوت تھیں۔ دو رویہ دوکانوں کے ساتھ ساتھ اینٹوں کی سڑک تھی نہ کہ موجودہ بھدی کالی لک والی پتھریلی راہ۔ تمام شہر کی یہی رونق تھی۔ کبھی کبھی کوئی بھولی بھٹکی موٹر کار شاید آجاتی وگرنہ سڑک پر تانگے اور خوبصورت بگھیاں ٹہلتی رہتیں اور پیدل انسان سیر کرتے رہتے۔ مال روڈ اس وقت شہر کی سب سے زیادہ پر سکون سیر گاہ تھی۔ گزرگاہ کے لئے تو یونہی بدنام تھی۔ اومنی بس اس پر بڑے ادب اور وقار سے چلتی تھی۔ اول تو سواریاں ہی کم تھیں مگر ایک سے زیادہ سواریاں ہوئی نہیں تو فوراً قرینہ کے ساتھ قطار بن گئی۔ مجال ہے کوئی ہڑبونگ مچائے۔ معلوم ہوتا ہے موجودہ اور آئندہ نسل کے لئے شاید یہ ایک عجوبہ نظر آئے مگر ہمارے لئے یہ معمول اور باعث راحت تھا۔

سارے شہر کی رونق' ثقافت اور ادب اسی سڑک پر آسمٹا تھا۔ لاہور کا مشہور کافی ہاؤس بائیں بازو کے الجھے بالوں اور خیالات کی آماجگاہ تھا تو چائنیز لنچ ہوم درمیانی اور وسطی فکر کی کشش رکھتا تھا۔ ساتھ ہی وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال میں حلقہ ارباب ذوق کا قبضہ تھا جو سنا ہے مصری شاہ سے ہجرت کر آیا تھا۔ حلقہ میں خوب نقد و نظر اور لے دے ہوتی تھی اور ادب کی بھٹیاں گرم ہوتی تھیں۔ نئے نئے مضامین تنقیدی تحریریں شاعری۔ افسانہ یہیں سے متعارف ہوتا تھا۔ ذرا آگے چل کر انصاف کے خوبصورت ترازو سے مزین ایک بہت ہی خوبصورت اور پر شکوہ' عمارت لاہور ہائی کورٹ کہلاتی تھی جس کا احترام مال روڈ تک ہی نہیں' لوگوں کے دلوں کی شاہراہ پر بھی قابض تھا۔ آگے بہترین بازار اور دوکانیں تھیں جن کا مرکز

Marfat.com

ریگل چوک واقعی شاہی چوک کا حسن رکھتا تھا جہاں ہال روڈ اور ٹیمپل روڈ آکر مال روڈ سے معانقہ کر رہی تھیں۔ ایک خوبصورت ہوٹل کاسینو جو آجکل لارڈز کہلاتا تھا وہیں رونق افروز تھا اور شیزان کی تازگی سب کو مات دے گئی تھی۔ فیروز سنز کی معروف کتابوں کی دوکان سے آگے ایک طرف فری میسن ہال یعنی جادو گھر اور دوسری طرف پنجاب اسمبلی کی نہایت ہی خوبصورت' متوازن اور بارعب عمارت تھی جس کے آگے بہت خوبصورت درختوں کی روشیں تھیں جو اب بے ذوقی کی بناء پر کٹ چکی ہیں۔ اس چوراہے کا اس وقت نام چیرنگ کراس تھا اور اب فیصل چوک ہے۔ آگے نیڈو ہوٹل (موجودہ آواری) چڑیا گھر اور گورنر ہاؤس تھے۔ ساتھ ہی سرکاری ملازموں کی ایک خوبصورت کالونی تھی۔ یہ سارا علاقہ ایسا خوابیدہ تھا کہ چلتے انسان کو نیند آجائے۔ اور لوگ لارنس باغ میں سو بھی جاتے تھے۔ ساتھ ہی ایچی سن کالج کی وسیع و عریض عمارت اور باغات تھے یا سمجھئے کہ ایک جنت تھی مگر ذرا خاموش خاموش سی اور سوئی سوئی سی اور اس کے بعد لاہور کی معروف نہر یا شہر کی حد فاصل جو اس وقت اتنی کثیف اور گندی کبھی بھی نہ تھی۔ نہر کے دونوں طرف گھوڑے دوڑانے کی روشیں تھیں موٹریں دوڑانے والی کالی سڑکیں نہیں۔

یہ تھا آپ کا مختصر سا لاہور۔ نہر کے پار گلبرگ تو ابھی بس ہی رہی تھی مگر مضافات میں دو اور قصبے ضرور تھے۔ ایک کا نام ماڈل ٹاؤن تھا اور دوسرے کا نام میاں میر کی چھاونی تھا۔ ماڈل ٹاؤن کے لئے تانگہ نہیں مل سکتا تھا کہ کون اجاڑ بیابان گزر کر جائے اور چھاونی کی طرف کوئی منہ نہیں کرتا تھا۔

مال روڈ کے دونوں اطراف کچھ بستیاں تھیں جن میں اس وقت دوکانیں نہیں انسان بستے تھے۔ ہمارے پروفیسر جی۔ ایم۔ اثر بھی اسی طرف لکشمی چوک میں رہتے تھے کہ یہ شہر سے باہر شرفاء کی بستیاں تھیں۔ سنت نگر اور کرشن نگر (اسلام پورہ) اس وقت کی جدید ترین آبادیاں تھیں جن کی سڑکیں اینٹوں کی تھیں اور سیورج سسٹم ابھی متعارف نہ تھا۔

لاہور شہر کی ہر علمی اور ثقافتی محفل میں ناصر شمسی اور میں ضرور پہنچ جاتے تھے۔ بعد میں تو ہمارے اور بھی بہت سے دوست بن گئے۔ سروار ظفر اور اشرف کنیڈی ہمارے مستقل یار غار تھے۔ چودھری اصغر علی ڈاکٹر عارف اور اقبال معین کے بغیر ہماری منڈلی پوری نہ ہوتی۔ حلقہ ارباب ذوق ہو یا کافی ہاؤس ان لوگوں کی موجودگی ضرور ہوتی اور ہر طرح کی نظریاتی کھلی

Marfat.com

بحث ہوتی۔ اس وقت سوشلزم پر گفتگو کرنا یا نظم کہنا اچھا خاصا فیشن ہوتا تھا۔ فیض احمد فیض۔ خلیفہ عبدالحکیم۔ میاں محمد شفیع اور دوسرے معروف دانشور گورنمنٹ کالج کی مجالس میں بھی آتے۔

اے۔ کے۔ بروہی جب بھی کراچی سے لاہور آتے ہمارے پرنسپل پروفیسر سراج دین صاحب کے گھر ٹھہرتے۔ وہاں تو ہم انہیں ملنے سے ڈرتے تھے مگر وہ شام کے پانچ بجے فلیٹیز میں ضرور پائے جاتے اور ہم وہاں پہنچ جاتے۔ بعد میں جب لاہور انٹر کانٹیننٹل (موجودہ پرل کانٹیننٹل) بن گیا تو وہ ان کا اڈہ بن گیا۔ ہم ان سے چائے بھی پیتے اور ان کے عمیق و عظیم خیالات سے بھی فیض یاب ہوتے۔

اسی طرح ایس۔ ایم۔ ظفر ایوب خان کے وزیر بننے سے پہلے گارڈینا ریسٹورینٹ جو اب موجود نہ ہے پر بمع اپنی خوبرو بیگم صاحبہ کے محفل سجاتے۔

مگر جو لطف میاں محمد شفیع مرحوم کی محفل میں تھا وہ کسی اور میں نہ تھا۔ ہر روز شام کو اپنی کوٹھی ۱۹۔ برڈ ورڈ پر چند ایک موٹی موٹی کرسیاں بچھاکر باہر لان میں بیٹھ جاتے اور پھر شعر و شاعری اور ادب کے پروانے وہاں اس طرح جمع ہونا شروع ہوتے جیسے شمع پر پروانے۔ اس مجلس میں آپ گھنٹوں بیٹھے رہیں۔ آپ بور نہیں ہو سکتے تھے۔ گفتگو نہایت شستہ اور شگفتہ ہوتی تھی اور علم کا ایک بحرِ بے کراں تھا جو موجیں مارتا نظر آتا۔ تاریخ' فنِ تعمیر' ثقافت' اسلام' شاعری' تحریک پاکستان' قائداعظم' علامہ اقبال' اور دیگر علمی موضوع پر ایسی ایسی خوبصورت باتیں ہوتیں کہ دلوں کو مسخر کرتی جاتیں اور روح میں اتر جاتیں۔ جو علم اور اندازِ گفتگو اس محفل سے ملتا شاید سینکڑوں' کتابیں کھنگالنے سے بھی کبھی نہ مل سکتا۔ میں اور ناصر شمسی ہر دوسرے تیسرے روز وہاں ضرور حاضری دیتے اور گورنمنٹ کالج سے پیدل چل کر برڈووڈ روڈ پہنچتے۔ میاں صاحب ہمیں ایسی مسکراہٹ اور خندہ پیشانی سے ملتے کہ دل کے لئے باعث طراوت ہوتی۔ شاید ایک یا ڈیڑھ سال وہ سرگودھا کے ڈپٹی کمشنر رہے جب ہم اس مجلس سے دور رہے ورنہ ہماری طالب علمی کے زمانے کا سب سے بڑا سرمایہ یہی محفل تھی۔ میاں صاحب اپنی ذات میں ایک مکمل محفل تھے اور علم و ادب کا خزانہ۔ موسیقی اور شاعری سے وہ شغف کہ ہندوستان پاکستان کے تمام معروف شعراء اور گائیک ان کے در دولت پر حاضری دیئے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ پاکستان کے تمام معروف آرٹسٹوں کی سرپرستی میاں صاحب ہی کرتے۔ کسی کو دوکان الاٹ کر دی اور پھر کسی کو زمین۔ گفتگو میں وہ

Marfat.com

شیرینی اور حلاوت کہ آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ ان میں ذرا تصنع یا بناوٹ نہ تھا۔ جو اندر سے تھے وہی باہر سے تھے۔ اسلام کے شیدائی اور اقبال کے سچے مرد مومن۔ اتنے اعلیٰ افسر ہونے کے باوجود ان کے دفتر اور گھر کے دروازے ہر وقت اور ہر کسی کے لئے کھلے ہوتے تھے۔ وہ اکثر فرماتے تھے کہ دربان چاہے جنت کا ہی کیوں نہ ہو وہ دوری ضرور پیدا کرتا ہے اس لئے دربان سے بچو۔ میں نے انہیں اکثر ان کے دفتر میں بھی بہت بڑی بڑی پوسٹوں پر کام کرتے دیکھا ہے۔ وہ ہر گھنٹے کے بعد اپنے دفتر کے بعد باہر آکھڑے ہوتے اور پوچھتے کہ کوئی ملنے والا تو نہیں ہے اور ہر درخواست گزار کا فوراً کام کرتے بلکہ بعض دفعہ تو جانے انجانے خاص طور پر غریب لوگوں کے لئے دفتر دفتر جاکر خود کام کرواتے۔ عجیب درویش منش انسان تھے۔ غرور یا اکڑ ایک طرف رہا ملائمت کی انتہا کو پہنچ جاتے۔ اور جب کوئی کسی غریب کا کام کر دیتا تو خود جاکر اس افسر کا اس طرح شکریہ ادا کرتے جیسے ان کا کوئی اپنا خاص کام اس شخص نے کیا ہو۔ اسی لئے تو وہ جہاں جہاں رہے انہوں نے تعلیمی درسگاہیں۔ باغات اور عوامی سہولت کے سامان پیدا کئے۔ ملتان شہر کے قاسم باغ کو اجاڑ بیابان سے ہرا بھرا گلستان بنانے کا سہرا ان ہی کے سر ہے۔ سرگودھا' پتوکی' قصور' علیگڑھ سکول اور پتہ نہیں کتنے سینکڑوں تعلیمی ادارے ان ہی کے رہین منت ہیں۔ انتظامی صلاحیت ایسی کہ کام کروانے اور صحیح کروانے کا گر کوئی ان سے سیکھے۔ ہر ورکر کا دل جیت لیتے تھے۔ لاہور کارپوریشن کے ایڈمنسٹریٹر کے طور پر خود جھاڑو پکڑ کر صفائی کی تقریبوں کا اہتمام کرتے اور ہر کام میں اپنی مثال قائم کرتے۔ دن رات محنت کرتے اور سماجی تعلقات بھی خوب نبھاتے۔ کمال انسان تھے۔ بہترین ٹینس کھیلتے اور کرکٹ کا بھی شوق رکھتے۔ پتہ نہیں سوتے کب تھے۔ رات بھر مشاعرہ سنتے رہتے اور صبح سب سے پہلے اپنے دفتر موجود ہوتے۔ دفتر میں مجال ہے درخواست دہندہ کو احساس بھی ہونے دیں کہ وہ درخواست کر رہا ہے۔ اسے وہ عزت بخشتے اور اپنی بات کھل کر کہنے کا موقع دیتے کہ لوگ حیران ہو جاتے۔ کبھی کسی سے ہیرا پھیری نہیں کرتے تھے اور نہ ہی جھوٹ بولتے تھے۔ جب ڈٹ جاتے تو ڈٹ جاتے۔ وہ ۱۹۴۷ء میں نواب ممدوٹ وزیر اعلیٰ پنجاب کے سیکرٹری تھے۔ مجال ہے کوئی ان سے اپنے باس کے خلاف شہادت دلوا سکے۔ ہزار حکومتی دباؤ کے باوجود وہ چٹان کی طرح ڈٹے رہے اور کسی قسم کی بھی گواہی دینے سے انکار کر دیا کہ میرا قانونی استحقاق ہے کہ جو ذاتی حیثیت میں ہوا اس کے بتانے کا میں پابند نہیں ہوں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دشمن بھی ان کی عزت کئے بغیر نہ رہ سکے۔ جو کچھ میں نے اور شمسی نے ان کی مجلس سے سیکھا وہ پوری دنیا

Marfat.com

کی کتابوں سے نہیں سیکھا جا سکتا تھا۔ ایک دفعہ ہم شام کو ان کے گھر لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمارے ساتھ عبدالوحید خان مرحوم جو بعد میں ایوب خاں کے ساتھ ریلوے مشیر رہے وہ بھی بیٹھے تھے وہ میاں صاحب کے بے تکلف دوستوں میں تھے۔ اتنے میں ایک خاکروب آگیا اور جناب میاں صاحب کو جی حضور کرنے لگا۔ میاں صاحب نے نزدیک بلاکر پوچھا کیا بات ہے۔ کہنے لگا میری ڈیوٹی بہت دور ہے میری ڈیوٹی مزنگ کی ڈھیوں (بیت الخلاء) پر لگوا دیں۔ میاں صاحب نے مسکرا کر کہا کہ لگوا دیں گے۔

جب وہ چلا گیا تو عبدالوحید کہنے لگے او سفہ ع (وہ ش نہیں بول سکتے تھے) تم اتنے ہی گرگزر گئے ہو کہ اب تم خاکروبوں کی سفارش کرنے پر اتر آئے ہو۔ میاں صاحب کچھ دیر خاموش رہے اور پھر کہنے لگے وحید خاں شکر کرو اللہ کا کہ میں اور تم جہاں ہیں وہاں ہیں۔ وگرنہ اس میں اور مجھ میں کیا فرق ہے۔ جیسا وہ خلیفہ اللہ ہے ویسا ہی میں ہوں۔ صرف اللہ کا کرم ہے کہ میں اور تم اتنی آسائش کی زندگی گزار رہے ہیں وگرنہ ہم میں کیا خاص گن ہیں۔

یہ سن کر وحید خان ذرا شرمندہ سے ہو گئے اور شمسی کی آنکھو سے آنسو بہہ نکلے۔

کیسے کیسے انسان تھے یہ لوگ۔ چراغ لیکر ڈھونڈھو نہیں ملتے۔

بعد میں میں نے اپنی سرکاری زندگی میں میاں محمد شفیع صاحب مرحوم و مغفور کو اپنا ماڈل بنایا اور سمجھا۔ پتہ نہیں ان کے معیار پر اتر سکا یا نہیں لیکن میں نے حتی المقدور کوشش ضرور کی۔ اس بات کا فیصلہ تو وہ لوگ ہی کر سکتے ہیں جن کا معاملہ مجھ سے ہوا یا میرے رفقاء کار رہے لیکن میں اس پر زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اگر میں کچھ اچھا کر سکا تو اللہ کی رحمت تھی اور اگر ناکام رہا تو اس کی بخشش کا طلبگار ہوں۔

مگر یہ مجھے معلوم ہے کہ نقل نقل ہی رہتی ہے اور اصل اصل ہی۔ میاں شفیع کے جذبے اور عمل اصل تھے اور میرے نقل۔

اور بھی بہت سی باتیں ہیں جن کے لئے ان کی ذات کا بے حد ممنون ہوں میں فقیر بے نوا صرف دعا ہی کر سکتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ انہیں ہمیشہ اپنے جوار رحمت میں رکھے۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔

Marfat.com

مقابلے کا امتحان

میں ۱۹۵۹ء میں لاء کالج میں داخل ہو گیا اور ہوسٹل میں رہنے لگا۔ اسی سال ناصر شمسی نے ایم۔اے۔ سیاسیات کیا اور اعلیٰ سروسز کے لئے مقابلے کے امتحان کا سوچنے اور تیاری کرنے لگا۔ میرا کوئی ایسا ارادہ نہ تھا

ایک دن ناصر شمسی میرے پاس ہوسٹل میں آیا اور کہنے لگا کہ وہ اب میاں صاحب کی کوٹھی ۱۹۔ برڈورڈ روڈ میں رہائش پذیر ہے۔ ہوا یوں کے سرراہ اس کی میاں صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ناصر نے بتایا کہ وہ مقابلہ کے امتحان میں بیٹھنے کا سوچ رہا ہے۔ تو فوراً میاں صاحب کہنے لگے سوچو نہیں۔ بس امتحان دے دو۔ شمسی نے بتایا کہ اس کے لئے کچھ رہائش کا پرابلم ہے۔ کہنے لگے اس وقت کہاں رہتے ہو۔ اس نے بتایا کہ پرانی انارکلی کی ایک گلی میں ایک رشتہ دار کے ہاں ٹھہرا ہوں مگر وہ تیاری کے لئے جگہ موزوں نہ ہے۔ کہتے ہیں کہ چلو میرے ساتھ اور دکھاؤ مجھے وہ جگہ اور ساتھ چل دیئے۔ دیکھ کر کہتے ہیں کہ واقعی یہ جگہ سی۔ ایس۔پی کے لئے موزوں نہ ہے۔ چلو میرے ساتھ اور میرے گھر پر رہ کر تیاری کرو اور میرا سامان خود اٹھا کر اپنی کار میں رکھنے لگے۔ میں نے بڑھ کر یہ کام خود ہی کر لیا اور یوں اب میں ان کے ہاں برڈورڈ رہتا ہوں۔ انہوں نے پہنچتے ہی اپنے بیٹے احمد کا کمرہ جو بالکل باہر برآمدے کے ساتھ تھا خالی کروایا اور مجھے کہا کہ اب تم یہاں مقید ہو۔ تمہیں کھانے پینے کی ہر شے مقررہ

Marfat.com

وقت پر ملازم پہنچائے گا اور جب تک امتحان سے فارغ نہ ہو جاؤ اسی کمرے میں بند رہو گے۔ صرف شام کو آدھ گھنٹہ سیر کرنے کی اجازت ہے۔ کسی سے مل بھی نہیں سکتے۔ سردار سے بھی تم نہیں مل سکتے۔ سردار سے کہو وہ بھی اس امتحان کی تیاری کرے۔ میں میاں صاحب کا یہ پیغام اور حکم تمہیں دینے آیا ہوں۔ تم بھی تیاری کرو اور مجھے ملنے بھی نہ آنا۔

یوں میں میاں صاحب کی مجلس سے بھی محروم ہو گیا اور ناصر کشمی کی صحبت سے بھی۔ میاں صاحب کا حکم ٹالا ہی نہیں جاسکتا تھا اس لئے قانون کی تعلیم کے ساتھ ساتھ میں نے مقابلے کے امتحان کی تیاری شروع کر دی۔ مقابلے کے امتحان کے پچھلے ۵ سالوں کے پرچے پنجاب لائبریری سے دیکھے اور ان کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے اپنی پڑھائی کا پروگرام بنالیا۔ شیخ سعید صاحب جو میرے فلسفہ کے استاد تھے نے اس سلسلہ میں بہت راہنمائی کی۔ تحریری امتحان کا جب نتیجہ نکلا تو ہم دونوں پاس ہو گئے۔ ہمارا انٹرویو ہوا جس میں میں فیل ہو گیا اور ناصر کشمی پاس ہو کر انکم ٹیکس سروس میں آگیا۔

اس دوران ایک دن صبح صبح ناصر کشمی میرے ہوسٹل میں آیا اور کہنے لگا کہ وہ میرے کمرہ میں کچھ دن آکر ٹھہرنا چاہتا ہے۔

کیوں بھئی میاں صاحب نے تمہیں اپنے گھر سے نکال دیا ہے کیا؟

نہیں ایسا نہیں ہے۔ اصل میں ان کی بڑی صاجزادی بلقیس کی شادی طے ہو گئی ہے اور شادی کی تیاریاں زور شور سے جاری ہیں۔ انہوں نے تو اشارہ سے بھی مجھے نہیں کہا مگر میں خود ہی محسوس کرتا ہوں کہ ان کو جگہ کی ضرورت ہے۔ امتحان میں دو تین ہفتے ہی تو رہ گئے ہیں۔ میں نے سوچا یہاں آجاتا ہوں اور دونوں بھائی مل کر تیاری بھی بہتر کر لیں گے۔ اور ناصر کشمی میرے کمرہ ہوسٹل ہی میں آکر ٹھہر گئے اور آخری دنوں میں ہم خوب تیاری کرتے اور ایک دوسرے کی مدد کرتے۔

ایک دن باتوں ہی باتوں میں کہنے لگے کہ تم نے اب کبھی بلقیس کو دیکھا ہے؟ میں نے کہا کہ نہیں۔ میں نے تو اسے ۱۹۵۰ء میں ٹوبہ ٹیک سنگھ میں جب وہ چوتھی جماعت کی طالبہ تھی تو تب دیکھا تھا یا پھر ایک دفعہ وہ اور احمد گورنمنٹ کالج کے فنکشن میں آئے تھے تب دیکھا تھا پھر کبھی نہ دیکھا۔

Marfat.com

کہتے ہیں کہ بھئی بلقیس تو کوئی پری حور ہے۔ میں نے اسے کبھی دیکھا نہیں تھا۔ ایک دن وہ اپنی والدہ کے ساتھ شادی کے سلسلہ میں شاپنگ کے لئے جانا چاہتی تھیں اور ان کی کار سٹارٹ نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے اس کار کو دھکا لگایا تو میری نگاہ بلقیس پر پڑی تو میں حیران ہو گیا اللہ نے اسے کیا حسن دیا ہے۔ گوری چٹی اور بھرا بھرا چہرہ۔ بلی آنکھیں۔ بھئی شہزادی لگتی تھی۔ میں تو اللہ کی حمد کے بغیر نہ رہ سکا۔ واقعی میاں صاحب بہت خوش قسمت ہیں۔ اللہ نے انہیں کیسی اچھی اولاد دی ہے۔ احمد بھی دھکا لگا رہا تھا اور میں بھی۔ مجال ہے کہ بلقیس نے آنکھ اٹھا کر دیکھا ہو۔ شرم و حیا کا ایک خوبصورت گلدستہ تھا۔

ناصر شمسی جب مجھے یہ سب کچھ سنا رہا تھا تو میرے دل کے کسی حصہ پر بہت ہی لطیف سا احساس ضرور ابھرا جو ہر نوجوان کے ارمانوں سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے مگر محبت' ایسی بات نہ تھی اور نہ ہی ایسی کوئی بات میاں صاحب کی بیٹی کے متعلق میں سوچ سکتا تھا بلکہ ناصر شمسی پر مجھے غیر ضروری بدظنی ہوئی کہ اسے تو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھنا چاہئے تھا۔ میاں صاحب کا مقام ہی ہماری نگاہوں میں ایسا تھا۔ وہ ہمارے استاد اور پیرو مرشد کا درجہ رکھتے تھے۔

ناصر شمسی انکم ٹیکس افسر بن گیا اور میں قانون کی تعلیم میں جتا رہا۔ اگلے سال میں نے امتحان ہی نہ دیا۔ اس سے اگلے سال قاعدے قانون کے مطابق میرا آخری چانس تھا۔ لہٰذا میں نے خوب تیاری کر کے آخری موقعہ کا فائدہ اٹھایا مگر شومئی قسمت کہ انگریزی مضمون نویسی میں فیل ہو گیا جو لازمی مضمون تھا۔ اس سال میں ہی نہیں اور بہت سے لوگ بھی اس مضمون کے سلسلہ میں ناکامی کی زد میں آگئے کہ ایک پاگل ممتحن پلے پڑ گیا تھا مگر ہمارا کونڈا ہو گیا اور اعلیٰ سروس میں جانے کا ہمارا خواب چکنا چور ہو کر رہ گیا۔ پڑھائی میں میں کوئی ایسا کمزور تو نہ تھا بلکہ پہلے سال جب تفصیلی نمبر منگوا کر دیکھے اور انٹرویو میں بنیادی نمبر مل جاتے تو میں پورے مغربی اور مشرقی پاکستان میں نمبر ۶ پر آتا مگر قسمت یاوری نہ تھی۔

ان مراحل سے گزر کر میں نے فیصلہ کیا کہ وکالت دل لگا کر کی جائے۔ میں نے سنت نگر میں ایک گھر کرایہ پر لے لیا اور وہیں اپنا دفتر بنا لیا۔ دفتر میں ایک دو اور ساتھیوں کو بھی شامل کر لیا۔ سنت نگر میں گھر اور دفتر بنانے کا فائدہ یہ تھا کہ ایک تو کرایہ کم تھا دوسرے وہ جگہ تمام کچہریوں سے بہت نزدیک تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وکالت میں قدم جمانے کے لئے کچھ وقت درکار تھا اور جب تک باقاعدہ آمدنی نہ ہو سستی جگہ پر ہی گزارہ کرنا چاہیے۔ یوں ہماری وکالت چلنا

Marfat.com

بلکہ رینگنا شروع ہو گئی۔ زیادہ تر مقدمے ہم مفت ہی کر دیتے کہ پریکٹس کا موقع تو ملے اور عدالتوں میں ہم پہچانے تو جانے لگیں۔ پیسے ویسے کے متعلق معاملہ کچھ پتلا ہی تھا۔ دال روٹی کا بندوبست کر لیتے اور اللہ اللہ خیر صلا۔ نقد روپیہ پیسہ شاذ ہی ہوتا مگر کالا کوٹ خوب چمکا کر رکھتے۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ جب ۱۹۶۲ء میں میرا عمر کے لحاظ سے کوئی چانس نہیں رہ گیا تھا تو اسی سال قانون میں تبدیلی ہو گئی اور ۲۵ سال کی عمر کی گنتی یکم جنوری کی بجائے یکم اکتوبر سے ہونے کا اعلان ہو گیا اور یوں مجھے کہیں غیب سے وہ چانس ملا جس کی بنا پر میں سروس میں آسکا۔ یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہوا کیونکہ ایسا ہی منظور تھا ورنہ میں تو مایوس ہو کر بیٹھ گیا تھا اور محنت مزدوری کی زندگی کے لئے تیاری شروع کر دی تھی۔ اس آخری موقعہ کے لئے بھی میں نے فیصلہ کیا کہ تیاری میں خواہ مخواہ اپنا وقت ضائع نہیں کرونگا۔ بس امتحان کے وقت ایسے ہی جا کر بیٹھ جاؤں گا۔ تیاری تو پہلے ہی بہت کر رکھی تھی۔ اب میں اپنے روزگار میں ہرج نہیں ہونے دوں گا۔ زیادہ وقت وکالت پر لگاؤں گا اور صرف فارغ وقت میں مقابلہ امتحان کی تیاری کروں گا۔

دوسرا مسئلہ یہ ہوا کہ میرے پاس فیس داخلہ کے پچاس روپے اکٹھے نہ ہو سکے۔ روز مرہ کا گزارہ تھا حسن اتفاق دیکھیے کہ داخلہ کی آخری تاریخ سے ایک دن پہلے تک میری جیب میں صرف پانچ روپے تھے۔ دوست بہت تھے مگر ادھار کبھی مانگا نہ تھا۔ ادھار مانگنے میں بہت عار محسوس ہوتی۔ آخر میں نے سوچا کہ چلئے شیر محمد خاں لوند خوڑ جو ہمارے ہم جماعت اور دوست تھے ان کے پاس رائل پارک چلتے ہیں اور ان سے پچاس روپے مانگ لیتے ہیں۔ یہ سوچ کر میں سنت نگر سے رائل پارک کے لئے پیدل چل پڑا۔ بردم ہیڈ ہوسٹل کے پاس میکلوڈ روڈ پر پہنچا تو ایک ہمارا از قسم فقراء دوست مل گیا۔ دعا سلام کے بعد کہنے لگا میں تو تمہاری طرف جا رہا تھا۔ مجھے لائلپور (فیصل آباد) میں ایک نوکری مل گئی ہے۔ میرے پاس کرایہ نہیں۔ مجھے دو روپے ادھار دے دو۔ میں نے فورا میری جیب میں پڑے پورے پانچ روپے اسے تھما دیئے۔ اس نے تین روپے واپس کرنے کی کوشش کی مگر میں نے یہ کہہ کر لوٹا دیئے کہ بھئی وہاں کھانے پینے کی بھی تو ضرورت ہو گئی۔ رکھ لو۔ یہ پیسے کام آئیں گے۔ اور چل دیا۔ اس بیچارے کو کیا معلوم کہ ہماری اندر سے حالت کیا تھی۔

Marfat.com

بہر صورت میں جب رائل پارک پہنچا تو دیکھا کہ شیر محمد خان اپنے فلیٹ کے باہر ایک بڑی ساری چارپائی پر بیٹھا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا اور کچھ بتائے بغیر اندر چلا گیا۔ میں حیران تھا کہ اسے کیا ہو گیا اس نے ہماری خلاف معمول آؤ بھگت بھی نہ کی اور دل میں کچھ مایوسی سی ابھرنے لگی۔ اتنے میں دیکھا تو شیر محمد خان کتنے سارے کرنسی نوٹ ہاتھ میں لئے آگیا اور کہتا ہے۔

"شکر ہے یار تم آگئے۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ میں ان پیسوں کو کہاں رکھوں۔ کہیں مجھ سے خرچ نہ ہو جائیں۔ میں ذرا فضول خرچ آدمی ہوں تم ذمہ دار آدمی ہو یہ تین سو روپے اپنے پاس رکھ لو۔ ہمارا دوست نثار گدھا میرے پاس امانۃ ا رکھ گیا ہے۔ کہیں مجھ سے امانت میں خیانت نہ ہو جائے۔ تم سنبھال کے رکھ لو۔ وہ مردان گیا ہے۔ دس پندرہ دن کے بعد آئیگا پھر اسے دے دینا"

.....اور میں ورطہ حیرت میں کھویا سوچ رہا تھا کہ یا اللہ تو کیسے کیسے رنگ دکھاتا ہے۔ کمال تیری قدرت ہے۔ تو سب کی عزت رکھتا ہے۔ مجھے سوال ہی نہ کرنا پڑا اور میں پکار اٹھا

فبای الاء ربکما تکذبان

میں نے اگلے دن جاکر اپنی فیس داخلہ جمع کروائی اور یوں مقابلہ کے امتحان میں بیٹھنے کا حقدار بنا۔ یہ سب کچھ قدرت کی طرف سے ہوا۔ میں یہ سوچ سکتا تھا اور نہ ہی کوئی منصوبہ بندی کر سکتا تھا۔ منصوبہ بندی کہیں اور ہو رہی تھی اور ہماری سوچ بلکہ خوابوں سے بھی بڑھ کر ہو رہی تھی۔

اس واقعہ کے اگلے ہی دن مجھے عبد الغنی پٹواری کا مقدمہ ملا۔ اس مقدمہ میں عبد الغنی چاہتا تھا کہ اس کا مقدمہ سپیشل جج نہ سنے اور معاملہ عام عدالت میں چلا جائے۔ عبد الغنی پر الزام تھا کہ اس نے پٹوار کا سرٹیفکیٹ جعلی بنا کر سرکار کی نوکری حاصل کی ہے اور ایسے معاملات کی سماعت کا اختیار صرف سپیشل جج صاحب کو تھا۔ صلاح الدین حنیف صاحب سپیشل جج تھے اور بہت سخت اور ایماندار مشہور تھے۔ تبدیلی مقدمہ کے لئے کوئی وکیل درخواست دینا پسند نہ کرتا تھا کیونکہ اس کے لئے عام طور پر جج کی طرفداری کو بنیاد بنانا پڑتا تھا اور ایسی بات اس وقت وکالت کے ضابطہ اخلاق کے بہت خلاف سمجھی جاتی تھی۔ یوں یہ مقدمہ میرے پاس آگیا کیونکہ میں بالکل

Marfat.com

ہی نیا وکیل تھا۔ بلکہ اس بات کو اتنا برا سمجھا جاتا تھا کہ میرے ساتھ کام کرنے والے ساتھیوں نے بھی کہا کہ وہ اس مقدمہ کو ہاتھ تک نہیں لگائیں گے اور مجھے یہ مقدمہ خود ہی کرنا تھا۔

میں نے بریف تو لے لیا اور فیس بھی پکڑ لی۔

پتہ ہے کتنی فیس ملی؟

پورے تین صد روپیہ جو اس زمانے میں بہت بڑی رقم سمجھی جاتی تھی۔

عین اتنی رقم جتنی نثار گدھے نے شیر محمد کے پاس امانت رکھوائی تھی جو پھر میرے پاس آن پہنچی۔ نثار کو ہم پیار سے گدھا کہتے تھے کیونکہ اس کا تکیہ کلام تھا اور ہربات کے ساتھ گدھا ضرور کہتا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ پھر گدھا ہی مشہور ہو گیا یہاں تک کہ بعد میں وہ خود اپنے آپ کو نثار گدھا کہہ کر متعارف کرواتا۔

میں نے مقدمہ ضرور لے لیا مگر رہا بہت پریشان۔ جس دن صبح تاریخ تھی میں اس ساری رات جاگتا رہا اور فائل کو بار بار پڑھتا رہا۔ آخر صبح فجر کے وقت مجھے ایک دلیل سوجھی جو بالکل واقعاتی بھی تھی اور قانونی بھی۔ نکتہ ملتے ہی میرے ساتھ وہی کچھ ہوا جو ارشمیدس کے ساتھ ہوا تھا اور میں بالکل غیر شعوری طور پر پکار اٹھا کہ پالیا۔ پالیا۔

کچہری کے راستے میں ہمارے بہت سے ساتھیوں نے پوچھا کہ کیا دلیل دیں گے مگر میں ان کے سوالات کو گول کر تا گیا۔

سب سے پہلا مقدمہ ہمارا تھا۔

جج صاحب نے نگاہ اٹھائی تو میں نے بہت ہی لجاحت سے عرض کیا کہ میرے موکل پر الزام ہے کہ اس نے پٹوار کا سرٹیفکیٹ جعلی بنایا اور اس جعلی سرٹیفکیٹ کی بنیاد پر سرکاری نوکری غلط طور اور بددیانتی سے حاصل کر لی ہے۔

میں اس الزام کی صحت سے مکمل طور پر انکاری ہوں

مگر پھر بھی اگر دلیل کے طور پر اسے مان لیا جائے کہ میرے موکل نے یہ سرٹیفکیٹ جعلی بنایا تو جب اس نے یہ سرٹیفکیٹ بنایا اور اس سے یہ جرم سرزد ہوا وہ اس لمحہ سرکار کا ملازم نہ تھا۔ قطعاً نہ تھا..... کسی حساب سے نہیں تھا۔

Marfat.com

اگر وہ جرم ہوا بھی ہے تو ایک عام شہری کی حیثیت سے سرزد ہوا ہے لہٰذا عدالت ہٰذا کی بلاوجہ توضیع اوقات ہوگی کہ اس مقدمہ کی شنوائی کرے۔ اس مقدمہ کی سماعت عام عدالت میں ہونی مناسب اور قانونی ہے۔

بس مقدمہ عام عدالت یعنی اے۔ڈی۔ایم لائلپور کے پاس بھیج دیا گیا اور میں مقدمہ جیت گیا۔ اس مقدمہ کی وجہ سے مجھے بہت شہرت ملی اور بڑے بڑے سینئر وکلاء نے میری وکالت کی تعریف کی جنہوں نے یہ مقدمہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔

مگر میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت یہ مقدمہ مجھے اللہ تعالیٰ کی غیبی امداد اور کرم سے ملا کہ میں اپنے دوستوں کے سامنے سرخرو ہو جاؤں اور مقابلے کے امتحان میں بھی بیٹھ سکوں کہ جس کی وجہ سے میرے دل میں بہت ہی گہری چھپی ہوئی خواہش یا حسرت کو بھی پورا ہونا تھا..... اور وہ حسرت اور چاہت جس کا مجھے خود شعور نہ تھا لیکن دل کے کسی کونے میں موجود تھی۔ جس کی وجہ سے مجھے اور بلقیس کو ایک جان دو قالب ہونا تھا۔

یہ سب کچھ کیسے ہوا مجھے خود اب تک یقین نہیں آتا۔

بس ہو گیا

اور وہ میری زندگی میں حسین رنگ بھر کر رخصت بھی ہو گئی مگر مجھے اب تک پتہ نہیں چل سکا کہ یہ ہونی کیسے ہو گئی۔

ہونی کو ہونا تھا سو وہ ہو گئی

سبحان اللہ تیری قدرت

Marfat.com

اک المیہ

میں نے مقابلہ کا امتحان دے کر اپنی وکالت پر ساری توجہ مرکوز کر دی کہ میں اپنا کیریئر بناؤں۔ ان دنوں جیسے میں نے پہلے عرض کیا ہے میں سنت نگر میں رہتا تھا اور میاں محمد شفیع لاہور کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ بحیثیت ڈپٹی کمشنر چونکہ وہ ضلع مجسٹریٹ بھی تھے اور تمام مجسٹریٹ ان کے ماتحت تھے اس لئے اس زمانے کے دستور کے مطابق میں اپنی عقیدت کے باوجود میاں صاحب سے ذرا کم ہی ملتا تھا تاکہ کسی کو شائبہ تک نہ ہو سکے کہ میں ان کی عدالتی حیثیت کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ حالانکہ ان ہی کے حوالہ سے میں نے چوہدری غلام باری سلیمی ایڈووکیٹ سے اپنی عملی وکالت کا کام سیکھنے کا آغاز کیا تھا۔

ایک دن صبح صبح کا قصہ ہے۔ سخت گرمی کا موسم تھا۔ شاید جون کا یا مئی کا مہینہ ہو گا۔ ۱۹۶۳ء کا قصہ ہے لیکن مجھے تاریخ یاد نہیں ناصر شمسی نے مجھے آکر گہری نیند سے اٹھایا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھا تو دیکھتا ہوں کہ ناصر نہایت پریشان حال بکھرے بالوں کے ساتھ کھڑا ہے اور اس کی ہوائیاں اڑی ہوئی ہیں۔ کہتا ہے بہت بڑی ٹریجڈی ہو گئی ہے۔ غضب ہو گیا ہے سردار اٹھو تم سو رہے ہو

Marfat.com

بھئی کیا ہو گیا ہے؟

ہونے کو رہ ہی کیا گیا ہے۔ سب کچھ اجڑ گیا۔ میاں صاحب تباہ ہو گئے

ہیں؟

میں منہ کھولے اس کی طرف دیکھ رہا تھا

پہلے تو مجھ پر کچھ سکتہ سا طاری ہو گیا۔ میں نے سوچا شاید میاں صاحب اس دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں۔ وہ ہمارے محبوب آئیڈیل تھے۔

بھئی بتاؤ۔ کیا ہو گیا۔ کیا میاں صاحب

اس سے آگے میری زبان نہ چل سکی

کیا میاں صاحب ٹھیک ہیں؟ کیا میاں صاحب خیریت سے ہیں؟ وغیرہ میرے منہ سے بے تکے فقرے نکلتے رہے۔

شمسی اس وقت زار و قطار رو رہا تھا اور بات نہیں کر سکتا تھا۔

بھئی بتاؤ کیا ہوا؟

میاں صاحب کب فوت ہوئے؟ اب تو اس کی حالت دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میاں صاحب چل دیئے ہیں۔

نہیں بھائی اس سے بھی بہت برا ہوا۔

ہیں؟

بھئی ان کے داماد وفات پا گئے ہیں۔ میں حیرانی کے عالم میں ناصر شمسی کا چہرہ گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ اس نے میری حیرانی کو بھانپ لیا اور کہنے لگا کہ تمہیں یاد ہے میاں صاحب کی بیٹی بلقیس کی شادی دو تین سال پہلے ہوئی تھی۔ یہ اسی کا شوہر سعید تھا۔ کل میں شام کے وقت میاں صاحب کے پاس ڈپٹی کمشنر ہاؤس کے برآمدہ میں بیٹھا تھا کہ اچانک اندر سے بلقیس کے رونے کی آواز آئی۔ میاں صاحب بھاگ کر اندر گئے تو دیکھا کہ سعید بے سدھ بستر پر پڑا تھا۔ یوں

Marfat.com

معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے بے ہوشی کے عالم میں ہو۔ لیکن جب اسے ہسپتال لے کر گئے تو معلوم ہوا کہ وہ وفات پا چکا ہے۔ بلقیس ابھی تک اس شدید صدمہ کے زیر اثر ہے۔ بیگم شفیع کی حالت دیکھی نہیں جاسکتی اور میاں صاحب بالکل بجھ چکے ہیں۔ وہ مسکراہٹ ہے نہ وہ شگفتہ چہرہ۔ پتہ نہیں وہ اس غم کو برداشت بھی کر سکیں گے کہ نہیں۔ اٹھو چلو چلتے ہیں۔ میں نے سوچا تمہیں اطلاع کر دوں۔

یہ سن کر تو میرے ہوش و حواس ہی گم ہو گئے۔ میں فوراً شمسی کے ساتھ چل پڑا۔ پہنچ کر دیکھا تو میاں صاحب کا رنگ جلی راکھ ایسا ہو چکا تھا۔ اس وقت تک بہت لوگ پہنچ چکے تھے۔ مجھ سے تو بات بھی نہ ہو سکی تھی اور میں اپنے دکھ کا اظہار بھی نہ کر سکا۔ الفاظ تھے کہ گلے میں پھنس کر رہ گئے تھے۔ ہزار کوشش کی مگر میں ان کے دکھ میں گونگا ہو چکا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ بلقیس پر کیا گزر رہی تھی لیکن میں اس کی کیفیت کو سمجھ سکتا تھا۔ ابھی تو وہ بے چاری تیئس سال کی بھی نہ تھی۔ بہت چھوٹی عمر میں اس کی شادی ہو گئی تھی اور دو چھوٹی چھوٹی بچیاں یتیم ہو گئی تھیں۔ کیا کرے گی بیچاری۔ ابھی تو پہاڑ ایسی زندگی اس کے سر پر کھڑی تھی۔ میاں صاحب سے ہماری عقیدت بے پناہ تھی اور ہم سے ان کا اور ان کی جواں سال بیٹی کا دکھ دیکھا نہیں جاتا تھا۔ میرے اور شمسی کے بار بار آنسو نکل جاتے مگر میاں صاحب برداشت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ آنسو تو نہیں بہہ رہے تھے مگر چہرہ گواہی دے رہا تھا کہ اندر سے وہ بالکل ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں۔

میاں صاحب کے چاہنے والے بہت تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ سارا شہر ہی اس وقت وہاں پہنچ گیا تھا تو مبالغہ نہیں ہے۔ سب لوگ اور ہر طرح کے لوگ ان کے غم میں شریک ہو رہے تھے۔ زیادہ تعداد غریب اور مفلوک الحال لوگوں کی تھی۔ چمبہ ہاؤس کے لان۔ جی۔ او۔ آر کے سبزہ زار اور پیچھے ریس کورس تک ہجوم تھا۔ لاہور کارپوریشن نے اس اژدھام کو پانی پلانے کا خاص اہتمام کر رکھا تھا۔ میں نے بہت سے لوگوں کو کہتے سنا کہ میاں شفیع ایسے نیک انسان کے ساتھ تو یہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ تو کسی کا بھی دل نہیں دکھاتا تھا۔ آخر

Marfat.com

یہ کیوں ہو گیا اور ہر کوئی میاں صاحب کی صحت کے لئے دعا کرتا دیکھا گیا۔ عجیب انسان تھا کہ ہر کسی کی محبت و الفت کا مرکز تھا مگر آج وہ چراغ بہت ہی بجھا ہوا تھا جو اتنے دلوں کی روشنی کا باعث تھا۔

اگلے چند دن بلکہ ہفتے میں اور شمسی ہر روز پورا پورا دن میاں صاحب کی ڈھارس بندھانے کے لئے ان کے ساتھ گزارتے۔ انہیں بہلانے کی بہت کوشش کرتے۔ ان کے پسندیدہ موضوعات پر بات کرنے کی کوشش مگر وہ میاں ہنستا مسکراتا میاں شفیع جسے ہم جانتے تھے واقعی مر چکا تھا۔ ان کے والد مولوی چراغ دین اور سسر مولوی عبد العزیز بھی ان کو ہر قسم کی پدرانہ محبت دیتے مگر ہم نے دیکھا کہ وہ اندر ہی اندر گھٹے جا رہے تھے۔ رنگ پیلا ہو چکا تھا اور بیمار نظر آتے۔ چہرہ بالکل راکھ بنتا جا رہا تھا۔ بلقیس ان کی اولاد میں انہیں سب سے زیادہ پیاری تھی اور اس سے بے انتہا پیار کرتے تھے۔ وہ اپنے سبھی بچوں سے بہت ہی پیار کرتے تھے مگر بلقیس سے کچھ زیادہ ہی لگاؤ تھا۔ جو کچھ ہوا ان کی برداشت سے باہر تھا۔ وہ کیا سوچ رہے تھے وہ کسی کو نہیں بتا رہے تھے مگر بلقیس کے مستقبل کی فکر انہیں اندر ہی اندر سے کھائے جا رہی تھی۔ ایسا رقیق القلب انسان جو ساری مخلوق خدا سے اتنی الفت رکھتا ہو وہ اپنی چہیتی بیٹی کا دکھ دیکھ کر کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ ہمیں دکھ ہی نہیں بلکہ اب ترس آنے لگا تھا کہ ہمارے محبوب میاں صاحب اتنے دکھی ہیں مگر ہم کیا کر سکتے تھے۔ بس خون کے آنسو پی کر رہ گئے۔ وہ تو خدا بھلا کرے ان کے دوست عبد الوحید خان کا کہ انہوں نے اور افضل چیمہ صاحب نے میاں صاحب کو ان کے دفتر بھجوانے کا بندوبست کیا ورنہ گھر میں بیٹھے بیٹھے تو وہ شاید ختم ہی ہو جاتے۔

اس اندوہناک واقعہ کے مہینہ دو مہینہ بعد میں نے بلقیس کو دیکھا تو ایسے لگا کہ شاید کوئی لاش چل رہی ہو۔ چہرہ بے رنگ مردہ اور اوپر سے بادامی رنگ کا برقعہ لیئے ہوئے چند ماہ کی سائرہ کو گود اٹھایا ہوا تھا اور انجم جو مشکل سے دو سال کی ہوگی انگلی پکڑ کر چل رہی تھی۔ میں اور میاں صاحب لان میں بیٹھے تھے۔ بیٹی نے باپ کی طرف کچھ عجیب پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا جیسے کہ رہی ہو میرے پیارے ابا یہ سب کچھ کیا ہو گیا۔ بلقیس کی شکل بالکل اجڑی ہوئی تھی اور اس کا دکھ اس کے چہرے پر جلی حروف میں لکھا تھا۔ ابھی میں اس کی دکھی کیفیت کو بڑے ہی دکھی دل سے دیکھ ہی رہا تھا کہ بے چاری کو کوئی ٹھوکر لگی اور وہ دھڑام سے گر گئی۔ سائرہ گر گئی اور دونوں بچیاں چلانے لگ گئیں۔ میں نے فوراً ایک جست لگائی اور پہنچ کر بلقیس اور بچیوں کو

Marfat.com

اٹھایا۔ اتنے میں میاں صاحب بھی پہنچ گئے اور انہیں سہارا دے کر اندر لے گئے۔ مجھ سے یہ منظر دیکھا نہ گیا۔ بلقیس بالکل زرد اور بے جان نظر آ رہی تھی۔ میں نے سوچا اب تو شاید زندہ نہ رہ سکے گی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اسے باقاعدہ گلوکوز وغیرہ دے کر اور دوائیاں کھلا کر زندہ رکھا جا رہا ہے۔ بلقیس کے لئے اس کے تمام خواب بکھر چکے تھے اور اب وہ خود بکھر رہی تھی اور دکھی ماں باپ کو بھی بکھیر رہی تھی مگر قدرت کے اپنے رنگ ہوتے ہیں کسی کو کچھ معلوم نہیں کہ کیا ہونے والا ہے اور کسی کے مقدر میں کیا لکھا ہے۔ اللہ ہی جانے.....کوئی اور نہ جانے۔

جس دن بلقیس کو میں نے اتنی بری حالت میں دیکھا اس رات میں ایک پل کے لئے بھی نہ سو سکا۔ بلقیس اور اس کے سارے خاندان کے دکھ کو میں دیکھ ہی نہ سکتا تھا۔ اگلے دن میں نے یہ واقعہ شمسی کو بتایا تو وہ بہت ہی دکھی ہوا اور ہم دونوں مل کر روتے رہے۔

اس واقعہ کے ایک دو دن بعد ہی ہمارا C.S.S کا رزلٹ آیا اور میں پولیس سروس آف پاکستان کے لئے منتخب ہو گیا۔ ظاہر ہے مجھے بے انتہا خوشی ہوئی۔ شمسی بھی بہت خوش ہوا۔ اگر سعید والا غمناک واقعہ نہ ہوا ہوتا تو ہم نے سب سے پہلے جا کر یہ خوشخبری میاں صاحب کو دینی تھی کیونکہ میں اور شمسی میاں صاحب ہی کی بدولت یہاں تک پہنچے تھے۔ ان کی حوصلہ افزائی اور راہنمائی اگر ہمارے شامل حال نہ ہوتی تو یہ سب کچھ ناممکن تھا۔ اللہ تعالی کی ذات کے بعد اگر ہمارے شکریہ کا کوئی حقدار تھا تو وہ میاں صاحب تھے مگر میاں صاحب کے ذاتی دکھ کی وجہ سے ہمیں جرات ہی نہ ہوئی کہ انہیں یہ خبر دیں۔

کچھ دنوں بعد میں اور شمسی میاں صاحب کو ملنے گئے تو وہ بہت ہی تپاک اور خوشی سے ملے۔ گلے لگایا۔ پیار کیا اور مبارک دی۔ نہایت پیار سے کہتے ہیں کھوتے تم نے مجھے اتنی اچھی خبر جلد کیوں نہ سنائی۔ ابا کو بتایا"

میاں صاحب نے یہ سب کچھ کچھ اتنے پیار اور اپنائیت سے کہا کہ میرے آنسو نکل گئے۔

کھوتا۔ ایسے وقت میں روتے ہیں کیا؟ یہ تو خوشی کا موقعہ ہے۔

Marfat.com

میں نے عرض کیا کہ جناب یہ آنسو خوشی کے ہیں اور آپ کی محبت کا جواب میں الفاظ میں نہیں دے سکتا۔

ہم حیران تھے کہ اتنے غم کے باوجود وہ ہماری خوشی میں کس طرح حصہ لے رہے تھے اور ہمیں اس بات کی بھی بہت خوشی ہوئی کہ شکر ہے ہماری ہی وجہ سے سہی میاں صاحب کو بہت دنوں کے بعد مسکراتے ہوئے تو دیکھا اور شمسی نے میاں صاحب کے پسندیدہ موضوعات چھیڑ کر ایسی خوبصورت گفتگو کی کہ مجھے آج تک اس پر رشک بھی آتا ہے اور فخر بھی۔ میں نے سوچا شمسی واقعی ایک dynamic افسر بنتا جا رہا ہے۔ میں تو زیادہ دیر خاموش ہی رہا مگر اس نے میاں صاحب کو خوب خوش کیا۔ اتنے میں میاں صاحب کے ہم زلف میاں حنیف بھی آ گئے جنہیں اکثر میاں صاحب مذاق سے میاں نحیف کہتے اور وہ میاں صاحب کو خوش دیکھ کر بہت ہی خوش ہوئے۔ کچھ دیر بعد وہ مولوی عبدالعزیز کو بھی بلا لائے اور سب نے مل کر میاں صاحب کا خوب دل بہلایا۔

میاں حنیف نے بعد میں ہمیں کہا کہ آپ لوگ آتے رہا کریں۔ شکر ہے بھائی جان آپ لوگوں کی وجہ سے خوش تو ہوئے ورنہ یہ تو مر ہی چلے تھے۔ بھلا کوئی کسی کے ساتھ مر تھوڑا ہی جاتا ہے۔

دراصل میاں صاحب ہم لوگوں کو اپنی اولاد سے بھی بڑھ کر پیار کرتے تھے۔ یہ ان کی عظمت اور بے لوثی کی علامت تھی۔ میاں شفیع بہت خوبصورت و خوب سیرت انسان تھا۔ میں نے ایسا پیارا انسان زندگی میں پھر کبھی نہیں دیکھا۔

میری سلیکشن پر میرے والد صاحب بہت خوش ہوئے مگر والدہ کچھ فکر مند ہو گئیں کہ پولیس کی نوکری کچھ خطرناک ہوتی ہے بلکہ کہنے لگیں میرا خیال ہے کہ تم وکالت ہی کرتے رہو۔ یہ زیادہ اچھا ہے پیسے بھی خوب کما لو گے۔ نوکری میں کہاں گزارہ ہوتا ہے۔ اب تمہیں بنگال جانا پڑے گا۔ اتنی دور مت جاؤ مگر والد صاحب نے کہا کہ ایسی نوکری خوش قسمتی ہی سے ملتی ہے۔ ناشکری نہیں کرنی چاہیے۔ میرا بیٹا آئی۔جی۔اور گورنر بنے گا پھر میں پریتم سنگھ اور بھگوان سنگھ کو بتاؤں گا کہ مسلمان کیسے اچھے حکمران بنتے ہیں۔ میرا بیٹا نیک نام ہو گا اور اپنی نیک نامی سے سب ہندوؤں کی ناک کاٹ دے گا۔

Marfat.com

ہمارے بڑوں کے ہندوؤں نے اتنے دل دکھائے تھے کہ وہ بھول ہی نہ سکتے تھے اور تقسیم کے تیرہ سال بعد بھی انہیں ہندوؤں کو نیچا دکھانے کا جنون تھا جو وہ اپنے بیٹے کے ذریعہ پورا کرنا چاہتے تھے۔ جو لوگ خاص طور پر نئی نسل کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان بنانے کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی انہیں بہت بڑی بھول ہے۔ وہ جانتے ہی نہیں کہ ہندو مسلم کدورتیں اور دوریاں کتنی گہری تھیں جسے وقت کا دھارا مٹا ہی نہ سکتا تھا۔

مجھے خود بھی اعلیٰ سروس میں جانے کا شوق تھا جیسا کہ ہر نوجوان کو ہوتا ہے اور میں نے تو بہت محرومیاں دیکھی تھیں۔ اس طرح ان کی بھی فوری تلافی ہو سکتی تھی۔ روپے پیسے کی محرومی کی بات نہیں کچھ نفسیاتی محرومیاں تھیں جن کے چرکے میں نے غربت اور محرومی کے دور میں کھائے تھے۔ مجھے ملازمت میں داخل ہو کر وہ روحانی زخم مندمل ہوتے نظر آرہے تھے اور واقعی وہ مندمل ہو گئے بلکہ بھول گئے۔

لہٰذا میں نے ضروری تیاری کے بعد پولیس اکیڈمی سارد ا مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) میں پولیس تربیت کے لئے رپورٹ کر دی۔

میں یہاں پر واضح کرتا جاؤں کہ میں اپنی پیشہ وارنہ اور سرکاری زندگی کے متعلق بیان نہیں لکھ رہا ہوں کیونکہ میں نے اپنی یادداشتیں انگریزی زبان میں The Ultimate Crime ....یعنی اقتدار کے کھیل کا چشم دید گواہ کے نام سے پہلے ہی لکھ دی ہیں۔ یہاں پر میں صرف اپنی نجی زندگی کی کہانی لکھ رہا ہوں اور وہ بھی ڈاکٹر پیر محمد طور کی خاص فرمائش پر۔

ایک سال سے زیادہ سخت ٹریننگ کر کے میں ضلع کی عملی تربیت کے لئے ایبٹ آباد ضلع ہزارہ شروع ۱۹۶۵ء میں تعینات ہو گیا جہاں سے میری زندگی کا بہت ہی حسین پہلو شروع ہونا تھا۔

Marfat.com

رحمت کی تجویز

ایبٹ آباد ہزارہ ایک بہت ہی خوبصورت پر فضا پہاڑی علاقہ ہے۔ بنیادی طور پر چونکہ میرا تعلق بھی ایک پہاڑی علاقہ سے تھا۔ اس لئے مجھے وہ جگہ بہت ہی پسند آئی۔ اس وقت ضلع ہزارہ میں موجودہ ہزارہ ڈویژن کے تمام ہی اضلاع شامل تھے اور ہری پور سے لیکر کوہستان تک سب ایک ہی ضلع تھا۔ نتھیا گلی۔ بفہ۔ اوگی۔ تھاہ کوٹ۔ امب اور خود کوہستان سب علاقے اپنے حسن سے انسان کو دم بخود کر دیتے۔ ہر طرف ہریاولی لمبے لمبے درخت تھے۔ چشمے اور نہایت شفاف پانی کی ندیاں ہر طرف بہاریں لا رہی ہوتیں۔ سردیوں میں برف سے سب پہاڑ ڈھنپ جاتے اور عجیب و غریب نظارہ پیش کرتے۔ خود شہر ایبٹ آباد میں بھی برف پڑتی تھی اور لوگ برف کے گولے بنا بنا کر کھیلتے۔ پورے شہر کے اردگرد اونچے اونچے پہاڑ تھے اور ایبٹ آباد کا شہر ایسے بنا ہوا تھا جیسا کہ کسی پیالے کا پیندا ہو۔ ایبٹ آباد کا کلب بہت خوبصورت اور وسیع تھا اور میں ہر شام وہاں ٹینس اور بلیرڈ کھیلنے جاتا۔ قریب ہی ایک نہایت ہی خوبصورت کمپنی باغ تھا جس میں دیو قامت چنار کے درخت لگے تھے۔ میں اکثر وہاں بھی جا کر بیٹھتا۔ ساتھ ہی جونیر برن ہائی سکول تھا جہاں ہمارے سارودہ کے پرنسپل کے۔ این حسین صاحب کے تین صاحبزادے زیر تعلیم تھے۔ ہفتہ میں ایک دفعہ انہیں ضرور ملنے جاتا۔ قریب ہی آرمی کی کاکول اکیڈمی تھی وہاں میں اپنے ایس۔ پی حاجی حبیب الرحمن کے ساتھ ہفتہ میں ایک

Marfat.com

دفعہ فلم دیکھنے جاتا اور فوجی افسران سے گپ شپ رہتی۔ ایبٹ آباد میں پاکستان آرمی کی تمام رجمنٹوں کے نہایت ہی خوبصورت سنٹر تھے۔ میں ان میں بھی ضرور چکر لگاتا۔ سرکاری و غیر سرکاری کام کے سلسلہ میں تمام ضلع کی متڑگشت کرتا اور وہاں کے قدرتی نظاروں سے لطف اندوز ہوتا۔ میں ہرروز گھڑ سواری کرتا اور اور بگڑے تگڑے گھوڑوں کو سدھارتا رہتا۔ دفتر سے زیادہ باہر کے کاموں خاص طور پر تھانہ کے کام اور تفتیش کے معاملات کو سمجھنے کی کوشش کرتا۔ اور شام کو کلب یا کسی فوجی میس سے لی ہوئی کتابیں پڑھتا رہتا۔ اور یوں میرے بہت ہی خوبصورت شب و روز گزر رہے تھے۔ دور دور سے مجھے لوگ ملنے آتے اور پنجاب سے وہ لوگ خاص طور پر برادری کے معتبر لوگ مجھے ملنے آتے جو مجھے کبھی زندگی بھر نہ ملے تھے۔ اس سے جہاں میری اناء کی تسکین ہوتی تھی وہاں مجھے گھن بھی آتی تھی کہ یہ لوگ مجھے صرف اس لئے اہمیت دے رہے ہیں کہ میں ایک بااختیار اور طاقتور سروس کارکن بن گیا ہوں ورنہ یہ لوگ تو مجھے منہ نہ لگاتے تھے۔ کچھ شرفاء نے تو مختلف طریقوں سے مجھے اپنی بہنوں بیٹیوں کے رشتے کے بھی اشارے دیئے کہ میں ابھی غیر شادی شدہ تھا لیکن دل میں ایسی کوئی بات ابھی آئی نہ تھی۔ والدین کا بھی خیال تھا کہ ایک دو سال بعد آرام سے شادی کریں گے بلکہ میری والدہ تو میری شادی میرے ماموں کے گھر کرنا چاہتی تھیں جن کی بیٹی کی عمر بہت ہی کم تھی شاید ابھی دس بارہ سال ہی کی تھی اور میں نے صاف کہہ دیا تھا کہ یہ بات نہایت غیر مناسب ہے۔ اگر عمر کا اتنا تفاوت نہ ہوتا تو کوئی ہرج ہی نہیں بلکہ بہت اچھا ہوتا۔

یوں میرا بہت اچھا وقت گزرتا گیا۔ ایک دن کی بات ہے اور شاید یہ مئی کا مہینہ تھا کہ مجھے لاہور سے میاں محمد شفیع کے صاحبزادے احمد رضا کا ٹیلی فون آیا کہ وہ مقابلہ کے امتحان کی تیاری کر رہا ہے اور میں کوئی راہنمائی دوں۔ میں بہت خوش ہوا اور چند ایک اہم امور اور کتب کی نشاندہی کر دی اور اسے بتایا کہ میں عید کے سلسلہ میں ٹوبہ ٹیک سنگھ جا رہا ہوں۔ راستے میں لاہور ٹھہروں گا اور فلاں تاریخ کی شام کو میں ان کے گھر آکر پوری شام احمد سے مقابلہ کے امتحان سے متعلق بات کروں گا۔ احمد سے مجھے معلوم ہوا کہ میاں صاحب جرمنی کسی سرکاری کام سے گئے ہوئے ہیں اور اگلے تین ہفتہ وہیں رہیں گے۔ میں نے کہا چلئے آپ سے ہی ملتے آئیں گے۔ میاں صاحب ہوتے تو کیا ہی اچھا ہوتا۔ میں ان سے سرکاری ملازمت کے لئے

Marfat.com

راہنمائی لیتا۔ میاں صاحب اس وقت مغربی پاکستان کی حکومت کے منصوبہ بندی محکمہ کے سیکریٹری تھے۔

میں حسب وعدہ لاہور پہنچ کر احمد کو ملنے میاں صاحب کی سرکاری رہائش گاہ ۸۔اے کلب روڈ گیااور کئی گھنٹے برآمدہ میں بیٹھ کر اس کے ساتھ امتحان کے معاملات ڈسکس کرتا رہا۔ اس دوران رحمت میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ اس نے جب میں فارغ ہوں تو کوئی ضروری بات کرنا ہے۔ رحمت اور نیامت دو بھائی تھے جو میاں صاحب کے گھر فیملی ممبرز ہی کی طرح رہتے تھے۔ بچپن میں ان کے ماں باپ مر گئے۔ غریب لوگ تھے۔ میاں صاحب نے انہیں اپنے بچوں کی طرح پالا تھا۔ وہ وہاں گھر کا کام کاج بھی کرتے اور دونوں کو میاں صاحب نے کسی دفتر میں ملازم بھی کروا رکھا تھا۔ میں نے سوچا رحمت کو کوئی کام ہو گا اس لیے بات کرنا چاہتا ہو گا۔ مجھے کیا معلوم کہ جو وہ بات کرنا چاہتا ہے وہ میری زندگی کے لئے اہم ترین موڑ ثابت ہو گا۔

احمد سے فارغ ہوا تو میں نے رحمت کا پتہ کیا۔ وہ اس وقت کہیں بازار گیا ہوا تھا۔ میں نے تھوڑی دیر اس کا انتظار کیا اور پھر چل دیا کہ بعد میں اسے مل لوں گا۔ اس کے بعد میں اپنے دوستوں شیر محمد لوند خوڑ اور سردار ظفر کو ملنے چلا گیا ظفر کے گھر سمن آباد پہنچا تو دیکھا کہ منظور بھٹی ہمارے ایک اور قریبی دوست بھی وہاں بیٹھے ہیں لہٰذا اس شام میری ٹوبہ ٹیک سنگھ روانگی ملتوی ہو گئی۔ رات گپوں میں کٹ گئی۔ دیر سے سوئے اور پھر دیر سے اٹھے۔ گاڑی تو اس وقت تک نکل چکی تھی فیصلہ کیا کہ اب بس کے ذریعہ چلا جائے اور سردار ظفر بھی میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا اور ہم بس کے اڈا پر جو اس وقت لاہور ریلوے سٹیشن کے قریب ہوتا تھا پہنچ گئے۔ ہم وہاں پہنچے تو دیکھا کہ رحمت اپنی بائیسکل پر کہیں جا رہا تھا۔ میں نے زور سے آواز دی۔ رحمت' رحمت' رحمت نے مڑ کر دیکھا تو مجھے پایا' سائیکل سے اتر کر واپس آ کر میرے ساتھ خفگی کے انداز میں بولنے لگا کہ میں نے اس کا انتظار ہی نہ کیا اور میں چل دیا حالانکہ اس نے کوئی بات کرنا تھی۔

میں نے کہا بھئی اب کر لو

"وہ بات سڑک پر کرنے والی نہیں ہے۔ ذرا بیٹھ کر کرنے والی ہے" کہنے لگا

"اچھا بھائی یہ ساتھ چائے خانہ میں بیٹھ جاتے ہیں وہاں کر لیتے ہیں" میں نے کہا

Marfat.com

رحمت کہتا ہے کہ یہ تمہارا دوست ساتھ ہے۔ میں نے اس کے سامنے بات نہیں کرنی۔ میں علیحدہ بات کرنا چاہتا ہوں۔ وہ بات ہی ایسی ہے۔

اب میں ذرا حیران ہوا

میں نے ظفر سے کہا کہ وہ ذرا ادھرادھر انتظار کرے اور میں رحمت سے علیحدہ بات کر لیتا ہوں اور ہم ایک چائے خانہ میں بیٹھ گئے۔

رحمت نے تھوڑے سے توقف کے بعد کچھ کہنا چاہا مگر پھر رک گیا۔ یوں دو تین دفعہ وہ بات کرتے کرتے اصل بات پر آکر رک جاتا۔ میں سمجھ گیا کہ کوئی خاص بات ہی کرنا چاہتا ہے۔

لہٰذا میں نے اس کا حوصلہ بڑھایا اور کہا کہ وہ کھل کر بات کرے۔

وہ بات کرنے لگا تو پھر اس کے ساتھ یہی کچھ ہوا اور پھر زار و قطار رونے لگ گیا اور روتے روتے کہنے لگا کہ تم بہت بڑے افسر بن گئے ہو میں تم سے ایک بہت ہی خاص اور ذاتی بات کرنا چاہتا ہوں اور یہ بات صرف میرے اور آپ کے درمیان رہے گی اور تم کسی سے بات نہیں کرو گے۔

میں نے کہا کہ بالکل ٹھیک ہے تم بات تو کرو۔ میں کسی سے کیوں تمہاری بات کروں گا۔

کہنے لگا بلکہ اٹک اٹک کر کہنے لگا کہ میاں صاحب کی بڑی بیٹی بلقیس ہے نا جو بیوہ ہو گئی تھی اس کا دکھ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔ بالکل میری بہنوں کی طرح ہے۔ مجھے اور میرے بھائی کو جس شخص نے ہماری یتیمی میں سہارا دیا ہو اس کی بیٹی کو اس دکھ میں دیکھ کر دل پھٹ جاتا ہے اور ہم کچھ بھی اس کے لئے نہیں کر سکتے اب میرا ماتھا ٹھنکا کہ رحمت کیا بات کرنا چاہتا ہے۔

میں نے نہایت تجسس سے پوچھا کہ یہ بتاؤ بلقیس کا حال کیا ہے۔

کہنے لگا بیچاری کا کیا حال ہو گا۔ ایسی صورت میں جو حال ہو سکتا ہے وہی حال ہے۔ پہلے تو بے چاری کا بہت ہی برا حال ہو گیا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان کچھ سنبھل تو جاتا ہے۔ دو چھوٹی چھوٹی بچیاں ہیں۔ بے چاری ان کو سنبھالتی رہتی ہے۔ بس سمجھو ایک زندہ لاش ہے۔ ابھی ۲۵ سال کی نہیں ہے۔ یہ اتنی بڑی زندگی کیسے گزرے گی۔

میں نے کہا کہ اس کی شادی کیوں نہیں کر دیتے۔

میرا یہ کہنا تھا کہ بے چارہ رحمت پھر زار و قطار رونے لگا۔

Marfat.com

کچھ دیر بعد کہنے لگا کہ یہ بات کہہ دینا آسان ہے کرنا بہت مشکل ہے۔ بیوہ کے لئے چاہے وہ چوہدری ہی کیوں نہ ہو کہاں اچھے رشتے ملتے ہیں۔ ہمارا معاشرہ ہی ایسا ہے اور میاں صاحب تو بہت ہی عزت دار آدمی ہیں۔ وہ اس سلسلہ میں منہ ہی نہیں کھولتے۔ بالکل گم سم رہتے ہیں۔ مجھے پتہ ہے کچھ رشتے آئے ہیں مگر وہ کوئی اتنے اچھے رشتے نہیں ہیں۔ کوئی لالچ سے آتا ہے تو کوئی کسی اور وجہ سے۔ خلوص کا رشتہ نہیں آرہا۔

اب میرے دل میں کچھ پرانی یادوں کے دھندلے صاف ہونے لگے۔ بلقیس کا وہ چہرا جو میں نے ٹوبہ ٹیک سنگھ میں دیکھا تھا۔ بعد میں میری بڑی بہن جس طرح اس کی شرافت' سادگی اور حسن کی تعریف کرتی تھی اس سے جو میرے دل و دماغ میں بلقیس کا ایک تصور بنا تھا وہ تصویر بن کر سامنے آگیا۔ شمسی نے جس طرح اس کے حسن اور جوانی کا ذکر کیا تھا وہ میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا اور پھر جب میں نے اسے اس کے اداس اور اجڑے چہرے کے ساتھ بچیوں کو ساتھ لئے چلتے اور گرتے دیکھا تھا اور میاں صاحب کا عظیم چہرہ بھی یکدم میرے سامنے آگیا۔ بس کیا تھا کہ میرے آنسو رک ہی نہ رہے تھے۔ میری اس گھرانے سے عقیدت ہی نہیں دلی اور روحانی لگاؤ بھی تھا۔ اس وقت میرا پورا روح و قلب یکجا ہو کر مجھے کہہ رہا تھا کہ اس مسئلہ کا ضرور کوئی حل ہونا چاہیے۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ کاش میری ہی شادی بلقیس سے ہو جائے۔ میرے دل میں اس کے لئے بہت سی ان کہی چاہت بھی تھی' ستائش بھی تھی مگر مجھے یہ بات کہنے کا رحمت سے بھی حوصلہ نہ تھا کہ ہمارے اور میاں صاحب کے سماجی مقام میں بہت زیادہ فرق تھا۔ برادری کا بھی فرق تھا۔ وہ ارائیں تھے اور ہم گوجر۔

میں یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ رحمت نے یکدم سب کچھ ہی آسان کر دیا اور میرے اندرونی جذبات کو اپنی زبان بخش دی۔

کہنے لگا سردار تم کیوں بلقیس سے شادی نہیں کر لیتے۔ اب تو تم بہت بڑے افسر بن گئے ہو۔ جوان ہو اور وہ بھی جوان ہے۔ تم سے تو کافی چھوٹی ہے۔

میں نے کہا یار افسری کی بات نہیں ہے۔ شادی وادی کے لئے کچھ اور باتیں بھی تو ہوتی ہیں۔ میں تو غریب سا آدمی ہوں۔ میرے والدین سادہ سے ہیں۔ ہمارا خاندان بہت مختلف ہے۔ میاں صاحب کا داماد ہونا میرے لئے تو بہت بڑی عزت کا مقام ہو گا مگر پتہ نہیں

Marfat.com

میاں صاحب کو یہ بات پسند بھی آئے گی کہ نہیں۔ میرے اندر تو اس بات کو کہنے کہلوانے کی جرات تک بھی نہ ہے۔

کہنے لگا ان باتوں کو چھوڑو۔ اب تو تم اتنے غریب بھی نہیں ہو۔ میں کئی دفعہ تمہارے گاؤں گیا ہوں۔ زمین زیادہ ہے یا کم موجیں تو بہت ہیں اور اب تم افسر بن گئے ہو۔ میرے خیال میں تو یہ جوڑ ملتا ہے۔

میں نے کہا بھائی مجھے تو یہ تجویز بہت ہی زیادہ پسند ہے۔ میرے تو دل کی بات تم نے کہہ ڈالی مگر میاں صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ سے کون بات کریگا۔ میں اپنی بہن کو بھیج سکتا ہوں۔ وہ لاہور ہی میں رہتی ہے مگر اس سے بھی یہ بات نہ ہو سکے گی جب تک پہلے سے راہ ہموار نہ ہو چکی ہو۔

رحمت تم یہ بات کیوں نہیں کرتے؟ میں تیار ہوں

رحمت بے چارہ کہنے لگا یہ تو میں نے یونہی بات کر دی ہے۔ میں وہاں بات نہیں کر سکتا۔ یہ تو ویسے ہی میرے دل میں بہت دفعہ آیا تھا کہ سردار تو گھر کا ہی لڑکا ہے۔ میاں صاحب کے پاس اتنا آنا جانا ہے اور افسر بن گیا ہے تو کیوں نہ یوں ہو جائے۔ تمہیں بھی ایک اچھی پڑھی لکھی بیوی مل جائیگی اور ان کا بھی کام ٹھیک ہو جائیگا۔ تم اب افسر ہو۔ کیا تم کوئی ان پڑھ پینڈو بیوی کرو گے۔

پینڈو وینڈو کی بات نہیں ہے انسان اچھا ہونا چاہیے۔

میں نے کہا رحمت تم گھر میں اچھا موقع دیکھ کر پہلے بیگم صاحبہ سے بات کیوں نہیں کرتے۔ بس یونہی عمومی سی تجویز دے کر دیکھ لو۔ اگر جواب حوصلہ افزاء ہوا تو پھر میاں احمد علی صاحب کے ذریعہ بات چلائیں گے۔ وہ میاں صاحب کے بہت ہی قریبی دوست اور عزیز ہیں اور ہمارے ساتھ بھی وہ بہت زیادہ شفقت کرتے ہیں۔ میری طرف سے تمہیں تمام اختیار ہے۔ جب ذرا بات اور آگے چلے گی تو پھر میں اپنے والدین سے بھی بات کر لوں گا انہوں نے تو کبھی میری بات نہیں ٹالی بلکہ ہر بات میری ہی مانی جاتی ہے۔

اب رحمت ذرا گھبرا سا گیا۔ میں نے کہا کہ اب تم نے بات شروع کی ہے اور تم ہی اسے سرے تک پہنچاؤ گے۔ اب تم کھسک نہیں سکتے۔ مگر وہ بے چارہ گھبرا رہا تھا۔

Marfat.com

اس ساری بات چیت میں بہت وقت صرف ہو گیا تھا اور ہماری بس نکل چکی تھی۔ اس وقت موجودہ دور کی طرح منٹ منٹ بعد بسیں نہیں چلتی تھی۔ کوئی گھنٹے دو گھنٹے کے بعد بس آتی یا چلتی تھی۔ میں نے ظفر سے کہا کہ اب رات لاہور میں ہی گزارتے ہیں۔ آپ سے کوئی ضروری بات بھی کرنی ہے۔ کل ٹوبہ چلیں گے۔ رحمت کو میں نے ظفر کے سمن آباد والی رہائش کا پتہ دے دیا اور کہا کہ اگر کوئی حوصلہ افزاء بات ہو تو وہاں بتا دینا۔ اب یا جب میں ٹوبہ سے واپس آؤں۔ میں ہفتہ عشرہ ادھر یا ٹوبہ ہی میں ہوں۔

اس طرح میں اور ظفر واپس سمن آباد کی طرف چل پڑے اور راستہ میں میں نے اسے رحمت کی تجویز سے آگاہ کیا تو بہت ہی خوش ہوا اور کہنے لگا سردار تمہاری زندگی سنور جائے گی۔ ایسے لوگ کہاں ملتے ہیں۔ روپے پیسے اور جائیداد کی بات نہیں میاں صاحب ایسے شریف کلچرڈ خاندان کہاں ملتے ہیں..... اگر ہاں ہو جائے تو تم یہیں شادی کرنا۔ میں رحمت سے مل کر مزید بات کرتا ہوں۔ شادی کی تیاری بھی میں کروں گا۔ زیادہ خرچ نہ کرنا اور زیادہ دیر بھی نہ کرنا۔ بس فوراً شادی کرو۔

"بھئی ادھر سے تو کوئی خبر مل لینے دو۔ تم پہلے ہی بیبئے میل پر چڑھے فرانے مارنے لگے ہو۔ میں نے رحمت کو تو ہاں کر ہی دی ہے مگر وہ بے چارہ کہاں بات کر سکے گا۔ ابھی صبر کرو"۔ میں نے ظفر کو بریک لگاتے ہوئے کہا۔ ابھی کسی سے بات بھی نہ کرنا۔

راستے میں ہم نے شیر محمد لونڈ خوڑ سے بات کی تو اس کا ردعمل سردار ظفر سے بھی زیادہ مثبت اور اصرار کا تھا۔ منظور بھٹی بھی ہمیں مل گیا۔ وہ تو پاگل ہی ہو گیا اور کہتا ہے کہ ابھی شادی کرو۔ وہ ہمارا ذرا بونگا سا دوست تھا اور ہر بات میں انتہا کو پہنچ جاتا تھا۔

شیر محمد کے ہاں کھانا کھانے کے بعد ہم سمن آباد پہنچے تو ایک نہایت ہی اندوہناک خبر ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ سردار ظفر کے والد اچانک دل کے دورہ سے فوت ہو گئے اور منڈی عثمان والا سے ان کا منشی یہ بری خبر لے کر ظفر کا انتظار کر رہا تھا۔ ہمارے تو ہاتھ کے طوطے اڑ گئے۔

یہ خبر ہم سب کے لئے بہت ہی ناگہانی تھی۔ بڑے سردار صاحب کی صحت بہت اچھی تھی۔ کبھی کوئی شکایت نہ تھی۔ وہ میلوں پیدل چلتے۔ گھوڑ سواری کرتے اور نہایت خوش باش رہتے۔ ہمارا تو کلیجہ ہی باہر نکل آیا اور سب کچھ بھول بھال کر منڈی عثمان والا جو قصور سے قریب ہے کو چل دیئے۔ راستے میں ہم حیران ہی ہوتے رہے کہ خدا کی قدرت کا کمال ہے۔

Marfat.com

اگر ہم ٹوبہ ٹیک سنگھ چلے جاتے تو کسی کو بھی پتہ نہ چلتا کہ ہم کہاں ہیں۔ خاص طور پر ظفر کا کہ ایسے وقت میں سارا خاندان اسے ڈھونڈھ رہا ہوتا..... رحمت کا اچانک مل جانا۔ گفتگو کا طوالت پکڑ جانا اور بس کا نکل جانا۔ عجیب اتفاقات تھے۔ بس ہمیں خاص طور پر ظفر کو اپنے والد کے جنازہ میں شریک ہونا تھا اس لئے اللہ تعالی نے یہ سارے سبب بنا دیئے وگرنہ ساری عمر ہم اپنے آپ کو بھی معاف نہ کر سکتے۔ اللہ کی باتیں اللہ ہی جانتا ہے سبحان اللہ۔

میں اور منظور بھٹی تین دن تک منڈی عثمان والا میں سردار ظفر اور اس کے خاندان کے ساتھ تعزیت میں شامل رہے اور جب ہم رخصت ہونے لگے تو سردار ظفر کے الفاظ تھے

"سردار خدا کرے یہ کام بن جائے اور تم میاں شفیع کے داماد بن جاؤ تو میں اپنے ابا جی کا غم بھول جاؤں گا۔ تمہاری طرف سے اگر کوئی کوتاہی ہوئی تو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔ منظور بھٹی تم ساتھ ساتھ رہو۔ میاں احمد علی کو پکڑو اور سب کچھ ابھی اسی visit میں مکمل کر کے جانا۔ پھر چھٹی نہیں ملتی"

ہماری ٹرین لاہور کے لئے چل رہی تھی اور سردار ظفر یہ الفاظ کہہ رہا تھا۔

میں نے سوچا کتنا مخلص دوست ہے۔ میرے لئے اپنے والد کا غم بھولنے کو تیار ہے۔ اصل میں میرے یہ دوست بھی میاں صاحب کو ملتے رہتے تھے اور ان سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ اور میرے ساتھ بہت زیادہ محبت کرتے تھے۔

Marfat.com

بیاہ کے بندھن آسمانوں پر

منظور بھٹی اور میں ظفروالے گھر لاہور پہنچے تو ملازم نے بتایا کہ رحمت آیا تھا اور دوبارہ آئے گا۔ منظور بھٹی میاں احمد علی صاحب جو نزدیک ہی سمن آباد میں رہتے تھے کے پاس جانا چاہتا تھا مگر میں نے منع کر دیا کہ رحمت کو آ لینے دیں۔ اس کے بعد کسی اور سے بات کریں گے مگر بھٹی کہاں رکنے والا تھا۔ وہ تو ایک بے لگام مست گھوڑا تھا۔ مجھ سے سگریٹ خرید کر لانے کے لئے باہر نکلا اور سیدھا میاں احمد علی صاحب کے گھر پہنچ گیا اور میرے اور بلقیس کے نکاح کو اپنی تجویز بنا کر پیش کر دیا۔ میاں احمد علی صاحب کو تجویز بہت پسند آئی اور بھٹی کے ساتھ میری طرف چل پڑے۔ میاں احمد علی صاحب مرحوم میاں شفیع صاحب کے رشتہ دار ہی نہیں بہت ہی قریبی دوست تھے۔ نہایت جذباتی اور اکھڑ قسم کے آدمی تھے۔ انڈین آرمی میں رہے تھے۔ ان کے انگریز کرنل نے قائداعظم کے خلاف کوئی نازیبا بات کر دی اور میاں صاحب نے اسے ایک ہی مکہ سے ڈھیر کر دیا۔ یوں جیل جانا پڑا اور پاکستان بننے پر رہا ہوئے۔ ان کے سامنے کوئی شخص پاکستان قائداعظم اور مس فاطمہ جناح کے خلاف بات نہیں کر سکتا تھا اور ان کی یہ ادا میاں محمد شفیع کو بہت ہی پسند تھی جو خود بھی بہت ہی جذباتی مسلم لیگی تھے۔ چوہدری محمد ارشد پی۔ ڈی۔ پی کے سیکریٹری جنرل اور ہمارے دوست اب بھی مزے لے لے کر سناتے ہیں کہ میاں محمد شفیع اے۔ ڈی۔ ایم ملتان کی حیثیت سے انہیں مسلم لیگ کے یوتھ ونگ میں کام

Marfat.com

کرنے کے لئے کس طرح پیسے دیتے تھے اور مہینہ کی تمام تر تنخواہ ان طلباء پر خرچ کر ڈالتے جو ۴۷-۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کے لئے کام کر رہے تھے۔ اور اپنا ذاتی خرچہ گھر سے منگواتے۔ مہاجروں کی آمد پر اپنا سرکاری گھر مہاجر کیمپ بنا دیا تھا۔ یوں میاں احمد علی اور میاں شفیع کی دوستی پختہ ہوئی تھی۔

منظور بھٹی ابھی باہر نکلا ہی تھا کہ رحمت آگیا۔

سناؤ رحمت کیا حال ہے؟

کوئی بات آگے چلی

ہاں! میں نے بیگم صاحبہ سے تھوڑی سی بات چھیڑی ہے۔

میں ایکدم سے چوکنا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس وقت تک بلقیس میرے تصورات کی رانی بن چکی تھی اور میری شدید خواہش تھی کہ جلد از جلد ہمارا ملاپ ہو جائے

تو کیا کہا بیگم صاحبہ نے؟

انہوں نے مجھے کہا ہے کہ میں تم سے بات کر کے دیکھ لوں۔ لڑکا تو بہت اچھا ہے۔ اپنا دیکھا بھالا ہے۔ سارا خاندان ہی بہت شریف ہے۔ اب تو وہ افسر بھی بن گیا ہے۔ ہمیں اور کیا چاہیے۔

یہ کہا انہوں نے کہ ہمیں اور کیا چاہیے رحمت؟ میرے تو دل میں لڈو پھوٹنے لگے۔ میں نے سوچا کام بن گیا "ہاں! ہاں! بالکل کہا رحمت کہنے لگا۔

اب تم نہ مکر جانا ورنہ میری پوزیشن بہت خراب ہو جائے گی۔

نہیں رحمت بس اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ شادی کروں گا تو صرف یہیں۔ اب مجھے دنیا کی کوئی طاقت اس فیصلہ سے منحرف نہیں کر سکتی۔

یار رحمت تم نے تو بہت نیکی کی۔ بلقیس تو مجھے ہمیشہ بہت اچھی لگتی تھی۔ تم نے تو کمال کر دیا ہے۔ وہ تو میرے خوابوں کی ملکہ ہے۔

اچھا ایسی اوٹ پٹانگ باتیں مت کرو۔ اب تم مکر نہ جانا۔ باقی میں کر لوں گا۔ میں نے مولوی عبدالعزیز صاحب سے بھی بات کر لی ہے وہ بھی اس تجویز کو پسند کرتے ہیں۔ قدرتی وہ بوریوالہ سے آئے ہوئے تھے۔ میں نے ان کو یونہی اپنی طرف سے کہا تو فوراً مان گئے اور کہنے لگے تم سردار کی بات چلاؤ۔ وہ بھی آپ کی تعریف کر رہے تھے۔ مگر آخری فیصلہ

Marfat.com

میاں صاحب ہی واپس آکر کریں گے لیکن وہ مولوی عبدلعزیز کی بات کو کبھی نہیں ٹالتے۔ بڑی عزت کرتے ہیں ان کی۔

مولوی عبد العزیز میاں صاحب کے سسر تھے۔ فرید کوٹ ریاست میں چیف جسٹس تھے اور نہایت ہی نیک اور وضعدار شخص تھے۔ چہرے پر خوبصورت سفید داڑھی اور سر پر سفید پگڑی باندھتے تھے۔ اہل حدیث سے لگاؤ تھا۔ ان کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی۔ صرف دو بیٹیاں تھی۔ ایک میاں صاحب کی بیگم اور دوسری میاں محمد حنیف کے گھر تھیں ۱۲۵۔ مربعہ اراضی جدی پشتی مالک اور متمول شخص تھے مگر زیادہ تر آمدنی یا تو بیٹیوں کے کام آتی یا پھر نیکی کے کاموں پر صرف ہوتی تھی۔ اپنی ذات پر مولوی صاحب روپیہ پیسہ خرچ کرنا حرام سمجھتے تھے بلکہ بعض لوگ تو انہیں کنجوس کہتے تھے۔ حالانکہ ایسی بات نہ تھی۔ وہ نہایت نیک اور اصولی انسان تھے۔ اپنی تمام آمدن چپکے سے مستحقین میں بانٹ دیتے اور خود سادہ زندگی گزارتے۔

تقسیم کے وقت فرید کوٹ کے راجہ نے لاہور کا فرید کوٹ ہاؤس اور اپنی پاکستان کے اندر رہ جانے والی اراضی ان کے نام کر دی مگر مجال ہے ادھر کا منہ کریں۔ ہمیشہ کہتے لوگ اتنے لٹ پٹ کر آرہے ہیں اور میں یہ جائیداد لے لوں یہ کیسے ہو سکتا ہے اور جب کچھ عزیزوں نے بہت زیادہ اصرار کیا تو فتوی صادر فرمادیا کہ میرے لئے یہ جائیداد حرام ہے۔ پھر سب خاموش ہو گئے۔ انہیں معلوم تھا کہ فتوے کے بعد انہیں کوئی نہیں منا سکتا۔ اسی طرح منٹگمری جسے آجکل ساہیوال کہا جاتا ہے کے بازار میں راجہ حسن اختر صاحب جو اس وقت وہاں ڈپٹی کمشنر تھے اور میاں شفیع صاحب کے دوست تھے نے مولوی صاحب کو ایک دوکان الاٹ کر دی اور وہ دوکان کسی ہندو ساہو کار کی تھی۔ جب مولوی صاحب کو معلوم ہوا کہ وہاں سودی کاروبار ہوتا رہا تھا تو ساری رات اس لئے نفل پڑھ پڑھ کر دعا کرتے رہے کہ خدا کرے وہ دوکان ان کے نام سے کینسل ہو جائے..... اور صبح کو ایسا ہی ہوا۔ درخواست گزاری اور اس دوکان کی جگہ کوئی اور دکان الاٹ ہوگئی۔ مولوی صاحب ہندوستان میں ۴۰ دکانیں چھوڑ کر آئے تھے۔ اس زمانہ میں لوگ کچھ اسی طرح کے تھے۔ جب رحمت نے مولوی صاحب والی بات بتائی تو مجھے معلوم تھا کہ اب کام بن گیا ہے۔

Marfat.com

ابھی ہم بیٹھے یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ میاں احمد علی صاحب بھٹی کے ساتھ آدھمکے اور بھٹی مسکرا رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ بھٹی سے رہا نہ گیا اور میرے منع کرنے کے باوجود احمد علی صاحب کے پاس پہنچ گیا۔

میاں احمد علی صاحب نہایت منہ پھٹ آدمی تھے۔ آتے ہی کہتے ہیں بس تیاری کرو۔ میاں شفیع کو منانا میرا کام ہے۔ یہ تو بہت ہی اچھا ہوا۔ بھلا مجھے یہ بات کیوں نہ سوجھی۔ بس جی تیاری کریں۔

میں نے کہا میاں صاحب کیا کیا تیاری کرنا ہے

بس ایک سوٹ چاہیے۔ ایسے موقع پر ذرا اچھے کپڑے پہننا۔ کپڑوں کے معاملہ میں تم بہت پھسڈی ہو۔ اور ہاں! لڑکی کے لئے ایک جوڑا کپڑوں کا اور ایک انگوٹھی بھی۔

"تو لڑکی کی ماں کو کچھ نہیں دینا میاں صاحب" بھٹی نے کہا

ضرورت تو کوئی نہیں۔ دینا ہے تو دے دینا

لڑکی کی بہنوں کے لئے؟ رحمت نے کہا

"وہ بھی لے لیں گے" میاں احمد علی صاحب نے چارج لیتے ہوئے کہا

اور پھر یکدم کہنے لگے بس تم مجھ پر چھوڑو۔ میں سب کچھ کر لوں گا۔ یہ کام بزرگوں کے کرنے کے ہوتے ہیں میں تم لوگوں کا بزرگ ہی تو ہوں۔ پیسے بھی بعد میں لے لوں گا۔ سب انتظام ہو جائے گا۔ بس تیاری کرو جلدی کرو۔

میں نے کہا میاں صاحب میں تو ابھی تیار ہوں۔ مولوی کو بلاؤ ابھی چلتے ہیں

اچھا اچھا اتنی جلدی بھی نہیں۔ ذرا صبر کرو۔ میاں صاحب کو آلینے دو۔ ہو سکتا ہے وہ جلدی ہی آجائیں کیونکہ انہیں جرمنی تو صرف تین دن سرکاری کام ہے۔ پھر انہیں لندن اپنے علاج کے لئے جانا ہے جاتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ اب میں زیادہ دیر اور نہیں رہ سکتا۔ مجھے انجم سارہ بہت یاد آتی ہیں۔ اس بلقیس نے تو میری کمر ہی توڑ دی ہے۔ بتاؤ احمد علی میں کیا کروں۔

یہ کہتے کہتے میاں احمد علی زار و قطار رونے لگے۔ ذرا سنبھل کر کہتے ہیں کہ اب ان کے سب دکھ دور ہو جائیں گے۔ بیٹا تم نے بہت اچھا کیا۔ وہ تو تمہیں بہت پسند کرتے ہیں۔ ہمیشہ تمہاری تعریف کرتے ہیں۔ سنیں گے تو بہت خوش ہوں گے۔

Marfat.com

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔ مجھے تو ان کا داماد بننا ایک بہت بڑا اعزاز لگتا ہے۔ خدا کرے اب یہ ہو جائے انجم سائرہ کو میں اپنی بیٹیاں سمجھ کر پالوں گا۔ بس احمد علی صاحب اللہ کا نام لے کر یہ کام کروا ہی دیں۔ کیا میں اب مطمئن ہو جاؤں اور اپنے ماں باپ سے بات کر لوں"

"ہاں! بالکل بات کو لو۔ یہ اب میری ذمہ داری ہے" میاں احمد علی نے کہا

وہیں ساتھ ہی مارکیٹ تھی۔ وہ مجھے ایک درزی کے پاس لے گئے اور پیمائش دلوائی کہ دولہا میاں کا ایک خوبصورت سوٹ بنانا ہے۔ میں نے ہزار انکار کیا مگر مجال ہے احمد علی صاحب اپنی ضد سے ہٹ جائیں۔ میں نے کہا میرے پاس بہت سوٹ ہیں۔ نہیں مانے۔ کہتے ہیں بس نیا بنانا ہے۔ دوسری چیزوں کا کہنے لگے اب وہ سب میں خود لے لوں گا۔ چاہے دولہا کی ہوں یا دلہن کی۔ تم والدین سے بات کرو۔

میں نے کہا میں اپنی بہن کو لے کر کل ہی گاؤں چلا جاؤں گا اور بات کر لوں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔ مگر مجھے ڈیوٹی پر پہنچنا ہے۔ ہو سکتا ہے پھر میں وہیں سے ایبٹ آباد چلا جاؤں۔

آپ کو پورا پورا اختیار ہے۔ Go Ahead

اسی وقت میں کرشن نگر اپنی بہن اور بہنوئی کو ملنے چلا گیا اور سارا قصہ سنا ڈالا۔ میری بہن اور بلقیس بہت اچھی سہیلیاں تھیں۔ وہ میری بات سن کر بہت خوش ہوئی۔ کہنے لگی: میرے دل میں یہ بات بہت دفعہ آئی تھی مگر میں نے تم سے ڈر کر کبھی نہ کی۔

کیوں؟

کہ میرا بھائی یہ نہ سوچے کہ اس کے لئے ایک بیوہ کی تجویز اس کی اپنی بہن کر رہی ہے۔ مگر مجھے بلقیس ہمیشہ بہت اچھی لگتی تھی۔ میرے بھائی وہ تو ہزار کنواریوں سے بہتر ہے۔ بالکل سادہ اور بہت ہی خوبصورت بس ایک سادھو بندہ ہے۔ پتہ نہیں خدا کو کیا منظور تھا۔ اس کے ساتھ ایسا ہونا تو نہیں چاہیے تھا۔ تم ضرور اس کے ساتھ شادی کرو۔ میرے بھائی ہمیشہ خوش رہو گے۔ مجھے تو میرے بھائی کی خوشی چاہیے۔ دنیا میں ایسے شریف لوگ نہیں ملتے۔ خدا کرے وہ لوگ مان جائیں۔

میں جاؤں بیگم شفیع کے پاس؟

چلے جانا مگر پہلے ماں سے تو بات کر لو۔

وہ میں نے کی ہوئی ہے؟

Marfat.com

وہ کیسے؟ تمہیں کیسے معلوم تھا؟

بس ایسے ہی میں نے ماں سے بہت دفعہ بات کی۔ وہ ہمیشہ کہتی ہیں جو سردار فیصلہ کرے گا ہم تو وہی کریں گے۔ میری تو خواہش ہے کہ اپنے ماموں کے گھر کرے مگر وہ جہاں خوش ہو وہاں کرلے۔ اس لئے ماں تو مانی ہی مانی ہوئی ہے

ابا جی؟

وہ وہی کریں گے جو ماں کہے گی۔

"خیر تم میرے ساتھ گاؤں چلو اور وہاں یہ بات فائنل کرو"۔ میں نے کہا

میرا بہنوئی نور محمد بھی سن کر بہت خوش ہوا اور وہ بھی ہمارے ساتھ گاؤں چل پڑا۔ والدین نے فوراً ہاں کر دی اور میں اگلے دن سیدھا ایبٹ آباد کے لئے چل دیا۔

یہاں تک بات کیسے پہنچی اور حالات نے کیسے کیسے کروٹ لی میں اب بھی سوچتا ہوں تو کچھ سمجھ نہیں آتی۔ کچھ عجیب و غریب اتفاقات تھے جو ہوتے ہی گئے۔ رحمت کے ساتھ گفتگو میں دیری نے ہمیں سردار ظفر کے والد کی تجہیز و تکفین پر کس طرح بر وقت پہنچا دیا۔ بات سمجھنے کی ہے اور نہ سمجھانے کی اور پھر اسی وقت کی کوکھ سے میرے اور بلقیس کے ایک ہو جانے کی کیا کیا صورتیں بنیں۔ اس سارے گورکھ دھندے کو وہی جان سکتا ہے۔ انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ شاید اسی لئے کہتے ہیں کہ شادی بیاہ کے بندھنوں کے مقدس مضبوط فیصلے زمین پر نہیں آسمانوں پر ہوتے ہیں۔ ہمارے ساتھ کچھ اسی طرح کا معاملہ ہوا۔

Marfat.com

جھٹ منگنی پٹ بیاہ

ٹوبہ سے ایبٹ آباد پہنچے ابھی دو تین دن ہی ہوئے ہوں گے کہ برادری کے مختلف لوگوں کے فون پر فون آنے شروع ہو گئے کہ سنا ہے کہ تم میاں شفیع کی بیوہ بیٹی سے شادی کر رہے ہو۔ میرا جواب سنے بغیر ہی اپنا پر زور مشورہ داغ دیتے کہ ایسا بالکل نہ کرنا۔ ایک تو یہ اپنی برادری نہ ہے اور دوسرے تمہیں کیا کمی ہے۔ ہم تمہارا رشتہ کرواتے ہیں۔ اچھے سے اچھا برادری میں کنوارہ اور پیارا رشتہ موجود ہے اور ساتھ ہی چند نام بھی گنوا دیتے جن میں برادری کے بڑے بڑے زمینداروں اور ٹھیکیداروں کے نام ہوتے۔ میں حیران تھا کہ ان لوگوں کو اب میں یکایک یاد کیسے آگیا ہوں۔۔ یہ سب لوگ اس وقت کہاں تھے جب میں زندہ رہنے کے لئے دن رات مزدوری کرتا تھا اور تعلیم کی منازل طے کر رہا تھا۔ اس وقت انہیں برادری کیوں یاد نہ آئی۔ بہرصورت ہر شخص اپنے نقطہ نگاہ پر زور دے رہا تھا۔ میری کسی بات کا اثر ان پر نہیں ہوتا تھا۔ میرے ہر جواب پر وہ کوئی نہ کوئی تاویل نکال لیتے۔ میں نے کہا کہ برادری کا ہمارے دین میں اس طرح کا تصور قطعاً نہ ہے۔ فوراً جواب آتا کہ قرآن میں پہچان کے لئے قبیلوں کا ذکر ہے۔ اپنا قبیلہ اپنا ہی ہوتا ہے۔ میں کہتا میرا قبیلہ اسلام ہے اور اس لحاظ سے سب برابر ہیں۔ کسی سے میں نے کہہ دیا کہ بیوہ سے شادی تو سنت رسول ہے۔ اس نے یہاں تک کہہ ڈالا کہ تم تو مرتد ہو رسالت کا دعوی کر رہے ہو۔ تم تو رسول نہیں ہو۔ اس

Marfat.com

شخص نے مجھے مرتے دم تک معاف نہ کیا اور برادری کے لوگوں میں مسلسل پراپیگنڈہ کرتا رہا کہ سردار بالکل مرتد ہو گیا ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔ اس شخص کی کمینگی پر مجھے بہت غصہ آتا مگر میں ضبط کرتا رہا اور آخر وہ پاگل کتے کے کاٹنے سے پاگل ہو کر مرا۔ میں چونکہ بہت ہی چھوٹا انسان ہوں مجھے اپنی والدہ کی تربیت اور خیالات کے بالکل خلاف اس کا اس طرح پاگل ہو کر مرنا بہت اچھا لگا..... مجھے ایسا قطعاً نہیں سوچنا چاہئے تھا مگر میں نے سوچا اور اب مجھے اپنے اس سوچ پر ندامت ہے

اسی طرح بہت سے زیادہ قریبی لوگوں نے آکر تنگ کرنا شروع کر دیا اور ایک صاحب نے تو یہاں تک کہہ ڈالا کہ ہاں ہم لوگ تمہیں دو بیٹیاں جہیز میں تو نہیں دے سکتے۔ سن کر میں آگ بھگولا ضرور ہوا مگر غصہ کا قطعاً اظہار نہ کیا کہ ہمارا رشتہ بہت ہی قریبی تھا۔ صرف اتنا کہا کہ وہ بچیاں تو میرے لئے باعث رحمت ہیں۔ اسی لئے تو میں بلقیس سے شادی کر رہا ہوں۔ یوں اور بھی بہت سی باتیں ہیں۔ بہت سے تو اتنے گھٹیا قسم کے بچولے تھے کہ مجھے زرعی زمین اور مکانات کے لالچ بھی دینے سے گریز نہ کرتے۔ مجھے بہت غصہ آتا کہ ہمارے لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ ان کی سوچ کتنی مادی اور گھٹیا ہے۔ اصول نہ آئیڈیل سب دولت کی دیوی کے پجاری نظر آئے اور ادھر میاں شفیع ایسا درویش کہ جس کی ساری عمر نیکی اور ایثار سے بھری پڑی تھی۔ علم و حلم اس کے گھر کے طواف کرتے تو حسن اخلاق مجسم پیکر بنے اس کا غلام اور ادھر یہ دنیا دار لوگ۔ مزے کی بات ہے کہ میاں شفیع کو بھی اللہ نے بہت کچھ دے رکھا تھا مگر عجز و اخلاق ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ مجھے تو ایسے ہی لوگ پسند تھے اور میرے فیصلے میں مزید پختگی آتی گئی۔ میں ہمیشہ سے ذہنی طور پر جہیز کی لعنت کے خلاف تھا۔ ایک تو یہ ہندوانہ رسم تھی دوسرے اس میں انسانی گراوٹ کی بدترین جھلک پائی جاتی تھی۔ یہ باتیں سن کر مجھے جہیز وغیرہ سے مزید نفرت ہو گئی۔ اسی طرح مجھے بیاہ شادی کی رسومات پر فضول خرچی بھی بہت ہی ناپسند تھی اور مزے کی بات ہے کہ اس پر بہترین تحریر میں نے کوڈھیڑھ حسوالاں میں پڑھی تھی اور وہ ایک ہندو کی لکھی ہوئی تھی جس نے اصلاح معاشرہ کی کوئی بہت بڑی تحریک چلا رکھی تھی۔ اس کا نام تو مجھے بھول گیا مگر اس کا اثر میرے ذہن پر آج تک کندہ ہے۔

ابھی میں ان مراحل سے گزر ہی رہا تھا کہ ایک دن مجھے میری والدہ کا پیغام ملا کہ شادی طے کرنے میں جلدی نہ کرنا۔ یہاں بہت لوگ آرہے ہیں اور مجھے اور تمہارے ابا کو بہت تنگ

Marfat.com

کر رہے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ وہی لوگ میرے والدین کو مجھ سے بھی زیادہ دق کر رہے ہوں گے۔ میں نے پختہ فیصلہ کر لیا تھا کہ شادی بلقیس ہی سے کرنی ہے۔ سچی بات ہے کہ مجھ پر دل ہی دل میں بلقیس سے محبت کا بھوت سوار ہو چکا تھا۔ میں مزاجاً نہایت ہی جذباتی انسان ہوں اور جذبات ہی کو زندگی سمجھتا ہوں۔ عقل و خرد بہت اچھی چیز ہے مگر ذرا طرفی اور ادھوری سی چیز ہے۔ وہ زندگی کو چند سطور پر تو چلا سکتی ہے مگر وہ زندگی کا کل قطعاً نہیں ہے۔ وہ اصل میں زندگی ہے ہی نہیں۔ کار زار حیات میں سب کچھ جذبات کا انجن کرتا ہے۔ زندگی کو حرکت دیتا ہے۔ عقل تو صرف بریک کا کام دیتی ہے جو کبھی کبھی کام آتی ہے۔ ہر وقت بریک لگائے رکھو تو گاڑی کیسے چلے گی۔

والدین خاص طور پر والدہ سے مجھے بے پناہ محبت اور عقیدت تھی۔ ان کا کہا میں ٹال بھی نہ سکتا تھا۔ میں نے سوچا قبل اس کے کہ والدہ کا کوئی حکم ہی آجائے اور میرے لئے فیصلہ کرنا محال ہو جائے کیوں نہ معاملہ کو مکمل ہی کر لیا جائے۔ اس وقت تو والدین کی باقاعدہ اجازت موجود ہے۔ دراصل اس وقت میں تھوڑا سا چالاکی سے کام لے رہا تھا۔ اللہ مجھے معاف کرے کہ میں نے تھوڑا سا والدہ کو جل دینے کا سوچا۔ انہیں میری اس چالاکی کا کبھی بھی مرتے دم تک پتہ نہ چلا اور مجھ سے بہت ہی زیادہ خوش تھیں مگر آج لکھتے ہوئے میں اس بات کو افشاء کر رہا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے گڑ گڑا کر معافی کا خواستگار ہوں۔ میں والدہ کو دھوکہ نہیں دینا چاہتا تھا مگر میری منہ زور خواہش ضرور مجھ پر اس وقت غالب تھی اور ایک طرح کی پرکاری کر کے انہیں اندھیرے میں ضرور رکھا۔ اللہ مجھے معاف کرے۔

اس صورت حال کے مدنظر میں نے منظور بھٹی سے لاہور میں رابطہ کیا اور کہا کہ میاں احمد علی صاحب کو ساتھ لے کر فوراً ایبٹ آباد آجائیں۔ بھٹی نے مجھے بتایا کہ میاں شفیع صاحب لندن نہیں گئے اور جرمنی سے واپس لاہور آچکے ہیں اور میاں احمد علی صاحب نے بتایا ہے کہ معاملہ درست چل رہا ہے۔ میں ہر روز میاں احمد علی سے شیزان میں ملتا ہوں۔ اور خوب ان کی خاطر تواضع کر رہا ہوں۔

میں نے کہا کہ تم اگلے چوبیس گھنٹوں میں احمد علی صاحب کو لے کر ایبٹ آباد آؤ۔ مجھے ابھی چھٹی نہیں مل رہی۔ بس تم انہیں لے آؤ۔ کوئی ضروری بات کرنا ہے۔ ذرا ایمرجنسی ہے۔

Marfat.com

منظور بھٹی ایمرجنسی کی تفصیل جاننا چاہتا تھا۔ مگر میں نے کہا بک بک مت کرو۔ میں جیسے کہتا ہوں ویسے کرو اور فوراً پہنچ جاؤ۔

.....اور اگلی شام کو منظور بھٹی اور میاں احمد علی میرے ریسٹ ہاؤس ایبٹ آباد میں موجود تھے۔ میاں احمد علی صاحب نے ایک عجیب بات کی۔ کہتے ہیں کہ میں نے میاں صاحب سے بات کی تو وہ بہت خوش ہوئے مگر کچھ سوچنے لگے اور پھر کہتے ہیں کہ احمد علی بھئی کیا یہ سردار سے کچھ زیادتی نہیں ہوگی۔ ٹھیک ہے بلقیس میری بیٹی ہے۔ میرا لختِ جگر ہے مگر سردار ابھی بالکل نوجوان ہے۔ ابھی ابھی سروس میں آیا ہے۔ ہر آدمی کے اپنے خواب ہوتے ہیں۔ کچھ زیادتی سی نظر آتی ہے کہ میں اپنی خود غرضی کے لئے اس کے ارمانوں کو برباد کر دوں۔ اب تو وہ جذبات میں آکر شادی کر لے اور بعد میں معاملہ خراب ہو جائے۔ ذرا سوچ لو۔ "یہ ذرا ٹیڑھا معاملہ ہے"

اور پھر کہنے لگے کہ میاں صاحب تو مانے کھڑے ہیں۔ اب فیصلہ مجھے کرنا ہے

مجھے معلوم تھا کہ میاں احمد علی صاحب کو اچھے کھانے کھانے کا بہت شوق ہے۔ میں نے سوچا انہیں مونا لیزا میں لے جاکر مزیدار کھانا کھلاتے ہیں اور باقی بات وہیں کرتے ہیں۔ مونا لیزا ریسٹورینٹ ایبٹ آباد میں نیا نیا کھلا تھا اور اس کی سروس بہت عمدہ تھی۔

راستے میں میں سوچتا رہا کہ میاں شفیع کتنا اچھا انسان ہے۔ ہر کسی کے لئے اچھا ہی سوچتا ہے۔ پہلے بھی میرے لئے اچھا سوچتا تھا اور اب بھی اچھا سوچ رہا ہے۔ کتنا اچھا انسان ہے۔ رشتہ ایسے ہی لوگوں سے ہونا چاہیے اور دوسری طرف وہ لوگ تھے جو انسانی لطیف جذبوں اور خیالات سے بالکل عاری محض زمین جائیداد ہی کا سوچ سکتے تھے۔ مجھے میاں صاحب کی اور بھی زیادہ قدر ہوگئی اور میرا ارادہ پختہ ہی نہیں بلکہ شدت اختیار کرنے لگا اور میرا دل کرے کہ ابھی کسی جہاز میں بیٹھیں اور لاہور پہنچ کر سب کام فائنل کر لیں مگر دل کی باتیں اور ہوتی ہیں اور عملی زندگی کی اور۔ بہرصورت میں نے میاں احمد علی صاحب کو اعلیٰ خوراک کے دوران خوب نقشے میں کھینچا اور قائل رکھا کہ میرا اور بلقیس کا نکاح فوراً سے بیشتر ہو جانا چاہیے۔ اس دوران انہوں نے بتایا کہ کچھ بدبخت قسم کے رشتہ دار ادھر بھی اس رشتہ کی مخالفت کر رہے ہیں۔

Marfat.com

"تو کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ اس معاملہ کو فوراً فائنل کر لیں۔ بس نکاح ہو جائے۔ باقی معاملات بعد میں ہوتے رہیں گے"۔ میں نے کہا

میاں احمد علی نے کہا "میرے بس میں ہو تو ابھی کر دوں۔ جا کر میاں صاحب سے بات کرتے ہیں۔ پھر دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے۔ فکر نہ کریں میں انہیں منالوں گا۔ آپ تیار رہیں"

"میں نے تو کوئی تیاری نہیں کرنی۔ میری تیاری بھی آپ ہی نے کرنی ہے میاں صاحب"۔ میں نے کہا۔

میں نے سب تیاری کر لی ہے۔ سوٹ تیار ہے۔ بس اک انگوٹھی لینی ہے۔ آپ لاہور آجائیں۔ پورے ہفتے کی چھٹی لے لیں۔

میں نے کہا آپ کل شام تک مجھے ٹیلیفون پر بتا دیں۔ میں فوراً چلا آؤں گا۔ بہتر ہے کہ ۱۰۔جون (دس جون) کی تاریخ نکاح کے لئے مقرر کر لیں۔

ہماری یہ بات ۳۱ مئی کی شام بلکہ رات مونالیزا ریسٹورینٹ ایبٹ آباد میں ہوئی۔

اگلی صبح میاں احمد علی اور منظور بھٹی لاہور چل دیئے اور میں دفتر۔ شام تک کوئی ٹیلیفون نہ آیا۔

اگلے دن بھی فون نہ آیا تو مجھے تشویش ہوئی کہ شاید کوئی گڑ بڑ ہو گئی ہے۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی اور کلیم آپریٹر نے کہا کہ لاہور بات کریں۔

اب میرا دل دھک دھک کر رہا ہے اور میں میاں احمد علی کی آواز کا منتظر ہوں کہ یکدم میاں محمد شفیع کی نہایت ہی پیاری سی آواز آئی۔

سردار! کیسے ہو بیٹا

اور میری آواز نہیں نکل رہی۔ بڑی مشکل سے میں کہہ سکا کہ میں بالکل ٹھیک ہوں اور مارے شرم کے مجھے پسینہ آگیا۔

مجھ سے اور کچھ تو نہ بن سکا یونہی میں نے پوچھ لیا کہ میاں احمد علی صاحب کیسے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ میاں صاحب میری گھبراہٹ کو سمجھ گئے آخر انہوں نے دنیا دیکھی تھی۔

Marfat.com

ہاں بیٹا ٹھیک ہیں۔ تمہارا پیغام انہوں نے مجھے دے دیا ہے۔ تمہیں جلدی کا ہے کی ہے؟

تم جیسے کہتے ہو کر لیں گے مگر کیا تم نے اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے یا ایسے ہی جیسے تم نے میڈیکل سے آرٹس کا معاملہ کر لیا تھا۔

میاں صاحب نہایت پیار سے کہنے لگے۔

اب مجھے ان کے اپنے الفاظ سے فوراً ایک کارگر دلیل مل گئی اور میں نے کہا

"سر! میرا وہ فیصلہ آخر درست ہی نکلا۔ میں آج اسی وجہ سے پولیس کی اعلیٰ سروس میں ہوں"

"ہاں! یہ بات تو درست ہے۔ تم فیصلے اچھے کرتے ہو۔ اب ساری عمر لوگوں کے فیصلے ہی تو تمہیں کرنے ہیں۔ پولیس کا کام بہت نازک ہوتا ہے۔ ہر لمحہ آپ کو فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ آپ حسینؓ کے ساتھ ہیں یا یزید کے ساتھ۔ بیٹا یزیدی قوتوں کا کبھی ساتھ نہ دینا۔ ہمیشہ انصاف کرنا۔ اچھا اب تم دل پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ کہ تمہیں یہ رشتہ واقعی پسند ہے۔ جھوٹ مت بولنا"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے

"میاں صاحب آپ کیا بات کر رہے ہیں۔ مجھے آپ سے الفت ہی نہیں عقیدت ہے۔ میں ایسی ویسی بات کیسے کر سکتا ہوں"

اس سے آگے میرے الفاظ جواب دے گئے اور میرا گلہ رندھ گیا۔

میں نے فون بند کر دیا اور مزید بات نہ کر سکا۔

تھوڑی دیر بعد میاں احمد علی صاحب کا فون آیا اور کہتے ہیں کہ چھٹی لیکر لاہور آجاؤ۔

میاں صاحب نے کہا ہے کہ جو سردار کہے وہی ہو گا۔

اب مجھے خوشی سے نیند نہ آئے۔ پتہ نہیں میں رات کو کب سویا مگر صبح ہی صبح میں اٹھ گیا۔ ریسٹ ہاؤس سے چھٹی کی درخواست لکھ کر بھیج دی اور بس پر بیٹھ کر لاہور چل دیا۔

اسی رات ہم میاں احمد علی صاحب سے ملے اور تمام تفاصیل طے کر لیں۔ تیاری کوئی خاص کرنا نہ تھی۔ سوٹ سل چکا تھا۔ میاں صاحب نے صرف ایک ساڑھی اور ایک

Marfat.com

انگوٹھی بلقیس کے لئے خریدی۔ باقی سب کچھ کہنے لگے بعد میں کر لیں گے ابھی تو صرف نکاح ہی کرنا ہے اور ان تمام امور پر =/۳۶۴ روپے خرچ آئے جو میں نے احمد علی صاحب کے انکار کے باوجود انہیں زبردستی تھما دیئے۔ نکاح والے دن مٹھائی وغیرہ کا انتظام انہوں نے اپنی جیب سے کیا۔

والدین کو لاہور لانے کے لئے میں نے اپنی بہن کو گاؤں بھیج دیا۔ وہ انہیں اور میرے چچا کو ساتھ لیکر کرشن نگر اپنے گھر پہنچ گئیں۔ میں سردار ظفر کی کوٹھی سمن آباد میں ٹھہرا۔ میں اب والدہ سے کچھ گھبرا رہا تھا کہ کہیں پوچھیں نہ کہ یہ تم نے کیا کیا؟ میں نے تو تمہیں ذرا رُکنے کو کہا تھا مگر میری حیرانی کی انتہا نہ رہی جب پہنچتے ہی میری ماں نے کہا۔ بیٹا یہ بہت اچھا کیا کہ جلد شادی کر رہے ہو۔ لوگ تو ہماری جان کھا گئے تھے۔ تمہیں نہیں معلوم ہمیں ان لوگوں نے کتنا تنگ کیا۔ میں تو لسی روٹی دے دے کر تنگ آ گئی تھی۔ شکر ہے اب تو نہیں آئیں گے۔ میں نے سوچا کہ اب کیا بتاؤں کہ سب کچھ کیسے ہوا اور منہ زور دل نے کیسے اپنی بات منوالی۔ ایک مختصر سی بارات لیکر میں میاں محمد شفیع کی کوٹھی ۸-اے کلب روڈ ۱۰-جون کی شام کو پہنچا۔ جہاں ان کے تمام عزیز و اقارب اور احباب موجود تھے۔ میری طرف سے میرے اعزا کے علاوہ میرے چند ایک بھائیوں ایسے دوست سردار ظفر' منظور بھٹی اور شیر محمد خان بھی موجود تھے۔ شمسی ان دنوں لاہور میں موجود نہ تھے وگرنہ ان کے بغیر بارات کیسے مکمل ہو سکتی تھی اور میری طرف سے میاں احمد علی صاحب بھی شامل برات تھے کہ سارا انتظام ہی انکا تھا۔

مولوی صاحب نے نکاح پڑھا لیا۔ دونوں طرف سے ہاں ہو چکی۔ فارموں پر دولہا دلہن اور گواہان کے دستخط ہو چکے تو تب جا کر مجھے یقین آیا کہ واقعی میں اور بلقیس ایک ہو چکے ہیں وگرنہ بے یقینی سی بے یقینی تھی کہ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

نکاح کے بعد نہایت ہی پر تکلف کھانا ہوا۔ کچھ لوگ چلے گئے۔ ہمارے دوست احباب باہر لان میں بیٹھ گئے تو پھر دولہا دلہن کے ملاپ کی تقریب ہوئی جس کے لئے میں نہایت بے تاب تھا۔

کمرہ میں داخل ہوا تو دیکھا کہ لڑکیوں کے جھرمٹ میں ایک حور پری دلہن کا لباس پہنے شرمائی شرمائی ہوئی سی چھوئی موئی ہو کر بیٹھی ہوئی ہے اور مجھے اس کے ساتھ لے جا کر بٹھا دیا گیا۔ میرا دل کرے کہ میں اس پری زاد کو چھوؤں' پکڑ لوں بلکہ موقع ملے تو بھنبھوڑ لوں مگر یہ

Marfat.com

موقعہ کہاں۔ لڑکیوں نے اسے خوب گھیرے میں لے رکھا تھا اور میرے پہنچنے پر طرح طرح کی بولیاں بولنے لگیں کوئی کچھ کہے اور کوئی کچھ۔ میں کچھ نروس بھی تھا۔ میری طرف سے عورتوں یا لڑکیوں کا کوئی جھرمٹ نہ تھا جو ان کا جواب دے۔ میں نے خود ہی کچھ کوشش کی مگر بات نہ بن سکی۔ پھر مجھے ایک سکیم سوجھی۔ میں نے اپنی دونوں سالیوں کو قریب بلا کر کہا کہ اب تم میری بہنیں ہونا۔ انہوں نے کہا کہ ہاں ہم تمہاری بہنیں ہیں۔

تو پھر میرا ساتھ دو اور ان لڑکیوں کو جواب دو۔

خیر وہ تو خاموش ہوگئیں اور دوسری لڑکیوں کو غیر ضروری جارحیت سے منع کرنے لگیں۔ پھر میں نے چند ایک اور لڑکیوں کو اپنی پارٹی بنا لیا۔ کسی نے کہا مجھے پیسے دو تو میں بہن بنوں گی اور کسی نے کہا سوٹ دو گے تو بہن بنوں گی وغیرہ وغیرہ اور یوں میں نے آدھی سے زیادہ لڑکیوں کو اپنے ساتھ ملا لیا اور باقی خاموش ہوگئیں۔

.....اور میری بلقیس کے منہ سے نکلا

تم بڑے چالاک ہو

ہم نے تمہیں پا لیا یہی ہماری سب سے بڑی چالاکی اور خوش قسمتی ہے۔

اس کے بعد وہ بولی اور نہ ہی میں کچھ بول سکا۔

بلقیس کی والدہ بہنوں اور دیگر رشتہ دار خواتین نے مجھے کافی پیسے بھی دیئے جو میں اپنی سوٹ کی جیب میں رکھتا رہا حتی کہ ساری جیبیں بھر گئیں جو بعد میں میرے دوستوں نے کم از کم آدھے تو ہتھیا لئے اور دعوتوں پر اڑا دیئے۔

یہ تقریب کوئی ایک گھنٹہ یا اس سے بھی کم رہی۔ میرا دل کرے کہ یہ چلتی ہی رہے اور میں بلقیس کے ساتھ بیٹھا ہی رہوں مگر اسے ختم ہونا تھا۔ مجھے میاں احمد علی باہر لے آئے۔ اس وقت تک بہت سے مہمان جا چکے تھے۔ اب میرا دل کرے کہ میں وہیں رہوں۔ میرے لئے ساری کائنات بدل چکی تھی۔ ہر رنگ نیا رنگ تھا اور ہر رنگ میں ترنگ تھا۔ اور جب میاں احمد علی صاحب نے ہماری طرف سے رخصت مانگ ہی لی تو مجھے بہت دکھ سا ہوا۔

گھڑی دیکھی تو رات کا ایک بج چکا تھا۔ میں نے سوچا شاید میرے لئے وقت تھم چکا تھا۔

میں اپنے والدین اور بہن بہنوئی کو کرشن نگر چھوڑنے گیا تو میری بہن نے میری ماں سے ایک عجیب بات کی "ماں! اب تمہارا بیٹا تمہارے ہاتھ سے گیا۔ بلقیس کو ایسے دیدے پھاڑ

Marfat.com

پھاڑ کر دیکھ رہا تھا کہ جیسے اسے کچا ہی کھانا چاہتا ہو۔ ماں مجھے تو وہاں بہت شرمندگی ہو رہی تھی۔ سب لڑکیاں کہہ رہی تھیں کہ یہ تو بلقیس پر لٹو ہو گیا ہے۔ کچھ تو اسے شرم کرنی چاہیے تھی۔ میں تو سر نیچا کر کے وہاں سے کھسک آئی۔ سب کی شادیاں ہوتی ہیں۔ کوئی ایسے تو نہیں کرتا۔ اپنی نہیں تو دوسروں ہی کا خیال کرنا چاہیے"

اور یہ کہہ کر رونے لگی۔ مجھے غصہ بھی آیا اور ترس بھی مگر میں کچھ کہہ نہ سکتا تھا۔ میں نے سوچا شاید بڑی بہن یکدم حسد کا شکار ہو گئی ہے مگر وہ ایسی تو نہ تھی۔ ضرور مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔

میں نے جلدی سے ماں سے اجازت لی اور سمن آباد چل دیا۔ راستے میں اپنی بہن کی باتوں پر غور کرتا رہا اور میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ میں اپنے جذبات کو کنٹرول نہ کر سکا اور میرے جذبات اتنے زیادہ بھرپور تھے کہ چھپائے نہ چھپ سکے اور کمال کی بات ہے کہ جذبات ہمیشہ ہی میرے ساتھ رہے اور اب جبکہ اسے بچھڑے چھ سال ہو چکے ہیں میرے ان جذبات اور اس دن کے جذبات میں ذرا بھر فرق نہیں آیا۔ شاید کچھ بڑھے ہی ہوں گے۔ بلقیس محض ایک مجسمہ حسن و جمال ہی نہ تھی بلکہ ایک بہت ہی نیک اور خوبصورت دل والی عورت تھی جس کا ساتھ کسی ناکارہ سے ناکارہ پتھر کو بھی پارس بنا دیتا۔ وہ ایک دلربا شریک حیات ہی نہیں وہ ایک حوصلہ مند اور راضی برضا مضبوط ڈھارس تھی۔ حسن اخلاق کی مکمل تصویر' حرص و ہوس سے بے خبر جسے حسن کا کوئی گھمنڈ تھا اور نہ اپنے خاوند کے اختیارات کا۔ میری ملازمت کی اچھی شہرت کا اگر کوئی کریڈٹ ہے تو وہ بلقیس اور اس کے ماں باپ کی تربیت کا ہے کہ کسی چیز پر ذرا بھر شک ہوا کہ اس میں رزق حرام کی ملاوٹ ہو سکتی ہے تو اپنے بچوں کے حلق سے نیچے نہ اترنے دیا۔ یہی کیفیت میرے والدین کی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب فیصلے کہیں اور ہی ہوتے تھے۔ میرا اس میں کوئی کمال نہ تھا۔ ما ابری نفسی امارۃ۔ ..... میں بہت برا تھا میرے ارد گرد کے اچھوں نے مجھے بھی شاید اچھا بنا دیا ..... اللہ تعالیٰ میرے گناہ معاف کرے۔

Marfat.com

سودا دل کا

نکاح سے اگلے دن میں ظفر کی کار لے کر سب سے پہلے کرشن نگر پہنچا۔ میرے والدین اور چچا ٹوبہ روانگی کے لئے تیار تھے میں نے ماں سے کہا کہ اگر ایک دن اور رک جائیں تو آج کسی وقت بلقیس کو ان کی قدم بوسی کے لئے لے کر آتا ہوں۔ کہنے لگیں گھر پر بہت کام ہے۔ تم اسے گاؤں لے کر آنا۔ مگر ابھی نہیں رخصتی کے بعد۔ میں کچھ تیاری بھی کر لوں گی۔ مجھے پتہ ہی نہ تھا کہ ماؤں کو کچھ تیاری بھی کرنا ہوتی ہے۔ میں ان معاملات میں کچھ پیدل ہی واقع ہوا ہوں۔ میری زندگی ہی ایسی گزری تھی اور خدا کے فضل سے اب تک پیدل ہوں۔

میں نے ریلوے سٹیشن پر ٹوبہ والوں کو سوار کروایا اور سیدھا انار کلی بازار چلا گیا۔ وہاں کی بہترین کھلونوں کی دوکان پر گیا اور انجم سائرہ کے لئے بہت سارے بہترین قیمتی کھلونے خریدے۔ یہ فیصلہ میں نے خود ہی کیا تھا اور میرے دل کی آواز تھی۔ ان سستے وقتوں میں بھی میں نے تقریباً سات سو روپیہ کے کھلونے خریدے حالانکہ میری شادی پر صرف =/۳۶۴ روپے خرچ آئے تھے۔ کھلونوں سے کار بھری۔ اندازہ لگایا کہ اب میاں صاحب اپنے دفتر جا چکے ہوں گے اور ۸۔اے کلب روڈ پہنچ گیا۔ مولوی عبدالعزیز باہر برامدے میں بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے۔ اتنی دیر سے ملنے کے باوجود مجھے معلوم نہ تھا کہ مولوی صاحب سگریٹ بھی پیتے ہیں۔ شاید کبھی کبھی پیتے تھے۔

Marfat.com

میں مولوی صاحب کو بے حد ادب سے ملا۔ وہ بھی بہت ہی زیادہ محبت سے ملے۔ مجھے پکڑ کر بچوں کی طرح پیار کرتے رہے۔ اور بے انتہا والہانہ خوشی کا اظہار کیا۔ کہتے ہیں مجھے بلقی (بلقیس) بہت ہی عزیز ہے۔ بیٹا تم اسے خوش رکھنا۔ بلقی اچھی بچی ہے وہ بھی تمہیں بہت خوش رکھے گی۔ میں نے اسے بھی یہ بات سمجھائی ہے..... میں بالکل خاموش رہا۔ پھر انہوں نے اپنی بیٹی یعنی میری خوشدامن کو بھی بلالیا بلکہ ان کے بلانے کا انداز بھی کمال مشفقانہ تھا۔

جلی جلی (جمیلہ) دیکھو کون آیا ہے؟ ذرا جلدی ادھر آؤ

ہماری خوشدامن بھی مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ میری بلائیں لیں اور کہا کہ باہر برآمدے میں کیوں بیٹھے ہو۔ اندر ڈرائنگ روم میں بیٹھو۔

ہاں چلو بیٹا اندر بیٹھتے ہیں مولوی صاحب نے کہا۔

میں نے کہا میں کار میں سے کچھ نکال لاؤں۔ اور میں کھلونے نکالنے لگا۔ کھلونے اتنے زیادہ تھے کہ مجھے اٹھانے کے لیے رحمت کی مدد لینا پڑی۔ رحمت بھی بہت خوش ہوا کہ تم نے بہت ہی اچھا کیا۔

پھر کیا تھا سارے گھر میں خوشی کی اک لہر پھیل گئی۔

مولوی صاحب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

میری ساس نے کہا بیٹا اتنی تکلیف کیوں کی

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اپنی ننھی ننھی بیٹیوں کے لئے کھلونے بھی نہ خریدوں؟ غیر شعوری طور پر مجھ سے یہ الفاظ نکلے۔

میں نے دیکھا کہ وہاں کی تو سب کایا ہی پلٹ گئی۔ شاید وہ اتنی مکمل اپنائیت اور الفت کی توقع نہیں رکھتے تھے۔ ایسا معلوم ہوا کہ یک لخت ان کے بہت سے وسوسے رفو چکر ہو گئے۔ پتہ نہیں اپنے دکھ میں انہوں نے کیا کیا انجانے خوف اپنے دل میں پال رکھے تھے۔ مجھے تھوڑا بہت صورتحال کا احساس ضرور تھا مگر ادراک سے زیادہ میرا خلوص مجھے اس طرف لے کر آیا تھا۔ جو میں کر رہا تھا میرے دل کی آواز تھی اور مجھے انجم سائرہ اپنی اولاد سے بھی زیادہ پیاری لگ رہی تھیں۔ لگتی رہیں اور لگتی ہیں..... باقی حقیقت وہ جانیں یا اللہ جانے۔ میرے دل میں آج تک وہی جذبات ہیں جو اس دن تھے۔ وہ اپنے اپنے گھروں میں خوش ہیں اور مجھے اس

Marfat.com

سے راحت ملتی رہتی ہے۔ میں اپنے سارے دامادوں کے متعلق بہت ہی خوش قسمت رہا ہوں مگر یہ باتیں ذرا بعد میں۔

میرے لائے ہوئے کھلونوں سے ڈرائنگ روم بھر گیا۔ مولوی صاحب انجم سائرہ کو لینے چلے گئے۔ اور ہماری خوشدامن رسوئی کے لئے یہ کہہ کر چلی گئیں کہ دوپہر کا کھانا یہیں کھانا ہے۔ یہی تو میں چاہتا تھا بلکہ مجھے تو رات کو بھی کھلاتے تو مجھے قطعاً اعتراض نہ تھا۔

انجم سائرہ ڈرائنگ روم میں آئیں اور ایک اجنبی کو دیکھ کر ذرا جھنپی مگر اتنے سارے کھلونے دیکھ کر ان میں گم ہوگئیں اور کھیلنے میں مگن ہوگئیں۔ مولوی صاحب نے کہا: پتہ ہے یہ کھلونے تمہارے لئے کون لایا ہے تمہارے بھائی جان سردار لائے ہیں۔ میں بھائی جان کا لفظ سنتا رہا مگر مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا مگر میں نے اس وقت مولوی صاحب کے ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے خاموشی اختیار کر لی۔ مجھے تو بچیوں کی خوشی اور پیار درکار تھا۔ خدا کا کرنا وہ جلد ہی مجھ سے گھل مل سی گئیں۔ بعد میں میری سالیاں بھی آگئیں اور باتیں وغیرہ کرنے لگیں۔ مولوی صاحب کی موجودگی میں مذاق کرنے سے تو انہوں نے گریز کیا مگر انجم سائرہ کو بار بار مجھے بھائی جان کہنے کی پٹی پڑھاتی رہیں۔

اب مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے اپنی سالیوں سے کہا کہ وہ ان معصوموں کو کیوں غلط باتیں بتا رہی ہیں وہ تو میری بیٹیاں ہیں۔ اگر انہیں بیٹیاں نہ سمجھتا تو میں بلقیس سے شادی ہی کیوں کرتا۔ میں نے فیصلہ یونہی نہیں کیا۔ بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ مجھے پورے جہان کی پرواہ نہ ہے۔ آپ میری قطعاً پرواہ نہ کریں۔ ان معصوموں کی نفسیات پر چرکے لگانا ہمارا کام نہیں ہے۔ آخر بلقیس کو ان کی ماں ہی رہنا ہے اور مجھے باپ۔ اب جب ہمارا ایسا رشتہ ہو ہی گیا ہے تو پھر دوری کیوں۔

اس بات پر آمنہ نے میرے ذرا قریب آکر کہا (شاید مولوی صاحب کے ڈر سے)
"بڑے فلمی ڈائیلاگ بول رہے ہیں بھائی جان"

"نہیں ایسی بات نہیں۔ خدا کی قسم یہ میرے دل کی بات ہے۔ میں نے زندگی بھر کا سودا کیا ہے۔ انشاء اللہ ایسے ہی نبھاؤں گا۔ ایسا ہی کروں گا"۔

Marfat.com

یہ سن کر آمنہ بالکل خاموش ہو گئی۔ میں نے دیکھا کہ وہ بہت ہی سنجیدہ ہو چکی ہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسوں جھلک رہے تھے۔ پتہ نہیں اس کے ذہن میں کیا کیا خیال آ رہے تھے اور وہ یکدم اٹھی اور مجھ سے کہا

"اچھا میں امی سے بات کرتی ہوں"

اور کمرے سے نکل گئی۔ فوراً ہی نجمہ بھی چلی گئی مگر انجم۔ سائرہ خوب کھلونوں میں مگن کھیلتی رہیں آمنہ نجمہ کا تو بعد میں مجھے کچھ پتہ ہی نہ چلا کہ کہاں گم ہو گئیں مگر بیگم شفیع بھی کافی دیر ادھر نہ آئیں اب میں حیران تھا کہ آمنہ نے پتہ نہیں اپنی امی سے کیا بات کی ہے۔ میں نے کوئی غلط بات تو خیر کی ہی نہ تھی مگر پھر بھی میں ذرا پریشان سا ہو گیا۔ شاید یہ وقت ہی ایسا ہوتا ہے۔

اتنے میں سائرہ کی چیخ نکلی اور وہ بہت زور زور سے رونے لگی۔

ہوا یہ کہ کسی کھلونا سے اسے چوٹ لگ گئی اور تھوڑا سا اس کا خون نکل آیا۔ میں نے اور مولوی صاحب نے اسے بہلانے کی بہت کوشش کی مگر وہ چپ ہی نہ ہو۔

دیکھا تو بلقیس دروازہ پر بھاگ کر آ گئی اور وہیں رک گئی۔ شاید مجھے دیکھ کر کچھ جھینپ ہی گئی۔ مگر مولوی صاحب نے اپنی بزرگی سے کمال کام لیا۔

"آجاؤ بیٹا۔ شرماؤ مت۔ یہ سائرہ کو ذرا سنبھالو۔ چپ نہیں ہو رہی۔ یہ سروار ہے۔ تمہارے میاں اب ان سے مت شرماؤ۔ یہ تو شرح کا معاملہ ہے۔ اب تم دونوں ایک ہو۔ چلو دونوں بچوں کو سنبھالو میں ذرا نماز پڑھ آتا ہوں"

میں نے گھڑی دیکھی تو اس وقت کسی نماز کا وقت نہ تھا۔ بس یہ تو ان کی حکمت تھی جو سفید بالوں نے انہیں ودیعت کر دی تھی۔

میں نے دل میں کہا کہ خدا کرے مولوی صاحب سارا دن ہی نماز پڑھتے رہیں اور ہم باتیں کرتے رہیں۔

بلقیس نے سائرہ کو سنبھالا اور مزے کی بات ہے وہ فوراً چپ ہو گئی۔ میں نے بھی موقع غنیمت سمجھا اور سائرہ کو توتلی آواز سے پچکارنے لگا اور کھلونوں کو برا بھلا کہنے لگا

Marfat.com

سائرہ نے نہایت معصومیت سے کہا کہ مجھے انجم نے مارا ہے۔ اسے مارو۔ انجم کی طرف دیکھا ہی تھا تو وہ ٹپ ٹپ رونے لگی کہ سائرہ جھوٹ کہہ رہی ہے۔ خیر بلقیس نے دونوں کو چپ کرا ہی لیا بلکہ کھیلنے میں لگا دیا۔ خدا نے ماں کو شاید اس عظیم آرٹ کے ساتھ پیدا کیا ہے۔

میں نے موقعہ کا فائدا اٹھاتے ہوئے بلقیس سے باتیں کرنے کی کوشش کی اور اس وقت واقعی میں فلمی ڈائیلاگ ہی بول رہا تھا یا کوشش کر رہا تھا کیونکہ میں بے حد نروس تھا۔

مجھے اور تو کچھ سمجھ نہ آیا میں نے اس کی خوبصورتی کی تعریف شروع کر دی۔ میں نے کہیں پڑھ رکھا تھا کہ عورتیں اپنے حسن کی تعریف بہت پسند کرتی ہیں۔

میں بے تکا سا بولتا گیا۔ وہ سنتی رہی اور شرماتی رہی مگر خاموش رہی۔

کچھ دیر بعد مجھے محسوس ہوا کہ وہ برا نہیں منا رہی اور شاید خوش ہو رہی ہے لیکن صحیح پتہ نہیں کہ اس کے ذہن میں کیا کیا آرہا تھا۔ اور سچی بات ہے کہ مجھے آج تک ۴۳ سال کے بعد بھی معلوم نہیں کہ وہ اس وقت کیا سوچ رہی تھی۔

میں ادھر ادھر کی ہانکتا رہا اور وہ بولے ہی نہ بلکہ اپنا سر گھٹنوں میں چھپالیا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں مولوی صاحب ہی نہ آجائیں اور میں بلقیس کو چھونے سے بھی گھبراتا تھا۔ دل تو بہت چاہتا تھا کہ اس چھوئی موئی کو چھوؤں مگر بے حد نروس تھا۔

بچیاں کھیلتی رہیں۔ میں اوٹ پٹانگ بولتا رہا اور بلقیس چپ سادھے بیٹھی رہی۔ عجیب کیفیت تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ شاید کائنات کی تمام حرکت ہی بند ہو گئی ہے۔ مجھے تو زمین کی حرکت بند ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ تمام طرف خاموشی ہی خاموشی تھی جیسے اس گھر میں کوئی رہتا ہی نہ ہو چرند پرند بھی اس وقت خاموش تھے۔ میں مزید نروس ہو گیا۔

مجھے خواتین سے Deal کرنے کا شاید طریقہ ہی نہ آتا تھا۔ میری ساری زندگی ہی جدوجہد اور روزگار کے جھنجھٹ میں گزری تھی اور میرا سارا علم محض کتابی تھا۔ کتاب زندگی سے مکمل ناواقف و نادان میں مزید نروس ہو گیا۔ دیکھا تو مجھے پنکھے کے باوجود سخت پسینہ آرہا تھا اور بس یونہی میرے منہ سے نکل گیا۔

''بلقیس تم اتنی اچھی اور حسین ہو۔ تم نے مجھ ایسے بور آدمی سے شادی پر رضا مندی ظاہر کر کے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ میں ہمیشہ.....''

Marfat.com

ابھی میں اور کچھ کہہ نہ سکا تھا کہ ایک نہایت ہی نحیف سی آواز آئی "احسان تو آپ کا ہے کہ آپ نے مجھ بیوہ سے شادی کرنا پسند کی"

اور آواز خاموش ہو گئی۔ بلقیس نے اپنا سر اٹھایا اور نہ کچھ اور بولی۔

"نہیں بلقیس ایسا مت کہو۔ بلکہ سوچو بھی مت۔ مجھے تم جیسی خوبصورت اور خوب سیرت بیوی کہاں مل سکتی تھی۔ ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں ایک ہو۔ چراغ لیکر ڈھونڈھنے سے تمہاری حسینہ نہیں ملتی"

"چھوڑو جی کسی نے دو سال میں پوچھا تک نہ۔ رشتے ضرور آتے تھے مگر بس ایسے ویسے ہی آتے تھے۔ تم پہلے آدمی ہو جو اس طرح کہہ رہے ہو۔ مجھے سب پتہ چل جاتا تھا۔ کسی کو بچیوں پر اعتراض تھا تو کسی کو کسی اور چیز پر۔ دنیا نے تو اباجی اور امی کی زندگی حرام کر دی تھی۔ مجھے تو اباجی کا غم کھائے جا رہا تھا۔ اب وہ بہت خوش ہیں۔ خدا تمہارا بھلا کرے"

اور پھر سسکیاں ہی سسکیاں تھیں۔

اور سچی بات ہے میرے بھی آنسو نکل گئے۔

اور پھر چپکے سے بلقیس اٹھ کر چلی گئی

انجم اور سائرہ میرے ساتھ کھیلتی رہیں بلکہ خوب کھیلیں۔ سائرہ کو میں نے اپنے پیٹ پر لٹالیا اور وہیں سو گئی۔

اتنے میں مولوی صاحب بھی آگئے اور مجھے دیکھ کر کہتے ہیں

"بیٹا کمال ہے۔ تم تو واقعی اسے اصلی باپ کا پیار دے رہے ہو مگر ہمارا سب کا فیصلہ ہے کہ ان بچیوں کو ان کے نانا نانی اپنی اولاد سمجھ کر پالیں گے۔ شفیع سے میں نے پھر بات کی ہے مگر وہ کہتا ہے کہ بس میں نے اپنے دل کا سب سے عزیز ٹکڑا سردار کو دے دیا ہے۔ اب اور تقاضا نہ کرے۔ میں انجم سائرہ سے دور نہیں رہ سکتا۔ سردار بہت اچھا بچہ ہے۔ اگر اصرار کرے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ ہم یہ بات بھی اس کی مان لیں گے لیکن اس سے کہیں کہ زیادہ بہتر ہے وہ اس پر اصرار نہ کرے۔ شفیع تم سے بات کرنے سے کتراتا ہے۔ تم بیٹا میری ہی بات مان لو"۔

Marfat.com

مجھے پوری صورت حال کا ادراک ہو گیا اور میں نے مولوی صاحب کی بات مان لی اور دل میں فیصلہ کر لیا کہ آئندہ حالات کے مطابق دیکھ لیں گے۔

دوپہر کا کھانا چنا گیا تو بلقیس کے علاوہ گھر کے تمام افراد موجود تھے۔ کھانا اچھا تھا مگر پھر بھی مزا نہیں آ رہا تھا۔ میاں صاحب کی موجودگی میں میں ویسے ہی بہت شرما رہا تھا۔ جلدی جلدی کھانا کھایا اور سمن آباد ظفر کے پاس پہنچ گیا۔

ظفر نے دوستوں کے لئے شام کو چھوٹی سی دعوت کا اہتمام کر رکھا تھا اور اس کا نام ہمارے نکاح کے حوالہ سے میری دعوت ولیمہ رکھ دی گئی حالانکہ اس میں دونوں خاندانوں کی کوئی نمائندگی نہ تھی۔

شکر ہے جلدی سے دعوت ختم ہوئی تو ظفر کہنے لگا کہ کیا بات ہے تم ذرا خاموش خاموش سے ہو۔ سب کچھ ٹھیک تو ہے۔

میں نے کہا بھائی سب ٹھیک ہے بلکہ بلقیس تو بہت ہی خوش ہے اور پھر میں نے اس کو تمام دن کی روئیداد سنا ڈالی۔

ظفر نے کہا بھائی اس میں پریشان ہونے والی کیا بات ہے۔ ہماری بھابھی تو بہت اچھی اور سچی خاتون ہے کہ اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ اس کے لئے کوئی خاص رشتے آ ہی نہیں رہے تھے اوئے کتے منحوس اس سے زیادہ اچھی کیا کسی کو کوئی بیوی مل سکتی ہے۔ خبردار اس سے اب کوئی اور بات کی۔

"نہیں یار یہ بات نہیں ہے۔ میں تو اس لئے پریشان ہوں کہ وہ بیچاری اتنی اچھی ہے کہ اب میں سوچتا ہوں کہ میں واقعی اس کے قابل بھی ہوں یا نہیں۔ اس کی بچیاں ادھر رہیں گی اور وہ میرے پاس تو وہ بیچاری تقسیم ہو کر رہ جائیگی۔ اس کی محبت لازماً بٹ جائیگی۔ میں پریشان نہیں۔ اس کا پرستار بن کر سوچ رہا ہوں۔ ذرا کذب نہیں۔ ذرا مکر نہیں۔ کیا خوبصورت چیز ہے" میں نے ظفر سے دل کی بات کہہ کر بوجھ ہلکا کیا۔

ظفر نے کہا "تم ایسے کرو۔ تم بھابھی کو کسی نہ کسی طرح فوراً اپنے ساتھ لے جاؤ اور بچیوں کی بحث میں مت پڑو۔ خاص طور پر جب میاں صاحب نے کہلوا دیا ہے۔ باقی مسئلے جوں جوں تم لوگوں کی انڈر سٹینڈنگ بڑھے گی توں توں حل ہوتے جائیں گے۔ ان باتوں کو بھابھی پر چھوڑ دو"..... مجھے ظفر کی یہ تجویز بہت پسند آئی۔ بلکہ میرے ذہن پر اس کا بھوت سوار

Marfat.com

ہو گیا کہ کس طرح بلقیس کو فوراً اسے پشتر لے کر ایبٹ آباد پہنچوں۔ میں نے سوچا کہ جو کچھ دن کو ہوا ہے اس کے بعد وہ میری یہ بات ضرور مان جائیں گے۔

اگلے دن میں نے صبح صبح جا کر ۱۳۔ جون دوپہر کی فلائٹ سے لاہور سے اسلام آباد کے لئے پی۔ آئی۔ اے کے دو ٹکٹ اپنے اور بلقیس کے نام خریدے اور سیدھا ۸۔اے کلب روڈ پہنچ گیا۔ شکر ہے میاں صاحب دفتر جا چکے تھے اور میں نے ٹکٹ بلقیس کے حوالے کر دیئے اور کہا کہ فوراً اپنے گھر چلنے کی تیاری کر لو۔ اب میں تمہارے بغیر ایک پل علیحدہ نہیں رہ سکتا۔

بلقیس کی پریشانی دیدنی تھی اور میں نہایت ڈرامائی انداز میں یہ کہہ کر چل دیا کہ شام کو آؤں گا۔ مجھے ضروری کام ہے۔

حالانکہ مجھے کوئی کام نہ تھا۔ میں نے ایسا صرف اس لئے کیا کہ وہ اپنی فیملی کانفرنس کر لیں۔ جو صورتحال میں نے پیدا کر دی تھی مجھے یقین تھا کہ رخصتی کے علاوہ ان کے پاس کوئی چارہ کار نہ تھا۔ شام کو یہی فیصلہ سنا گیا اور مجھے صرف میاں صاحب سے حجاب تھا شکر وہ اس وقت گھر پر نہ تھے۔ میری سالیوں نے بہت شور مچایا کہ ہم نے تو بہت تیاری کرنی تھی۔ یہ کرنا تھا۔ وہ کرنا تھا بھائی جان آپ تو بہت ظالم ہیں۔ آخر پولیس والے ہی نکلے وغیرہ وغیرہ۔ مگر میں نے تمام سنی ان سنی کر دی اور فوراً وہاں سے چل دیا کہ کل صبح ساڑھے ۱۲ بجے بلقیس کو لینے آؤں گا تیار رہے۔

میں نے اپنی ساس کے منہ سے "جو آپ کی مرضی" سنتے ہی بھاگنے کی راہ نکالی۔ کہ کہیں کوئی تبدیلی واقع نہ ہو جائے۔

Marfat.com

بلقیس اور میں

۱۲ جون ۱۹۶۵ء کو ٹکٹ پہنچانے کے بعد میں اس شام اور رات بہت دیر تک ظفر کے گھر سے باہر رہا تاکہ میرے سسرال والے رخصتی کے متعلق ذہن بدلیں تو بھی مجھ سے رابطہ قائم نہ کر سکیں۔ مگر شکر ہے ایسا کوئی سندیسہ یا عندیہ ادھر سے نہ آیا۔ میں سمجھ گیا کہ سب معاملہ ٹھیک ہے۔

اگلے دن میں دن کے ساڑھے بارہ بجے ۸۔اے کلب روڈ پہنچا تو بہت ہی عمدہ لنچ میرا انتظار کر رہا تھا سب لوگ گھر پر تھے۔ بلقیس تھوڑے سے سامان کے ساتھ تیار تھی۔ کھانا کھایا اور سب لوگ مجھے اور بلقیس کو ایئرپورٹ اپنی نیک دعاؤں اور تمناؤں کے ساتھ چھوڑنے آئے۔ اندر داخل ہونے لگے تو نہایت غیر متوقع طور پر مجھے میاں صاحب کی آنکھوں میں کچھ ڈھلکتے آنسو دکھائی دیئے جن کا میرے دل کی اتھاہ گہرائیوں پر اثر ہوا۔ میں کچھ کہہ تو نہ سکا مگر میں ان کے تمام جذبات اور خدشات سمجھ گیا۔ باپ اور وہ بھی میاں صاحب ایسا رقیق القلب باپ۔ مجھے سب سمجھ آ گئی مگر میں نے تو پہلے ہی فیصلہ کر رکھا تھا کہ اب اس شخص کو کوئی مزید دکھ نہیں پہنچنا چاہیے۔ کم از کم میری طرف سے تو ایسا کبھی اور کسی صورت نہیں ہونا چاہیے۔

Marfat.com

میں یہ تمام خیالات لئے جہاز میں سوار ہوا ساتھ بلقیس تھی۔ شرمائی سی۔ چھوئی موئی سی۔ گھبرائی سی بلکہ ہراساں ہراساں۔ ان دنوں صرف فوکر جہاز ہی چلتا تھا اور بعض دفعہ ہوا میں خوب ہچکولے کھاتا تھا۔ جون کی سخت گرمی کا موسم۔ جہاز اڑا اور خوب ہچکولے کھانے لگا۔ میں نے دیکھا کہ بلقیس بہت ڈر رہی ہے۔ یہاں تک کہ کانپنے لگی۔ میں کچھ حیران ہوا اور پوچھا کہ ڈر لگ رہا ہے۔

ہاں

کیوں؟

میں کبھی جہاز پر نہیں بیٹھی مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔

یہ کہہ کر اس نے مجھے زور سے پکڑ لیا اور میں نے بھی اسے اپنے مضبوط بازوؤں سے جکڑ کر ساتھ لگا لیا مارے خوف کے اسے کچھ معلوم نہ تھا کہ اس طرح ہم کتنے قریب آ گئے تھے اور مجھے جہاز کے ہچکولے بہت ہی اچھے لگ رہے تھے۔

جب شام تین ساڑھے تین بجے راولپنڈی ایئر پورٹ پر پہنچے تو بلقیس کی جان میں جان آئی مگر اس اڑان نے ہمارے بہت سے فاصلے کم کر دیئے تھے۔ میں حیران تھا کہ اتنے بڑے باپ کی بیٹی ہونے کے باوجود وہ کبھی جہاز میں سوار نہ ہوئی تھی۔ اصل میں میاں صاحب کے گھر کا ماحول کافی قدامت پسند تھا۔ خواتین برقع پہنتی تھیں اور سفر کا ایک خاص اہتمام ہوتا تھا۔ یہ مجھ حقیر کے ذمہ آیا تھا کہ کچھ وقت گزرنے کے بعد ان کے ہاں کچھ جدیدیت کو متعارف کراؤں۔ سب سے پہلے تو بلقیس کے برقعہ کی جگہ ایک ذرا سی دبیز چادر آئی اور پھر دوپٹہ اور پھر یہی سب کا لباس ٹھہرا۔

راولپنڈی پہنچ کر میں نے ایک ٹیکسی کار کرایہ پر لی اور سیدھے ایبٹ آباد سدھار گئے۔ دو اڑھائی گھنٹے کا پر فضا اور پر پیچ پہاڑی بل کھاتا راستہ تھا مگر میری بہار تو میرے ساتھ کار کے اندر تھی۔ میں اس گل پری کو دیکھتا ہی رہا اور وہ پہاڑی مناظر کو۔ ایبٹ آباد پہنچے تو یوں لگا کہ شاید دس منٹ میں پہنچ گئے ہیں۔ ریسٹ ہاؤس کے ملازمین نے صاحب کو بیگم صاحبہ کے ساتھ دیکھا تو قصہ یوسف زلیخا بن گیا۔ وہ دیکھتے ہی رہ گئے۔ وہاں یوسف کے نظارہ نے چاقو چلائے تھے تو یہاں زلیخا کی باری تھی۔ اس کے علاوہ ملازمین کی حیرانی کی وجہ بیگم کا اچانک اور بلا اطلاع آنا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ صاحب ابھی کنوارہ داکیلا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی

Marfat.com

شور و غوغا ہوئے بغیر ڈھول ڈھمکے سے بالکل خالی شادی ہو جائے۔ بہر صورت ان کے دیدے دیدنی تھے۔ بھاگے دوڑے اور جلدی سے سامان اٹھا کر کمرہ میں لگا دیا۔

میں نے سوچا اب ہم بالکل تخلیہ میں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ میں جانوں اور بلقیس اتنے میں فون کی گھنٹی بجی اور دوسری طرف میرے ایس۔پی حاجی حبیب الرحمن بنفس نفیس کہہ رہے تھے کہ بھئی یہ کیا ہمیں بتایا تک نہیں اور دلہن لے آئے۔ ہمیں معلوم ہوتا تو تم لوگوں کے استقبال کی تیاری کرتے۔ پہلے سے ہار لے کر کھڑے ہوتے۔ پولیس بینڈ ہوتا۔ یہ تم نے کیا کیا۔ بہر صورت ہم لوگ ابھی آ رہے ہیں..... اور ہمارا سارا پروگرام کرکرا ہو کر رہ گیا۔

حاجی صاحب کا گھر قریب ہی تھا۔ میاں بیوی چند منٹوں میں وہاں تھے۔ مبارک باد اور مٹھائی چلی۔ چائے بھی آ گئی اور یوں ایک گھنٹہ برباد ہو گیا۔

حاجی صاحب رخصت ہوئے ہی تھے تو عجب خاں ڈی۔ ایس۔ پی آن پہنچے اور کھانا بھجوانے پر اصرار کرنے لگے۔ بڑی مشکل سے انہیں اگلے دن پر ٹالا۔

یوں اور بھی کچھ لوگ آ دھمکے جو اس صورت حال میں کوئی اتنے زیادہ پسندیدہ محسوس نہ ہو رہے تھے..... میں نے جلدی جلدی انہیں فارغ کیا۔ باورچی زین کو اچھی سی مرغی' پلاؤ اور دال پکانے کو کہا اور کمرہ میں چلا گیا۔

دیکھا تو بلقیس ذرا ستا رہی تھی۔ شاید تھک گئی تھی۔ کمرہ میں دو چارپائیاں بچھی تھی اور درمیان میں ایک چھوٹی سی میز پڑی تھی۔ وہ میز نکال کر میں نے اپنی چارپائی ذرا قریب کر لی۔ ایسے حالات میں اور کچھ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ میرے لئے کوئی بڑا پلنگ تیار کرنے والا تھا اور نہ میں نے اس وقت یہ نخرے وغیرہ دیکھے تھے۔ ہم غریبوں کے ہاں ایسے رواج کہاں بلکہ مجھے تو کسی بات کا علم تھا ہی نہیں۔ روحانی' سماجی نہ جسمانی کہ ایسے موقعوں پر کیا کرتے ہیں اور کیا کیا درکار ہوتا ہے..... بس حسن کو نیند میں دیکھ کر ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدن ہو کر رہ گیا اور نہ معلوم مجھے کس وقت نیند آ گئی۔ بے چارہ تھکا ہارا جسم اور ذہن کیا کرتا کہ پچھلے چند دنوں میں جس رفتار سے جو کچھ ہوا تھا اس کے بعد تخلیہ ملتے ہی تلافی پر اتر آیا ہو۔

میں گہری نیند سے صرف اس وقت اٹھا جب بلقیس مارے خوف کے کانپتی کانپتی مجھے اٹھا رہی تھی۔ مجھے کچھ سمجھ نہ آیا میں ہڑبڑا کر اٹھا اور بلقیس کا رنگ پیلا زرد پایا۔

کیا بات ہے؟

Marfat.com

بلقیس سے بات نہ ہوئی۔ وہ صرف باہر والی کھڑکی کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔

..... میں سمجھ گیا

"اوہو! میں تمہیں بتانا بھول گیا۔ یہاں رات کو اکثر گیدڑ آجاتے ہیں اور بھونکنا شروع کر دیتے ہیں۔ ریسٹ ہاؤس کے ساتھ ہی ایک بہت بڑا نالا گزرتا ہے اس میں غول کے غول بھیڑیے رہتے ہیں ڈرنے کی ضرورت نہ ہے"

یہ تو ان گیدڑوں کا کمال تھا کہ مجھے جگا ہی دیا اور بلقیس کو ڈرا بھی دیا۔ وہ بے چاری سمجھی کہ شاید یہاں کوئی جنگلی شیر چیتے آگئے ہیں۔ مگر اس ڈرنے سب کام ہی کر دیا۔ میں نے اس حسن لاثانی کو گلے سے لگا لگا کر اس کا خوف ختم کر دیا اور اپنا بنالیا۔ مکمل طور پر اپنا۔ ہر طرح سے اپنا اور ہم یک جان دو قالب بن گئے۔ جس کے لئے بہت سوں کو بہت زیادہ وقت لگتا ہے۔ شاید فطرت اپنی راہیں تراش رہی تھی۔ اس کے اپنے طور طریقے ہیں اور سب کچھ نہایت فطری انداز میں آگے بڑھتا گیا۔

کچھ دیر بعد ہم دونوں کو سخت بھوک محسوس ہوئی۔ دیکھا تو رات کے دو بجے تھے۔ میں باورچی خانہ کی طرف بھاگا کہ دیکھوں کہ ملازم ہیں بھی یا نہیں مگر وہ سب تو وہیں بالکل چاک و چوبند حکم کے منتظر کھڑے تھے کہ دولہا دلہن کی خوب خدمت کر کے انعام کے مستحق ٹھہریں۔ واقعی وہ انعام کے مستحق تھے کہ اس دوران مجھے میری آرزوؤں کی جنت مل چکی تھی اور میں مست خراماں تھا۔ اس رات جس مزے کا کھانا کھایا پھر کبھی میسر نہ ہوا اور نہ ہی ویسی رات پھر آئی۔ بات کھانے اور رات کی نہ تھی۔ بات تھی تو دلی مراد ملنے کی تھی۔ ..... ایسی مراد کہ جس نے ۲۷ سالہ رفاقت میں کبھی نامراد نہ کیا اور پھر یکدم مفارقت بن گئی کہ ہزار چراغ لے کر ڈھونڈھتا رہتا ہوں مگر ہر طرف نامرادی اور اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔

Marfat.com

رفاقت ہی سے ہے رفیق حیات

آپ کو یہ جان کر حیرانی ہوگی بلکہ ہو سکتا ہے کہ آپ کو مایوسی ہو کہ میری زندگی کے آئندہ ۲۷ سالوں میں ایک قسم کی یکسانیت آگئی۔ میری نجی زندگی کے تمام زیرو بم ختم ہو کر رہ گئے۔ کشمکش رہی نہ کوشش۔ اس زندگی کو آپ جنت کہہ لیں یا بوریت۔ میری ذاتی زندگی کا تمام تر چارج مکمل طور پر بلقیس نے سنبھال لیا۔ وہ جانے اور گھر۔ میں صرف سرکاری کاموں کے زیرو بم کے گرداب میں پھنس کر رہ گیا مگر گھر کی مجھے کبھی بھی فکر نہ رہی اور میں یکسوئی سے اپنے باہر کے کام کرتا رہا۔ دوستوں سے مجلس لگاتا رہا حاکموں سے اصولوں پر دست و گریبان رہا مگر ماتحتوں کی دلجوئی کرتا رہا مگر اپنے گھر کی مجھے کبھی بھی فکر نہ ہوئی۔ ایک اچھی بیوی واقعی گھر کو جنت بنا دیتی ہے۔

میں نے بلقیس کو کبھی دغا نہیں دیا اور نہ بلقیس نے مجھے کبھی Legdown کیا مگر اب میں جب پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو مجھے اپنا ایک بہت ہی بڑا گناہ نظر آتا ہے کہ خواہ مخواہ کی غیر ضروری مصروفیت کی وجہ سے میں نے بلقیس کو اتنا وقت نہ دیا جو مجھے دینا چاہیے تھا۔ آپ کے وقت پر سب سے زیادہ حق آپ کے بیوی بچوں کا ہے۔ دفتر! دوست اور حاکموں کا نہیں ہے۔ روزگار اور فرائض کے اپنے تقاضے ضرور ہیں مگر بیوی بچوں کی قیمت پر خدائی خدمت گزار بننا بھی

Marfat.com

کوئی اتنا اچھا کام نہیں ہے جو میری غلطیوں میں سب سے بڑی غلطی تھی۔ مگر بلقیس اتنی بے زبان تھی کہ منہ پر شکایت ہوتی ہی نہ تھی۔ یہ اس کی غلطی تھی۔

بلقیس کی اچانک و المناک موت کے بعد مجھے ایکدن میری بڑی بہن نے جھڑکا کہ تم اندھے تھے کہ تم اس کے اندر کا دکھ دیکھ ہی نہ سکے۔ وہ ہروقت کھڑکی دروازہ سے لگی تمہاری راہ تکتی رہتی اور تم باہر کے کاموں میں مگن رہتے۔ ایک دن تو وہ میرے اور باباجی کے ساتھ بیٹھ کر دکھ سکھ کرتے کرتے اتنی روئی کہ اس کے آنسوؤں سے ایک تولیہ بھیگ گیا۔ اسے تم سے اور کوئی شکایت نہ تھی۔ صرف ذرا زیادہ وقت مانگتی تھی کہ شریک حیات کے ساتھ شرکت وقت بھی ضروری ہے اور اس سے زیادہ اسے تمہاری صحت کی فکر تھی۔

"تو بہن تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں اور اب اس کے چلے جانے کے بعد کیوں بتا رہی ہو؟" "تمہارے جیسے الو کو کوئی بتائے تو بتائے کیا۔ اچھا آدمی وہی ہے جو دوسرے کے دل کو پڑھ سکے.....اور تو بلقیس جیسے صاف دل کو جو نہ پڑھ سکا وہ بندہ ہی کس کام کا"

اور بے چاری رونے لگی

سچی بات ہے میری بھی ہوک نکل گئی۔

ذرا رک کر پھر کہتی ہے کہ پتہ ہے جب میں نے بلقیس کو یہ کہا کہ اچھا میں سردار سے بات کرتی ہوں تو اس نے کیا کہا

کہتی ہے سردار سے بالکل بات نہ کرنا۔ سارے دن کا تھکا ہارا آتا ہے۔ اسے دکھ ہوگا اور خواہ مخواہ اس کی صحت خراب ہوگی۔

الو یہ تھا اسے تمہارا خیال میں تو یہ کہوں گی کہ تم بلقیس کے قابل نہیں تھے یہ تو اللہ نے ٹاٹ میں کمخواب کا پیوند لگا دیا تھا۔

بلقیس ایبٹ آباد پہنچنے کے تین دن بعد باورچی خانہ میں گھس گئی تھی اور خود برتن مانج رہی تھی۔ دفتر سے واپس آکر میں نے اعتراض کیا تو کہنے لگی

پتہ ہے تمہارا پیٹ کیوں خراب رہتا ہے؟

Marfat.com

نہیں تو۔ کہتے ہیں پہاڑوں پر پیٹ خراب ہو ہی جاتا ہے

نہیں۔ نہیں کہنے لگی۔ ادھر آؤ تمہیں دکھاتی ہوں کہ کتنی کتنی میل ان برتنوں پر جمی ہوئی ہے جس میں تمہارے لئے تمہارا پسندیدہ مزیدار کھانا پکتا ہے۔

میں نے دیکھا تو بالکل ایسا ہی تھا۔ برتنوں پر میل کے کھملوڑ جمے ہوئے تھے اور زین ایک طرف منہ لٹکائے کھڑا تھا۔

میں نے زین کو جھڑکا تو بڑے آرام سے کہتا ہے کہ صاحب برتن کو زیادہ صاف کریں تو کھانا پھیکا اور بے برکت ہو جاتا ہے۔ کھانا تو اللہ کی رحمت ہے ایسے ہی تھوڑا ضائع کر دینا چاہیے گناہ ہوتا ہے۔

بے چارہ اور کیا کہتا۔ اس کی نوکری پر حرف بھی نہ آیا اور اگلے ۲۷ سالوں تک مجھے نہیں معلوم کہ باورچی خانہ میں کیا ہوتا تھا مگر کھانا لذیذ بھی ہوتا اور صحت مند بھی۔ پھر بھی میرا پیٹ خراب ہوا نہ کوئی اور بیماری۔ یہ سب بلقیس کی برکت تھی۔ میں نے پوری سرکاری ملازمت میں کبھی بھی میڈیکل کا بل دے کر پیسے نہیں لئے۔ اس لئے کہ بلقیس نے باورچی خانہ بالکل درست رکھا تھا..... کمال بندہ تھی اور میں کمال بے خبر بندہ۔

جب ۲۰ جولائی ۱۹۹۲ء کو ایک نہایت ہی مختصر سی چند گھنٹوں کی بیماری کے بعد سروسز ہسپتال سے بلقیس کی لاش گھر آئی تو تمام نوکر بچوں کی طرح رونے لگے اور بار بار کہیں کہ اب ہمیں آدھی آدھی رات کو روٹی پکا کر کون دے گا۔ ہائے ہماری ماں مر گئی۔

اور میری بے خبری دیکھئے کہ مجھے کبھی معلوم نہ ہوا کہ زیادہ دیر ہو جائے تو وہ باورچی خانہ میں کام کرنیوالے تمام ملازموں کو چھٹی دے دیتی تھی اور خود میرا اور میرے ڈرائیور کا انتظار کرتی رہتی کہ جس وقت بھی ہم گھر میں واپس آئیں ہمیں گرم گرم کھانا ملے۔ جو مجھے ملتا وہی میرے ڈرائیور اور وائرلیس آپریٹر کو ملتا اور یہ کام آئی۔ جی پولیس پنجاب کی بیگم صاحبہ خود اپنے ہاتھ سے کرتی تھیں اور آئی۔ جی صاحب بہادر کو آخری وقت تک پتہ نہ چلا۔ راز کھلا تو ملازموں کی آہ و بکا سے۔

ہائے زندگی تجھے لاؤں کہاں سے ڈھونڈھ کر

Marfat.com

تم کیوں کھو گئی

اب ڈھونڈھتے ہو دشت غیر میں

امریکہ میں

دل کی رفوگیری کے وقت

دل تو گیا دل والوں کے ساتھ

اللہ والوں کے ساتھ

روؤ اب تم سردار

ہاں! روؤں گا

ضرور روؤں گا

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت

روئیں گے ہم ہزار بار

بلقیس تجھے یاد کر کر کے

تو اچھی تھی

بہت ہی اچھی تھی

مل سکتا نہیں تجھ سا کوئی

ہزاروں میں

لاکھوں میں۔

بلقیس کے متعلق کیا کہوں؟ کہنے کو بہت کچھ ہے مگر لکھنا محال ہو جاتا ہے۔ پورے ستائیس سال کی رفاقت میں مجھے معلوم نہ تھا کہ میرے کپڑے کہاں سے بنتے ہیں اور کہاں سے سلتے

Marfat.com

ہیں۔ اس کے چلے جانے کے بعد بھی اب تک اسی کے بنوائے ہوئے کپڑے زیب تن کر رہا ہوں مگر ختم ہونے کو نہیں آتے۔

یہی نہیں اس نے میرا ایسا چارج سنبھالا کہ کچھ دیر بعد میری پولیس یونیفارم بھی وہ خود تیار کرتی اور یونیفارم تیار کرنے والے آدمی کو میرے کمرے میں داخل تک نہ ہونے دیتی۔

۔وہ بے چاری بوٹ خود پالش کرتی جس پر مجھے سخت اعتراض تھا۔ میں زیادہ کہتا تو کہتی کہ میرے ابا جی اپنے بوٹ خود پالش کرتے ہیں تو میں یہ کیوں نہ کروں۔

بھئی وہ اپنے بوٹ پالش کرتے ہیں دوسروں کے تو نہیں

تو کیا تم دوسرے ہو؟

تم اور میں تو ایک ہیں۔ مجھے خوشی ہوتی ہے۔

چلو چلو فلمی ڈائیلاگ مت بولو۔ ملازموں کو بھی کچھ کرنے دو مگر وہ اپنی ہی طرز کا بندہ تھا۔ اس کے والدین نے اس کی تربیت ہی ایسی کی تھی۔ فرض کا بندہ' درد کا بندہ کی مکمل تصویر تھی۔

ہمیں ایبٹ آباد پہنچے ایک ہفتہ گزر گیا مگر مجال ہے بلقیس نے ایک دن بھی انجم سائرہ کا مجھ سے ذکر کیا ہو۔ میں نے سوچا یاد تو کرتی ہوگی مگر مجھے نہیں بتاتی۔ اور بات ایسے ہی نکلی۔ دل میں تڑپ رہی تھی اور زبان پر ذکر تک نہیں لا رہی تھی بے چاری بلقیس۔ بے چاری ممتا۔

ہفتہ بعد کہتی ہے کہ چلو گاؤں چلتے ہیں اور اماں جی کو ساتھ لے کر آتے ہیں یعنی میری والدہ محترمہ کو۔ مجھے اس کی ادا بہت پسند آئی۔

میں نے کہا پہلے لاہور چلتے ہی۔ سب کو ملتے ہیں۔ انجم سائرہ کو مل لینا پھر گاؤں چلیں گے۔ اس پر وہ بہت خوش ہوئی اور میں نے معمولی سے آنسو یا آنسو نما جھلکیاں اس کی آنکھوں سے ڈھلکتی دیکھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ انجم۔سائرہ کو شدت سے یاد کر رہی ہے۔ چنانچہ اس موقعہ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے کہا کہ واپسی پر اب انجم اور سائرہ کو ساتھ لے آئیں گے۔ کہتی ہے نہیں ابا جی کا فیصلہ ہی درست ہے۔ میں اپنے دل پر پتھر باندھ لوں گی۔

Marfat.com

وہ لاہور میں رہیں گی تو تعلیم بھی اچھی پالیں گی۔ تمہارے تبادلے ہوتے رہیں گے تو پھر کہاں بے چاری در بدر ہوتی رہیں گی۔ بہتر ہے وہیں رہیں۔ کچھ دیر بعد وہ بھی عادی ہو جائیں گی اور میں بھی۔

میں نے محسوس کیا کہ اس کی بات میں بہت وزن ہے اور میں خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے حاجی حبیب الرحمن سے لاہور اور ٹوبہ جانے کے لئے چھٹی کا تقاضا کیا تو انہوں نے نہ صرف چھٹی دے دی بلکہ ایک نہایت ہی عمدہ کار کا بھی انتظام کر دیا اور کہتے ہیں کہ واپسی پر تمہاری ڈیوٹی نتھیا گلی ہو گی۔ اپنا ہنی مون وہاں منانا اور ساتھ ساتھ تھانہ کا معائنہ بھی کرنا۔ کیا بات تھی حاجی صاحب کی۔ میں ہمیشہ انہیں دعائیں دیتا رہتا ہوں۔

اگلے دن ہم فراٹے بھرتے ہوئے لاہور پہنچ گئے۔ ہم نے سب کو سرپرائز دیا تھا۔ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ انجم۔ سائرہ تو اپنی ماں سے چمٹ چمٹ جائیں اور بار بار پوچھیں کہ تم کہاں چلی گئی تھی۔ تم بہت بری ہو۔ تم ہمیں کیوں چھوڑ کر چلی گئی۔

میں تو تمہارے بھائی جان کے ساتھ سیر کے لئے گئی تھی۔

تو ہمیں کیوں نہ لے کر گئے۔

تم بہت بری ہو۔

بھائی جان بھی بہت گندے ہیں۔ ہمیں کیوں نہ لے کر گئے۔

"نہیں ایسا نہیں کہتے۔ بھائی جان تو بہت اچھے ہیں۔ وہ تو لے جانے کو کہتے تھے ہم نے منع کر دیا ہم آپ کے بغیر کیسے رہ سکتے ہیں میرا بیٹا۔ بچہ۔ میرا لاڈلا۔ ہم سب اداس ہو جاتے ہیں۔ ابا جی تو آپ کے بغیر رہ ہی نہیں سکتے"۔

میری سالی نجمہ نے انہیں پچکارنا شروع کر دیا

میں نے بہت ساری چاکلیٹ نکالیں انجم اور سائرہ کو دیدیں۔

دیکھا بھائی جان کتنے اچھے ہیں

بہت اچھے ہیں۔ تھینک یو

Marfat.com

اور دونوں میرے ساتھ چمٹ گئیں۔ بہت ہی پیاری تتلیاں سی تھیں اور پھر کھیلنا کودنا شروع کر دیا۔

"یہ تم نے چاکلیٹ کب لی تھی۔ مجھے کیوں نہیں بتایا۔ تم بڑے چالاک ہو" بلقیس کچھ برہم ہوئی اور مجھے اس کی یہ میٹھی میٹھی برہمی بہت ہی پسند آئی۔ "یہ تو معجزہ تھا۔ میں نے یہیں کھڑے کھڑے اللہ سے دعا کی کہ یا اللہ ان بچیوں کے سامنے میرا بھرم رکھ لے اور اس ذات نے رکھ لیا"

آپ یقین کریں بلقیس کو میرے اس جھوٹ پر یقین آگیا۔ عجیب سادہ دل تھی ایک دن لاہور ٹھہر کر ہم ٹوبہ روانہ ہو گئے۔ میرا خیال تھا کہ ایک دن ٹھہریں گے۔ ماں کو ساتھ لیں گے اور نتھیا گلی چل کر دل گلابی کریں گے۔ مگر بلقیس تو گاؤں میں پاؤں پسار کر بیٹھ گئی۔ اور چلنے کا نام ہی نہ لے۔ دن رات گاؤں کی عورتوں میں گھری خوش نظر آئے حالانکہ اس وقت سخت گرمی کا موسم تھا۔ ہمارے گاؤں میں اس وقت بجلی تک نہ تھی اور ہمارے مکان بھی ایسے ہی خستہ اور کچے تھے مگر بلقیس تو وہاں ایسے مست ہوئی کہ جیسے صدیوں سے یہاں رہ رہی ہو۔

تیسرے دن میری ماں نے کہا تم بلقیس کو یہاں کیوں لے کر آئے۔ اتنی گرمی میں بے چاری جھلس جائے گی مگر وہ تو چلنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

بیٹا اصل میں وہ مجھ بڑھیا کو خواہ مخواہ گھسیٹ رہی ہے کہ میں وہاں چلوں۔ میں کہاں وہاں دھکے کھاتی رہوں گی۔ تم لوگوں کی نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ موج کرو۔ پھر کبھی چلوں گی۔

جیسے تم کہو ماں مگر اپنی بہو کو ضرور منا لینا۔ اگر زیادہ اصرار کرے تو چل پڑنا۔

اچھا ٹھیک ہے مگر اسے یہاں پھر دوبارہ نہیں لانا۔

مجھے فکر ہوئی کہ ماں یہ بات بار بار کیوں کہہ رہی ہے۔ اللہ خیر کرے۔ بلقیس ایسی ہے تو نہیں۔ کہیں اس نے کوئی گستاخی نہ کر دی ہو۔

وسوسے کا شکار ہو کر میں نے ماں سے کہا

Marfat.com

ماں! یہ تم کیوں کہہ رہی ہو کہ اسے پھر یہاں نہ لانا۔۔ کیا؟

ابھی میں یہ کہہ ہی رہا تھا کہ ماں نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

ایسی بات نہیں جو تم سوچ رہے ہو۔ بلقیس اتنی خوبصورت ہے کہ گاؤں کی سب عورتیں کہہ رہی ہیں کہ اماں تمہاری بہو تو کوئی حور پری ہے۔ اتنی حسین بہو کہاں سے لے آئی ہو کوئی کہتی ہے کہ کوہ قاف کی پری ہے اور کوئی کچھ ..... مجھے ڈر ہے کہ ان بدبختوں کی کہیں نظر نہ لگ جائے۔ بہت سی تو بالکل جل بھن گئی ہیں۔ تم بدھو ہو۔ تمہیں عورتوں کے مکر کا پتا ہی نہیں۔ بلقیس بے چاری تو کوئی سادھو لوگ ہے۔ بیٹا! تمہاری قسمت اچھی ہے تم پر اللہ کا سایہ ہے۔ تمہارے سارے کام اچھے ہو رہے ہیں۔ یہ تمہاری دادی کی دعاؤں کا اثر ہے۔ وہ ہمیشہ کہتی تھی کہ میرا پوتا بادشاہ بنے گا اور تم کوئی بادشاہ سے کم تھوڑے ہی ہو۔ سنا ہے تم تھانیدار سے بھی بڑے افسر ہو

ہاں! ماں

اچھا جاؤ تم اپنے دادا' دادی کی قبر پر دعا مانگ کر آؤ۔ اتنے میں تیار ہو جاتی ہوں لگتا ہے بلقیس میرے بغیر چلے گی نہیں اور اسے ایک منٹ بھی اور یہاں نہیں ٹھہرنا چاہیے۔ ضرور کسی ناقصی کی نظر لگ جائیگی۔

میں قبرستان گیا اور دعا پڑھ کر دادا' دادی خاص طور پر دادی سے ہم کلامی کی کہ تمہارا جہانگیر تھانیداری روپ میں حاضر ہے۔ دادی خدا سے کہو کہ اب میری حفاظت کرے۔ جہانگیر تو میں بن نہیں سکتا البتہ ایک نور جہاں ضرور لے آیا ہوں۔

واپسی میں سوچتا رہا کہ بلقیس بہت اچھی رفیق حیات ہے۔ کس طرح میری ماں سے پیار کر رہی ہے۔ ساتھ ساتھ میں نے یہ بھی سوچا کہ بہت زیادہ حسن کی تعریف نے ہی اسے لٹو کر دیا ہے اور وہ اتنی سخت گرمی اور ناآسودگی کے باوجود عورتوں کی فطری کمزوری سے مجبور ہے اور خوب خوش ہے۔

واپس پہنچا تو چلنے کی تمام تیاری تھی۔ سارا خاندان میرے والد' چچا' چچی' بہنیں' ماموں ممانی اور دیگر سارا گاؤں ہی امڈ آیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان کے پاس پھول کہاں سے

Marfat.com

آئے اور انہوں نے پٹاخے کب حاصل کر لئے مگر جب ہم چلے تو پھولوں کی پتیوں کی بہار تھی اور پٹاخے اس طرح چل رہے تھے کہ جیسے آج ہی بارات چل رہی ہے یا پہنچی ہے سب نے بلقیس اور مجھے قران مجید کے نیچے سے گزارا اور سب کی دعاؤں سے ہماری روانگی ہوئی۔ وہ رنگ اور خلوص میں آج تک نہیں بھول سکا اور نہ بلقیس عمر بھر بھول پائی۔ خلوص دل کے اپنے رنگ نرالے ہوتے ہیں منفرد ہوتے ہیں اور بہت گہری زبان رکھتے ہیں۔

ہماری والدہ پورے راستہ بلقیس کی بلائیں لیتی رہیں اور دعائیں دیتی رہیں۔ کافی شام ڈھلے ہم نتھیا گلی پولیس ریسٹ ہاؤس پہنچے تو ہمارا استقبال بوڑھے منگی خان نے کیا جو جوانی میں نتھیا گلی کے جنگلوں میں شیر کا شکار کھیلا کرتا تھا.....

Marfat.com

زندگی کی راہیں

نتھیا گلی بہت خوبصورت اور پر فضا پہاڑی مقام ہے۔ زمین پر جنت ہے۔ نتھیا گلی مجھے ہمیشہ ہی بہت پسند رہی ہے مگر دنیا کی سب سے زیادہ مجھے پیار کرنے والی ہستیاں موجود ہوں تو پھر نتھیا گلی کیسی لگے گی وہ صرف میں ہی جانتا ہوں۔ میری پیاری ماں اور محبوب بلقیس ایک وقت میں دونوں وہاں موجود تھیں۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ساس بہو ہیں بلکہ بیگم منظور قادر نے تو یہ بات صاف صاف کہہ بھی دی اور دونوں ہنس کر رہ گئیں۔ بیچ میں میری موج ہی موج تھی۔ ماں نے ریسٹ ہاؤس کا تمام انتظام اپنے ہاتھ میں لیا اور ہم دو تتلیوں کی طرح پہاڑی پہاڑی اڑتے پھریں۔ کبھی کبھار تو ہم قریب کے گاؤں میں بھی جا پہنچیں اور پہاڑ کے لوگ اتنی خاطر مدارت کریں کہ دل اس باغ کے اندر ہی باغ باغ ہو جائے۔ کبھی ہم نتھیا گلی کے گورنر ہاؤس میں جاکر بلیرڈ کھیلیں اور کالا باغ میں جنگلات کے خوبصورت ریسٹ ہاؤس اور اس کے وسیع و عریض ڈھلوانی لڑھکتے ہوئے لان پر قلابازیاں لیں۔ اکثر ہم مری بھی چلے جاتے اور خوب سیر کرتے۔ میری تو دنیا ہی بدل گئی تھی سبحان اللہ ..... واپسی پر گرم چائے گرم کھانا تیار اور نہانے کے لئے گرم پانی۔ دل کرے کہ پوری زندگی یونہی گزر جائے۔

مگر قدرت کو تو کچھ اور ہی منظور تھا۔ فطرت ہمیشہ تنوع پسند رہی ہے۔ پھر یکدم میرا تبادلہ سندھ کے قصبہ گھوٹکی ضلع سکھر ہو گیا اور فوراً روانگی کا حکم بھی۔ مجھے لگا کہ جنت سے

Marfat.com

نکالا گیا ہوں۔ آخر آدم کی اولاد جو ٹھہرا۔ شاید شجر ممنوعہ کے پاس چلے جانے کی سزا مل رہی تھی۔ میرا خیال ہے یہ سزا آدم کی اولاد کی ہر نسل کو ضرور ملتی ہے اور مجھے بھی مل گئی۔

والدہ گاؤں چلی گئیں اور بلقیس لاہور

میں پہاڑ سے اتر کر سیدھا گھوٹکی کے صحراؤں میں پہنچ گیا۔ سخت گرمی اور لو۔ دن کو آرام نہ رات کو۔ نئی جگہ نئے لوگ اور کام کا بے حد بوجھ۔ ہاتھ سے گھما کر نے والا پچھلے زمانوں کے ٹیلیفون کا نظام۔ آج کال بک کرائیں اور اگلے دن ملے یا شاید نہ بھی ملے۔

ابھی میں گھوٹکی میں پاؤں پسار ہی رہا تھا کہ میرا تبادلہ دادو ضلع کے کوٹری قصبہ میں ہو گیا۔ ادھر سے مجھے یہ حکم ملا اور ادھر بلقیس بیگم مع میری والدہ کے آدھمکیں۔ تو یہ کب گئیں اور والدہ کو کب ساتھ لیا مجھے پتہ نہیں لیکن بلا اطلاع گھوٹکی پہنچ گئیں تو میں کوٹری کے لئے تیار بیٹھا تھا۔

میری والدہ تو اس مزید تبادلہ پر بہت خفا ہوئیں مگر بلقیس خوش تھی کہ چلو ساتھ ہی ایک بڑا شہر حیدر آباد ہے اور کراچی بھی قریب ہے۔

نہ بیٹا کراچی کبھی نہیں جانا۔ سنا ہے وہاں سمندر ہے۔ لوگ ڈوب جاتے ہیں۔ خبردار کراچی گئے تو میری ماں نے نہایت سختی اور سادگی سے یہ بات کر دی۔

یوں ہم کوٹری پہنچ گئے اور دادو کی بے آب و گیاہ سب ڈویژن سہون کی آبلہ پائی کے لئے وہاں کے سب ڈویژنل پولیس افسر بن گئے۔ سہون شریف میں شہباز قلندر کا مزار ہے۔ میں پہلے ہی دورے پر والدہ اور بلقیس کو وہاں ان کے مزار پر لے گیا تو دونوں خواتین خوشی سے پاگل ہو گئیں اور میری ماں ہماری نیک اولاد کے لئے دعائیں کرتی رہیں۔ گڑگڑاتی رہیں اور روتی رہیں۔

میں اپنی والدہ کو کراچی کا خوف دور کرنے کے لئے انہیں اور بلقیس کو کراچی بھی لے گیا اور وہاں پہنچ کر ماں کو بتایا کہ یہ کراچی شہر ہے۔ دیکھو کتنی دنیا اس میں رہتی ہے اور یہاں کتنی رونق ہے۔ کچھ خوف ختم ہوا تو پھر میں انہیں سمندر کے ساحل پر بھی لیکر گیا۔ واقعی سنی سنائی بات اور حقیقت میں بہت فرق ہوتا ہے ہماری والدہ نے کبھی سمندر دیکھا نہ تھا اور سنی سنائی بات سے ڈر رہی تھیں۔ مجھے یہ بات بہت اچھی طرح یاد ہے اور جب بھی یاد آتی ہے تو خوب ہنستا ہوں۔ ہماری والدہ نے کبھی گدھا گاڑی نہیں دیکھی تھی۔ اس وقت پنجاب میں اس کاروان

Marfat.com

ہی نہ تھا۔ وہ جب بھی گدھا گاڑی دیکھتیں تو ہنسی ضبط نہ کر سکتی تھیں حالانکہ وہ بہت ہنستی بھی نہ تھیں۔ ہمیں بچپن سے سناتی آئی تھیں کہ انسان کو کبھی بھی کھل کھلا کر ہنسنا زیب نہیں۔ بتاکہ حضور ؐ پاک صرف زیر لب مسکراتے تھے اور وہی ہمارے لئے نمونہ ہیں مگر ہوا یہ کہ گدھا گاڑی کو دیکھتے ہی ان کا عمر بھر کا اصول ٹوٹ گیا اور میں خوب محظوظ ہوا۔

تھوڑی دیر بعد ماں کو گاؤں کی یاد ستانے لگی اور پتہ نہیں انہیں گاؤں کے کون کون سے کام یاد آنے لگے کہ مجھے ان کی واپسی کا انتظام کرنا پڑا۔ ان کی واپسی پر بلقیس ٹوٹ ٹوٹ کر رونے لگی۔ مجھے کچھ عجیب سا لگا اور میں نے کہہ ہی دیا تو میری ماں کہنے لگی۔

تم بہت الو ہو۔ تمہیں پتہ نہیں کہ تمہاری بیوی ماں بننے والی ہے۔ اب تم اس کا خیال رکھنا۔ ایسے ہی ادھر ادھر مت بھاگے پھرنا۔ بلقیس بیٹا تم بھی زیادہ مت گھومنا پھرنا اور بلقیس مارے شرم کے لال سے لال ہو کر اور بھی خوبصورت ہوتی جائے۔

ماں روانہ ہو گئیں تو میں نے بلقیس سے کہا تم نے مجھے اتنی خوشی کی بات کیوں نہ بتائی۔

عجیب بندہ ہو تم بھی۔

چلو ہٹو جی۔ ایک تو تم نے مصیبت ڈال دی اور دوسرے شکایت کرتے ہو۔ تم بہت شرارتی ہو۔ مجھے بہت شرم آرہی ہے۔

بھئی اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ ہر کوئی بچے پیدا کرتا ہے۔ ایسا نہ ہو تو نسل انسانی ہی ختم ہو جائے۔ یہ تو اچھی بات ہے۔

مگر وہ کہ پانی پانی ہوئی جائے اور آپ حیران ہوں گے کہ مرتے دم تک نانی بن کر بھی اس کی یہی کیفیت رہی۔ عجیب تربیت ہوئی تھی اس کی اور کمال تھا اس کے والدین کا۔ یہ باتیں فطری طور پر میری اولاد میں بھی موجود ہیں لڑکیاں تو لڑکیاں میرے دونوں بیٹے امریکہ میں پڑھنے کے باوجود بالکل ماں کی طرح ہیں۔ میں انہیں اکثر کہتا ہوں کہ امریکہ نے تمہارا کچھ نہیں بگاڑا۔ بلقیس کے تمام بہن بھائی بھی کچھ اسی طرح ہیں۔

خیر ہماری والدہ چلی گئیں تو ہم بالکل اکیلے رہ گئے اور جہاں کہیں بھی مجھے دورہ پر جانا پڑے بلقیس کو ساتھ ہی ہونا ہوتا تھا کہ کوئی ایسی غیر مانوس جگہ پر وہ معصوم کہاں اکیلی رہ سکتی تھی اور میرے بغیر وہ لاہور جانے کو تیار نہ ہوتی۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت تک وہ بھی میری

Marfat.com

محبت اور چاہت کا شکار ہو چکی تھی مگر مجال ہے کہ منہ سے ایک لفظ بھی کہے۔ مگر مجھ جیسے بے سمجھ کو کیا خبر کہ اس کے دل میں بھی میرے لیے پیار کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے:۔

ختم ہے تجھ پہ الفت کی پردہ داری ہائے ہائے

کوٹری کی یکسانیت صرف میاں شفیع صاحب کی آمد پر ٹوٹتی تھی جو بہانے بہانے سے کراچی اور حیدر آباد کے دورے رکھتے اور اپنی لاڈلی سے ملنے آتے۔ کئی دن پہلے پروگرام پہنچ جاتا۔ ہم انتظار کرتے رہتے اور ان کے آنے سے گھر میں ایک بہار سی آجاتی مگر وہ ہر روز تو اتنی دور نہیں آسکتے تھے۔ ہم بور ہوتے تو دورے پر نکل جاتے۔

ایک دن بلکہ شام کو مجھ سے ایک بہت بڑی حماقت سرزد ہوگئی۔ ہم کوٹری سے سہون شریف کی طرف جارہے تھے کہ ہمارا مقابلہ ڈاکوؤں سے ہوگیا۔ جو لوگ اس علاقہ سے واقف نہیں وہ اس بات کا احاطہ ہی نہیں کر سکتے کہ وہاں کیا صورت حال تھی۔ کوٹری سے دادو کوئی ۱۲۹ میل دور تھا۔ سڑک کے ایک طرف جنگلوں میں گھرا دریائے سندھ بہتا ہے تو دوسری طرف صحرا ہے جس میں ہریالی نام کی شے تک نہیں ہے۔ کچھ دور پہاڑ شروع ہو جاتا ہے۔ اور سہون کے قریب پہنچ کر تو دریا اور پہاڑ بالکل ساتھ آملتے ہیں۔ دس گیارہ میل کے ٹکڑے میں دریا کے کناروں کے اوپر بالکل اوپر نہایت ہی خطرناک زاویوں پر ریل گاڑی بھی چلتی ہے اور سڑک بھی۔ پہاڑی راستہ ایسا ناہموار اور پیچ در پیچ کہ شیر کا دل بھی دہل جائے اور یہی جگہ ڈاکوؤں کے لئے بھی موزوں ترین تھی۔ اس شام اچانک ہماری مڈبھیڑ بھی ان ہی ''دوستوں'' سے ہوگئی۔ ہمارے وہاں پہنچنے سے پہلے وہ کچھ گاڑیوں کو لوٹ رہے تھے کہ ہم بھی انجانے میں وہاں پہنچ گئے۔ بلقیس بے چاری میرے پہلو میں بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔ اس کی بلا سے کہ کیا ہونے والا ہے۔ اور یکدم فائرنگ شروع ہوگئی۔ میرے ساتھ ہی مسلح گارڈ تھی اور دونوں میں مقابلہ شروع ہوگیا۔ بلقیس کا مارے خوف کے پسینہ چھوٹا جائے۔ میں نے نہایت احتیاط سے اسے گاڑی کی سیٹ سے کھسکا کھسکا کر ایک طرف اتار لیا اور سڑک کے ساتھ چھپا دیا۔ خیر تھوڑی ہی دیر میں مقابلہ ختم ہوگیا اور ایک ڈاکو مارا گیا۔ ہمارے دو سپاہی بھی معمولی زخمی ہوئے۔ اس وقت کلاشن کوف کا زمانہ نہ تھا۔

مجھے اس معرکہ پر بہت خوشی ہوئی۔ بعد میں تو بہت مقابلے دیکھے اور کیے۔ در حقیقت میری سروس کا بھی یہ پہلا ہی معرکہ تھا اور کامیاب رہا جس میں میرا کوئی کردار نہ تھا۔

Marfat.com

میں تو بلقیس کو ہی بچا رہا تھا۔ سب کچھ سپاہیوں نے کیا تھا مگر میں سب سے سینئر تھا اس لئے مجھے بھی اس کامیاب مقابلہ کا کریڈٹ جاتا تھا۔ میں خوشی میں مست ہو گیا اور بھول ہی گیا کہ خواتین کتنی نازک دل ہوتی ہیں اور وہ بھی بلقیس ایسی نفیس الطبع۔ میں نے بلقیس کو اٹھایا اور بڑے فخر سے اسے مردہ خون میں لت پت ڈاکو کی لاش دکھا دی اور وہ بے ہوش ہو کر دھڑام سے گر گئی۔

میرے تو ہاتھ کے طوطے اڑ گئے۔ ٹھنڈا پانی اس کے منہ اور سر پر ڈالا۔ پھر بلقیس کو موٹر میں ڈالا اور سہون شریف پہنچ کر ڈاکٹر کو بلایا۔ کچھ دیر بعد بے چاری بلقیس ہوش میں آئی اور میری جان میں جان آئی مگر ڈاکٹر ساری رات اسے دیکھتا رہا اور پتہ نہیں کتنے انجکشن اور دوائیاں دیتا رہا صبح کو اس نے بتایا کہ اب گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ نے کرم کر دیا چودھری صاحب۔ یہ تو ٹچ اینڈ گو (Touch and go) والا معاملہ تھا۔ بیگم صاحبہ کی جان خطرے میں تھی اور بچہ بھی جاتا۔ آپ کو ایسی حالت میں بہت احتیاط کرنی چاہیے تھی۔ کوئی خاتون ان کے ساتھ ضرور ہونی چاہیے۔ انہیں کبھی اکیلا نہ چھوڑیں۔ تب مجھے اپنی ماں کے الفاظ یاد آئے۔ واقعی میں بہت بڑا الو تھا۔ مجھے معلوم ہی نہ تھا کہ یہ کتنے نازک آبگینے ہوتے ہیں اور میں نے فوراً بلقیس بیگم کو اس کی والدہ کے پاس لاہور بھیجنے کا اہتمام کیا کہ بچے کی پیدائش تک وہیں رہے۔

بلقیس کے لاہور چلے جانے کے بعد میرے ساتھ ایک عجیب واقعہ ہوا۔ میں سہون شریف دورہ پر گیا۔ حسب دستور پہلے میں نے شہباز قلندر کے مزار پر فاتحہ پڑھی اور پھر ریسٹ ہاؤس چلا گیا اور رات کو سو گیا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے یہ ۲۴ نومبر ۱۹۶۵ء کی صبح بالکل فجر کے وقت کی بات ہے کہ مجھے خواب آتا ہے جس میں مجھے اور بلقیس کو اللہ تعالیٰ دو بیٹے عنایت کرتا ہے۔ دونوں بیٹوں کی پوری تصویر میرے سامنے آتی ہے۔ میری ماں ساتھ کھڑی ہے۔ خوش ہو رہی ہے۔ بلقیس خوش ہے کہ میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ میں نے اٹھ کر نماز ادا کی اور نفل شکرانہ پڑھے اور وہیں مصلیٰ پر بیٹھ کر بلقیس کو پورے خواب کی تفصیل لاہور لکھ بھیجی۔

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ بلقیس کی والدہ نے یہ خواب جان کر بہت سی خیرات بھی کی۔ اور اللہ کا کرم دیکھیں کہ خدا نے مجھے بالکل ہو بہو اسی شکل و صورت کے یکے بعد دیگرے دو بیٹے عنایت کئے۔ سب سے بڑا بیٹا ہارون ۲۶ فروری ۱۹۶۶ء کو پیدا ہوا اور دوسرا بیٹا عرفان ۱۵ ستمبر ۱۹۶۷ء کو اس دنیا میں آیا۔ بس وہی جانتا ہے کہ اس نے کیا کرنا ہے اور صرف وہی جانتا ہے

Marfat.com

اور کوئی نہیں جانتا۔ بلقیس نے مرتے دم تک وہ خط ہمیشہ اپنے پرس میں رکھا اور وقت بے وقت اسے پڑھتی رہتی۔ لگتا ہے کہ میری ماں کی شہباز قلندر کے مزار پر مانگی دعا قبول ہو گئی تھی۔ شاید قلندر بھی اس دعا میں شامل ہوئے ہوں گے کہ مجھے وہیں پر یہ خواب آیا تھا۔ بلقیس نے بھی یہی دعا مانگی ہوگی مگر شاید خفی خفی سی کہ کوئی سن نہ لے۔ اللہ ہی جانے اور کوئی نہ جانے۔ دنیا گورکھ دھندا ہے۔ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔

۲۶۔ فروری کی شام میں اور میاں محمد امین اے۔ ایس۔ پی حیدر آباد میرے ہاں کوٹری میں بیٹھے تھے کہ میری سالی نجمہ کا ٹیلیفون آیا کہ بھائی جان مبارک ہو۔ اللہ نے آپ کو بیٹا دیا ہے۔ میں تو خوشی سے پاگل ہو گیا۔ سب سے پہلے والدہ کو گاؤں خط لکھا اور لاہور چلنے کی تیاری کرنے لگا۔ کسی نہ کسی طرح مجھے لاہور کے لئے ہوائی جہاز کا ٹکٹ مل گیا اور کراچی سے سیدھا دوپہر کو لاہور پہنچ گیا۔ بچے کو دیکھا تو بہت خوش ہوا۔ بلقیس خوش تھی میاں صاحب خوش تھے ہماری خوشدامن خوش تھیں کہ سارا گھرانہ ہی بہت خوش تھا۔ خوشیاں منائی گئیں۔ شادیانے بجائے گئے اور گاؤں کو منوں مٹھائی بھجوائی گئی۔ یوں ہمارے ہاں پہلا بیٹا آیا۔ بہت سے نام تجویز ہوئے۔ آخر کار نجمہ بی بی کا تجویز کردہ نام ہارون سب نے پسند کیا۔ میں نے صرف اس کے ساتھ عزیز کا اضافہ کیا کہ مولوی عبدالعزیز صاحب نے مجھے اور بلقیس کو اکٹھا کرنے میں بہت ہی خوبصورت کردار ادا کیا تھا۔ ان کی نرینہ اولاد نہ تھی۔ انہوں نے جب سنا کہ ان کے نام کی نسبت سے ہم نے عزیز کا اضافہ کیا تو بہت خوش ہوئے اور بہت زیادہ دعائیں دیں۔ مولوی چراغ دین میاں شفیع صاحب کے والد صاحب نے تو ہارون کی آمد پر ایسے ایسے خوبصورت شعر پڑھے کہ سننے والے عش عش کر اٹھے۔

ہارون میری پہلی اولاد تھی۔ پہلی اولاد بہت پیاری ہوتی ہے۔ اولاد ساری ہی پیاری ہوتی مگر شاید پہلی اولاد ضرور سپیشل ہوتی ہے۔ بلقیس بھی اپنے والدین کی پہلی اولاد تھی اسی لئے سب کی آنکھوں کا تارہ تھی۔ یہی حال کچھ ہارون میاں کا ہوتا تھا۔ میرا ہی نہیں اپنے نانا نانی اور ماموؤں اور خالاؤں کا چہیتا۔ سارے گھر کی توجہ کا مرکز۔ میں خود بھی اسی کیفیت میں اس دنیا میں وارد ہوا تھا اور سب کی آنکھوں کا نور رہا تھا۔ تقسیم ہند کے بعد کی بات اور ہے اور مجھے اس پر بھی فخر ہے۔ مشکل وقت تھا کٹ گیا۔

Marfat.com

میں اپنی اولاد کے متعلق زیادہ نہیں لکھوں گا۔ وہ سب حیات ہیں اور اللہ کے فضل سے خوب پڑھ لکھ گئے ہیں۔ مجھے امید ہے وہ اپنی کہانی وقت آنے پر خود لکھیں گے۔ میں یہاں صرف یہ کہوں گا کہ سب بچوں کی تربیت اور تعلیم کا تمام تر کریڈٹ ان کی ماں کو جاتا ہے۔ مجھے تو یہ تک معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ کس کس کلاس میں پڑھ رہے ہیں۔ کیا کھاتے ہیں اور کیا پیتے ہیں۔ مجھے تو بلقیس نے گھر کے تمام کاموں سے فارغ کر دیا تھا۔ میرا کام صرف اسے تنخواہ لاکر دینا تھا۔ وہ گھر میں کسی اور تو کیا کسی دوست یا رشتہ دار کا تحفہ بھی قبول نہیں کرتی تھی۔ استثناء تھا تو صرف طاہر یوسف کہ شیخ یوسف کا بیٹا ہے اور میرے دوست انور ظہور کہ ان کے خلوص پر ذرا بھر دھبہ نہیں آسکتا تھا۔ بلقیس کا آپریشن ہوا تو چودھری انور ظہور ہی نے اپنا خون دیا تھا۔ بلقیس کا پختہ ایمان تھا کہ ذرا سی مشکوک کمائی سے اولاد ضرور خراب ہو جاتی ہے۔ ہائے قسمت تجھے کہاں سے ڈھونڈھ لاؤں کہ تم نے اس ہیرے کو مجھ سے چھین لیا۔ میری صحت، میری شہرت سب اسی کی رہین منت تھی۔

حرص نہ ہوس کمال صابر تھی بلقیس تو
کہاں گم ہوگئی ہو میری روشنی میرے نور
میں تیرے بغیر اندھیرے میں ہوں
خدا کے لئے میری کوتاہیاں بخش دینا
میں نے تمہیں بہت نظرانداز کیا تھا
قصور ہی سہی مگر تمہارا بھی تو ہے کہ گلہ نہ شکوہ
کچھ تو اس بے وقوف کو کہتی
ارے یاد ہی کروا دیتی۔

۱۵ ستمبر ۱۹۶۷ء جمعہ کے دن عین جمعہ کے وقت میرا دوسرا بیٹا عرفان عزیز پیدا ہوا۔ اس کا باپ اس وقت لوہاری کے باہر کھڑا حلیم کا مزہ لے رہا تھا۔ بلقیس کمال عورت تھی۔ ڈاکٹر کو خود بلالیا اور میری والدہ اس کے ساتھ تھی۔ سرزار کو تو یہ بتاتے ہوئے بھی شرماتی تھی۔

اسی طرح ہماری چھوٹی بچی صائمہ کی پیدائش پر بھی ایسا ہی ہوا جب راولپنڈی میں بلقیس کے ساتھ میری والدہ تھی اور نہ ہی بلقیس کی والدہ۔ میں ذوالفقار علی بھٹو صاحب کے ساتھ مری میں شملہ کانفرنس کے سلسلہ میں مصروف تھا اور پنڈی میں مجھے خبر تک نہ کی حالانکہ ہر

Marfat.com

روز فون پر بات ہوتی تھی۔ خود ہی ڈاکٹر صاحبہ کو بلالیا اور ۲۲ جون ۱۹۷۲ء کی صبح ایک نہایت ہی پیاری سی گڑیا کا تحفہ دے دیا۔ ہائے رے حجاب مرتے دم تک نہ گیا کہ اس کی گھٹی میں پڑ چکا تھا۔ شاید اس کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی۔

بلقیس کی جان اس کے بچوں میں تھی۔ ہر وقت بھاگی رہتی۔ انجم۔ سائرہ کو نانی اور خالائیں سنبھالتیں مگر ہارون عرفان اور صائمہ کو بلقیس لئے لئے پھرتی۔ سکول کا داخلہ ہو یا کالج کا حتیٰ کہ امریکہ پڑھائی کا مرحلہ ہو سب معاملات یا بلقیس کرتی تھی یا بچے خود ہی کر لیتے تھے۔ صائمہ کے لئے تو بلقیس کی جان جاتی تھی۔ اس کے سکول کے باہر گھنٹوں بیٹھی رہتی کہ کہیں بے وقت چھٹی نہ ہو جائے اور بچی کو کسی طرح کی تکلیف نہ ہو۔ یہ دیکھ کر مجھے اکثر اپنی دادی یاد آجاتی جو سارا سارا دن کوڈھیوڑہ کے سکول کے باہر اپنے پیارے پوتے کی چھٹی ہونے کا انتظار کرتی رہتی۔

اللہ کے فضل سے میری اولاد بھی اچھی نکلی۔ خود ہی پڑھ گئے اور اچھے پڑھ گئے۔ ہارون عرفان نے خود ہی امریکہ کے وظائف حاصل کئے اور بہترین یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی۔ ہارون کولگیٹ یونیورسٹی سے معاشیات میں گریجوایشن کر کے سٹی بینک میں ملازم ہو گیا اور عرفان کولمبیا یونیورسٹی سے گریجوایشن ہی نہیں ماسٹرز کی بھی دو ڈگریاں لے چکا ہے۔ انجم میڈیکل ڈاکٹر ہے۔ سائرہ نے ایم بی۔اے کیا ہے تو صائمہ بھی پیچھے نہیں رہی۔ یہ سب بلقیس کا کمال تھا۔ یا ان بچوں کی نانی کا کہ انہوں نے میاں شفیع جیسی عظیم ہستی کے بے وقت اٹھ جانے کے بعد کمال حوصلہ اور بردباری سے پوری فیملی کو سنبھالا ہی نہیں پار لگا دیا۔ وہ بھی ایک عجیب داستان ہے سننے کی نہ سنانے کی۔ اللہ انسانوں کو کیا کیا حوصلے دیتا ہے یہ اسی کا کرم ہے۔

Marfat.com

ناگہانی موت

وسط اکتوبر ۱۹۶۶ء میں مجھے آرمی ٹریننگ کے لئے کوئٹہ جانا پڑا تو میں نے بلقیس اور ہارون کو لاہور بھجوا دیا۔ کوئٹہ سے میں تقریباً ہر روز بلقیس کو خط لکھتا اور وہ بھی مجھے لکھتی رہتی۔ یوں زندگی مزے سے گزر رہی تھی۔ ۱۶۔ دسمبر کی شام میں اپنی فوجی تربیت مکمل کر کے کوئٹہ سے یہ امنگ لے کر بولان میل پر سوار ہوا کہ میں اور بلقیس ایک دفعہ پھر کوٹری اکٹھے ہو جائیں گے۔ بلکہ میں نے اپنی روانگی اور بلقیس کی آمد کا پورا تفصیلی پروگرام لکھ کر لاہور بھجوا دیا۔ بلقیس بھی پیا گھر جانے کی تیاری کر رہی تھی۔

مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ کہتے ہیں نہ کر جہاں سکھ وہاں دکھ اور جو المیہ گزرنے کو تھا وہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

جیکب آباد ریلوے سٹیشن پر میری گاڑی آدھی رات کو رکی تو مجھے جگا کر ایک ٹیلیگرام تھمائی گئی اور میری جان نکل گئی۔ لکھا تھا:۔

''میاں محمد شفیع لندن میں فوت ہو گئے۔ فوراً لاہور پہنچو۔ بلقیس پریشان و ہلکان ہے'' میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ میری سانس نکلے نہ چیخ۔ بس دم رک سا گیا۔ یقین ہی نہ آئے۔ یہ خبر اتنی غیر متوقع اور ناگہانی تھی کہ میرے اعصاب جواب دے گئے۔ مجھے معلوم تھا کہ بلقیس پر کیا گزر رہی ہوگی۔ سب پر کیا گزر رہی ہوگی۔ اور تو اور مجھ پر یہ خبر بجلی بن کر گری۔ میاں صاحب کے بچوں پر کیا قیامت ٹوٹ پڑی ہوگی۔ ہماری خوشدامن کی

Marfat.com

دنیا ہی اجڑ گئی۔ ان کا کیا حال ہو گا بس کلیجہ پھٹنے کو تھا۔ طرح طرح کے خیال آ رہے تھے۔ پھر میں نے سوچا کہ کوئی ضرور غلط فہمی ہوئی ہے۔ مولوی عبدالعزیز صاحب بیمار تھے۔ گنگا رام ہسپتال داخل تھے شاید وہ فوت ہوئے ہوں گے۔ یونہی جلدی میں ریلوے والوں سے غلطی ہو گئی ہے۔ یہ سوچ کر مجھے تسلی ہی نہیں بلکہ یقین سا ہونے لگا کہ ضرور غلطی ہوئی ہے۔ میاں صاحب تو اچھے بھلے تھے۔ ابھی ان کی عمر ۵۶ سال تھی۔ انہوں شوگر ضرور تھی مگر بالکل صحت مند دکھائی دیتے تھے۔ میں نے تار کو بار بار پڑھا۔ تار میاں صاحب کے کزن ربانی صاحب کی طرف سے تھا جو ریلوے میں بہت بڑے افسر تھے ..... میرا دل چاہتا تھا کہ تار کے الفاظ پر نہیں بلکہ اپنے مفروضے پر یقین کروں اور کر لیا۔

ریلوے والوں نے ربانی صاحب کی ہدایت پر میرے لئے لاہور کی ٹرین پر انتظام کر رکھا تھا مگر میں نے سوچا سیدھا کراچی پہنچ کر ہوائی جہاز سے چلوں تو لاہور جلدی پہنچ سکتا ہوں۔ لہٰذا سیدھا کراچی چل دیا۔ کوٹری ریلوے سٹیشن پر میرا سٹاف آیا ہوا تھا۔ انہیں فالتو سامان تھمایا اور کراچی روانہ ہو گیا۔

کراچی پہنچتے ہی میں نے سب سے پہلے اس دن کا اخبار نوائے وقت لیا تو اخبار کی سب سے بڑی خبر تھی کہ میاں محمد شفیع لندن میں رحلت فرما گئے۔ ساتھ ہی میاں صاحب کی تصویر چھپی تھی۔ یہ خبر میرے لئے دوبارہ اندوہناک بنی اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اور انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ کر رہ گیا۔

میرا ہوائی جہاز لاہور کے لئے اڑا تھا تو مجھے لاہور کے متعلق عجیب احساس ہونے لگا۔ وہ شہر جو میاں شفیع کی وجہ سے میرا بنا اس میں اب میاں شفیع نہ ہو گا تو کتنا سونا سونا لگے گا اور یہ سوچ کر میں زار و قطار رونے لگا۔ لاہور جوں جوں قریب آتا جائے میری ہچکی بندھتی جائے۔ اک دکھ سا دکھ تھا کہ بیان سے باہر تھا۔ مجھے اس دن محسوس ہوا بلکہ ایک بہت ہی تلخ ٹھوس حقیقت بن کر محسوس ہوا کہ موت کتنی تکلیف دہ ہو سکتی ہے۔ ہزاروں لوگ روز مرتے ہیں۔ موت کی خبریں آتی ہیں۔ جنگوں میں لاکھوں کروڑوں انسانوں کی موت کے قصے پڑھتے ہیں مگر جو کرب اپنے کسی عزیز اور پیار کرنے والے کی موت پر ہوتا ہے وہ ایک ٹھوس حقیقت بن کر کس طرح آپ کے دل پر چرکے لگاتا ہے۔

Marfat.com

بڑی مشکل سے میں ۸۔اے کلب روڈ پہنچا تو وہاں اک عجیب کہرام مچا تھا۔ بلقیس کی تو حالت دیکھی نہ جارہی تھی۔ ہر بچہ بوڑھا رو رہا تھا۔ پتہ نہیں مجھے کیا ہوا میں نہایت ہی نوجوان ہمت والا انسان تھا مگر گھر میں پہنچتے ہی بے ہوش کر دھڑام سے گر گیا اور مجھے حوصلہ اور صبر کس نے دیا؟ میری بدنصیب ساس نے۔

میں ہوش میں آیا تو بے چاری آنسوؤں کے ساتھ بار بار کہہ رہی تھی

"بیٹا اب تم ہی تو ہمارا سب سے بڑا سہارا ہو۔ اگر تم دل ہار بیٹھے تو ہم کہاں جائیں گے۔ بس صبر۔ ہمیں تو تم نے ہمت دینی ہے۔ جاؤ بلقیس کو تسلی دو۔ سب کو تسلی دو"۔

کمال حوصلہ تھا اس عظیم عورت کا۔ شاید اللہ تعالیٰ ایسے موقعوں پر ایسی غیر معمولی قوت بخش ہی دیتا ہے۔

بلقیس کو ملا تو وہ لپٹ لپٹ کر ایسی روئی کہ جیسے دو سال کا بچہ ہو اور میں بھی رویا کہ یہ دکھ ہی ایسا تھا۔ اتنے بڑے شفیق تناور باپ کی شفقت سے محرومی کتنا دکھی کر سکتی ہے اس کیفیت سے گزرے بغیر انسان اس کا ادراک ہی نہیں کر سکتا۔ یہی حالت تمام بچوں کی تھی۔ احمد تو لندن میں باپ کے ساتھ تھا۔ آمنہ، عباس۔ نجمہ اور ہمایوں ایسے تڑپ رہے تھے جیسے گھونسلے سے باہر چڑیوں کے ننھے بوٹ تڑپتے ہیں۔ انجم سائرہ بار بار کہتیں کہ تم سب لوگ جھوٹ بول رہے ہو۔ ہمارے ابا جی تو ہمارے لئے نئے نئے فراک اور چاکلیٹ لینے گئے ہوئے ہیں۔ ابھی آجائیں گے۔ وہ یہ بات کہتی جائیں اور سب کو رلاتی جائیں۔ انجم خود بھی رونے لگتی۔ اگر گھر کے کسی فرد کو معلوم نہ تھا کہ اس گھر پر کیا قیامت گزر گئی ہے تو وہ صرف ہارون عزیز تھا۔ صرف دس ماہ کا معصوم۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر۔ سب کی آنکھ کا تارا۔ ماں باپ کا کلیجہ ٹھنڈا کرتا مگر آج آگ کی تپش کچھ زیادہ ہی تھی کہ بجھائے نہ بجھے۔

ابھی میں پہنچا ہی تھا کہ گنگارام ہسپتال سے خبر آگئی کہ مولوی عبدالعزیز ہسپتال میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اللہ رحم کرے۔ یہ کیا ہو گیا ہے۔ لگتا ہے موت نے یہ گھر دیکھ لیا ہے۔ ہم سب ہسپتال پہنچے۔ ہماری ساس کی حالت کافی غیر تھی کہ یکے بعد دیگرے اس کے سر سے خاوند اور والد کا سایہ اٹھ گیا۔ محسوس ہوتا تھا کہ سر سے چھت ہی اٹھ گئی ہے۔ سب نے حوصلہ دیا اور سب اس غم میں شریک ہو گئے۔ اگلے دن ان کی تجہیز و تکفین ہوئی۔ مولوی صاحب کی عمر ماشاء اللہ کافی تھی اور کچھ لوگ ان کی رحلت کی توقع بھی کر رہے تھے مگر میاں

Marfat.com

شفیع کی موت کہ سارے شہر بلکہ ملک کو ہلا کے رکھ دیا۔ ان کے مداحین ہر طبقہ خیال سے تھے۔ تمام ملک کے شعراء غمگین تھے تو تمام لکھاری دکھی تھے کہ ان کے ایک عظیم ساتھی جس نے اپنی معرکتہ آلارا کتاب سے ۱۸۵۷ لکھ کر تہلکہ مچا دیا تھا۔ پورے شہر کے خطاط اداس تھے کہ ان کا بہترین استاد ان سے جدا ہو گیا تھا۔ موسیقی خاص طور پر کلاسیکی موسیقی کی چاہت رکھنے والے آج اپنے آپ کو بے سہارا اور یتیم محسوس کر رہے تھے۔ سرکار کا تو پوچھیے ہی مت کہ پوری سرکاری مشینری بیوروکریٹس اور بابو سب ان کے بچھڑنے پر مرجھائے مرجھائے سے تھے۔ ان کی موت کا سن کر جنرل ایوب، جنرل حبیب اللہ، جنرل موسیٰ، خدا بخش، احسان دانش، مولینا مودودی، میاں ممتاز دولتانہ اور اس قبیل کے سینکڑوں ہزاروں لوگ پہنچ گئے مگر جو کرب میں نے عام شہریوں غریبوں مسکینوں کے چہروں پر دیکھا اس کا آپ اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔ اتنے زیادہ لوگوں کی آمد کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ ہم سب لوگ ان کی طرف لگ گئے ورنہ غم کا کوہ ہمالیہ ٹوٹ پڑا تھا۔

۱۹ دسمبر کی صبح جب لندن سے میاں صاحب کی میت لاہور ایئر پورٹ پر پہنچی تو وہ بھی اک عجیب نظارہ تھا۔ لگتا تھا کہ سارا شہر ہی امڈ آیا ہے اور تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ بڑی مشکل سے ان کی میت کو ہجوم سے نکال کر ہم کوئی دو گھنٹے میں ۸۔اے کلب روڈ پہنچے اور پوری جی-او-آر میں سوگوار ہی سوگوار تھے۔ سب کے لئے چہرہ دکھانا مشکل تھا۔ صرف فیملی ممبرز کے لئے پچھلے لان میں چہرہ دکھانے کا اہتمام کیا گیا مگر پھر بھی بہت سے پرستار وہاں تک پہنچ ہی گئے اور بعض لوگ تو دھاڑیں مار مار کر روتے رہے۔

مگر سارے ہجوم میں ایک چہرہ ایسا تھا جس کے غم کے تاثرات مجھے کبھی نہیں بھولتے اور وہ چہرہ تھا مولوی چراغ دین مرحوم کا جو میاں صاحب کے والد محترم تھے۔ وہ میت کے سرہانے کرسی پر بیٹھے تھے۔ سر پر وہی پرانی پگڑی۔ منہ سے کوئی آواز نہ نکل رہی تھی اور نہ آنکھ سے کوئی آنسو مگر اپنے ہونہار اور ہوش مند بیٹے کے چہرے کو دیکھ دیکھ کر جس طرح ان کے چہرے کا رنگ بدلتا سب کچھ بتا رہا تھا کہ غم اتنا زیادہ ہے کہ بیان ہو ہی نہیں سکتا..... اور وہ بے ہوش ہو گئے شکر ہے مولوی عبدالعزیز یہ خبر سنے بغیر ہی بیہوشی کے عالم میں گزر گئے۔ میاں صاحب کی والدہ کا بھی یہی حال تھا۔

Marfat.com

اور پھر میاں صاحب کے والدین چند مہینوں کے اندر اندر اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ شاید اس غم کا بوجھ ہی اتنا زیادہ تھا۔

میاں صاحب کو لاہور کے معروف قبرستان میانی صاحب میں دفنایا گیا۔ جنازہ اٹھا تو لوگ اتنے زیادہ تھے کہ جنازہ قبرستان پہنچ چکا تھا اور لوگ ابھی تک جی۔او۔آر تک قطاروں میں موجود تھے۔

پاکستان کی تمام اخباروں نے میاں شفیع کی ذات اور صدمات پر اتنا زیادہ لکھا کہ آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ یہاں تک کہ سندھی اخباروں نے بھی بہت زیادہ Coverage دی کہ جس کا ہم لوگوں کو اندازہ تک نہ تھا۔ ہمارے دوست عبدالحمید نے اخباروں کے تراشوں کو اکٹھا کیا تو معلوم ہوا کہ ان کو کئی Volumes میں جلد کروانا پڑے گی۔ میاں صاحب مرحوم کے پاس ان کی سب سے بڑی جائیداد ان کی ذاتی لائبریری کی نایاب کتابیں تھیں جو بعد میں ہم لوگوں نے میاں محمد شفیع لائبریری کے نام سے پبلک لائبریری بنا دی۔ لاہور کارپوریشن نے ان کی عظیم خدمات کے صلہ میں لارنس روڈ کا نام میاں محمد شفیع روڈ رکھا۔ ان کی یاد میں لاتعداد مجالس اور محفلیں منعقد ہوئیں۔ نوجوانان پاکستان نامی تنظیم جس کے میاں صاحب خود سرپرست تھے میں ان کی بیٹی آمنہ شفیع نے میاں صاحب باپ کی حیثیت سے ایک ایسا دل ہلا دینے والا مقالہ پڑھا کہ مجھ میں پھر ہمت نہ ہوتی تھی کہ میں ان مجالس کو سن سکوں بلکہ میں نے آمنہ وغیرہ کو منع کیا کہ پہلے ہی بہت سے آنسو اور آہیں موجود ہیں بہتر ہے کہ اس میں مزید اضافہ نہ کریں۔

جانے والا عجیب شخص تھا۔ عظیم شخص تھا اور اپنے پیچھے اتنا بڑا خلاء چھوڑ گیا کہ پر ہو ہی نہیں سکتا مگر کمال ہے ہماری خوشدامن کا کہ انہوں نے تمام فیملی کو اتنے حوصلہ اور مضبوطی سے سنبھالا کہ اپنی اولاد کی نہ صرف بہترین تربیت کی بلکہ ان کے لئے بہترین تعلیم کا بھی بندوبست جاری رکھا اور تمام کو ایک مضبوط و منضبط ڈسپلن میں باندھے رکھا۔

بلقیس کے علاوہ ان کے تمام بچے ابھی غیر شادی شدہ تھے یا زیر تعلیم۔ انہوں نے سب کو سنبھالا ایسا سنبھالا جیسے مرغی خطرہ کے وقت اپنے پروں کے نیچے اپنے بچے چھپا لیتی ہے۔

میں نے اپنا تبادلہ لاہور کروا لیا اور میں نے بھی حتی المقدور ان کا ہاتھ بٹایا مگر وہ میرے اور بلقیس کے لئے بھی عظیم سہارا بنیں..... خاندان میں سب سے زیادہ بوجھ ان کے منجھلے بیٹے عباس شفیع نے

Marfat.com

اٹھایا۔ اپنی تعلیم پوری کی..... انگریزی زبان میں ایم اے کر کے پیشہ تدریس و تعلیم شروع کیا اور ساتھ ساتھ خاندانی شہری اور زرعی جائیداد کا انتظام و انصرام بھی سنبھالا۔

احمد رضا لندن میں چارٹرڈ اکاونٹنٹ کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ انہیں باپ کی موت کے بعد واپس آنا پڑا اور پاکستان کی معروف فرم سن شائن میں اکاونٹنسی کی ملازمت شروع کر لی آمنہ نے ایم اے انگلش کر کے انگریزی کی تدریس شروع کر دی۔

نجمہ کے لیے تعلیم کے دوران ہی ایک بہت اچھا رشتہ آگیا اور ہماری خوشدامن نے اسے امتیاز مسرور CSP سے بیاہ دیا۔ امتیاز مسرور پاکستان سول سروس کے نہایت ہی نیک نام اور قابل ترین افسر ہیں۔

ہمایوں شفیع میرے نقش قدم پر چلتے چلتے پولیس کی اعلیٰ سروس میں آگئے۔ دیانت و امانت باپ کی طرح ان کے نام کی پہچان ہے۔

شاید محنت کے علاوہ اس میں بزرگوں کی دعاؤں اور تربیت کا بہت زیادہ حصہ ہے کہ اصل وراثت روپیہ پیسہ نہیں حسن اخلاق اور اعلی علم و ادراک کی دولت ہے جو اللہ تعالیٰ نے میاں شفیع جیسے نیک انسان کی اولاد کو اس کے بعد بھی عطا کر دی جس کے لئے بیگم شفیع نے بہت ہی زیادہ محنت کی۔

ہماری بیٹی انجم کو انہوں نے میڈیکل ڈاکٹر بنایا اور سائرہ کو ایم۔ بی۔ اے کرایا۔ یہی نہیں میری اولاد ہارون۔ عرفان اور صائمہ کی تمام تر ترتیب اور راہنمائی انہوں نے ہی کی یا بلقیس نے۔ میاں شفیع کی وفات کے بعد میں زیادہ تر لاہور ہی میں تعینات رہا بس تھوڑی مدت راولپنڈی۔ اسلام آباد میں رہا مگر بچے ہمیشہ لاہور میں رہے کہ وہ اپنی عظیم نانی کے سایہ عاطفت میں رہیں۔ میں نے ان کی کیا مدد کرنی تھی۔ انہوں ہی نے ہماری مدد کی۔ شاید میری کوئی نفسیاتی ڈھارس ضرور ان کو ہوگی ورنہ فیملی کے لئے جو کچھ بھی بہتری ہوئی وہ بیگم شفیع کی وجہ سے ہوئی۔ وہ عظیم خاتون تھیں۔ اپنے تمام بچوں کی شادیاں کیں۔ سب روزگار پر لگے۔ انجم سائرہ کے رشتے بھی انہوں ہی نے طے کئے۔ انجم کا نکاح چوہدری و بیگم غلام حسین کے ڈاکٹر بیٹے امجد سے ہوا۔ چودھری صاحب میری برادری سے تھے اور سیالکوٹ اور لاہور کے ڈپٹی کمشنر رہ چکے تھے۔ نہایت ہی شریف اور نیک خاندان ہے اور ہماری خوش قسمتی کہ ہماری بیٹی کو اتنا اچھا رشتہ ملا۔ بیگم شفیع اپنی زندگی ہی میں انجم کا نکاح کر گئی تھیں۔

Marfat.com

سائرہ کی منگنی میاں و بیگم میاں سرور آف مانچسٹر کے بیٹے ہمایوں سے بیگم شفیع نے طے کی۔ ہمایوں لندن سکول آف اکنامکس سے فارغ التحصیل ہیں اور اپنے والد کے ساتھ مانچسٹر میں کاروبار کرتے ہیں۔ ہمایوں میاں احمد علی صاحب مرحوم جنھوں نے میرا اور بلقیس کا رشتہ طے کرانے میں اتنا اچھا کردار ادا کیا تھا کے نواسہ ہیں۔

دونوں بیٹیوں کی رخصتی بلکہ سائرہ کا نکاح بھی بیگم شفیع کے انتقال کے بعد ہوا اور ان دونوں تقریبات میں ہم نے انہیں بہت زیادہ یاد کیا کہ یہ کشتی اتنے زیادہ مسائل و مصائب کے باوجود انہوں نے ہی پار لگائی تھی۔

بیگم شفیع صاحبہ کا انتقال بس یکدم اور عجیب انداز میں ہوا۔ مارچ ۱۹۸۵ء کی بات ہے۔ میری اور ہمایوں شفیع ہم دونوں کی تعیناتی ان دنوں راولپنڈی میں تھی۔ ہماری خوشدامن اپنے تمام پوتا پوتیوں اور نواسہ نواسیوں سے بہت زیادہ پیار کرتی تھیں۔ انہیں اکثر سیر کراتیں اور کہانیاں سناتیں۔ بچے بھی بس انہیں کے ہو کر رہتے اور ہروقت بڑی امی بڑی امی کی رٹ لگائے رکھتے۔ وہ اپنے تمام ان بچے بچونگڑوں کو لے کر راولپنڈی آئیں۔ میں نے ایک دوست سے ایک بہت بڑی ویگن مستعار لی جس میں تمام بچے بیٹھ سکیں اور ایبٹ آباد سیر کے لئے چل دیئے۔ ہم نے ایبٹ آباد کا تمام سرکٹ ہاؤس کمال شاہ ڈی۔ آئی۔ جی ہزارہ کی وساطت سے بک کروا رکھا تھا۔ راستے میں بچے کھیلتے رہے۔ ان کی نانی خوش تھی۔ سائرہ صائمہ خوش تھیں۔ ہمایوں نجمہ عباس سب کے بچے بڑی امی کی کمپنی میں خوش تھے۔ میں اور بلقیس بھی مرنجاں مرنج اونگھتے سوتے چلے جارہے تھے۔ اور یوں ہمارا قافلہ ایبٹ آباد پہنچ گیا۔

رات کو نہایت پر تکلف کھانا کھایا۔ میں اور بلقیس اپنے کمرے میں چلے گئے اور سونے کی تیاری کر رہے تھے کہ صائمہ نے زور زور سے ہمارا دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا اور آوازیں دینے لگی کہ بڑی امی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ فوراً آئیں۔ فوراً آئیں۔

ہم بھاگ کر کمرہ میں پہنچے تو بڑی امی کو سخت پسینہ آیا ہوا تھا اور وہ بھاری بھاری سانس لے رہی تھیں۔ بچوں نے بتایا کہ کہانی سناتے سناتے یکدم ان کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ سب بچے رو رہے تھے کہ بڑی امی کو کیا ہو گیا۔

میں نے کہا میں ابھی ڈاکٹر لے کر آتا ہوں تو کہنے لگیں

Marfat.com

"نہیں بیٹا۔ اب ڈاکٹر کچھ نہیں کر سکتا۔ اب میرا آخری وقت آن پہنچا ہے۔ مجھے معلوم ہے"

میں نے تسلی دینے کی کوشش کی تو کہتی ہیں

"بیٹا میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ ڈاکٹر کو چھوڑو۔ تم میری بات غور سے سنو میں انجم اور سائرہ کو اب تمہارے حوالے کر کے جا رہی ہوں۔ تم میرے ساتھ پکا وعدہ کرو کہ تم ان کی شادیاں اچھی طرح سے کرو گے۔ یہ اب تمہاری ذمہ داری ہے اچھا بچو۔ خدا حافظ" کلمہ پڑھا اور اللہ کو پیاری ہو گئیں۔

عجیب خوبصورت موت تھی۔ موت کا بھی پتہ چل گیا اور آخری لمحہ تک اپنی وہ بھاری ذمہ داری جو اتنے سال پہلے قبول کی تھی وہ انہیں یاد تھی۔ جو انہوں نے نہ صرف پوری کی بلکہ اتنی خوبصورتی سے نبھائی کہ شاید ہی کسی کو نصیب ہو اور پھر ایک مومن کی طرح کلمہ پڑھ کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں۔

جن کی زندگی خوبصورت ہو ان کی موت بھی خوبصورت ہوتی ہے

جسے اللہ دے دے

Marfat.com

زندگی کا پہیہ چلتا رہا

میری خوشدامن بیگم محمد شفیع کی رحلت کے بعد میں نے بہت جلد اپنے اس فرض کی ادائیگی کر دی جو وہ میرے ذمہ لگا گئی تھیں۔ ان کی وفات کے چند ماہ کے اندر اندر انجم کی رخصتی ہو گئی اور وہ اپنے پیا کے گھر سدھار گئی۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ وہ ڈاکٹر امجد کے ساتھ اپنے گھر میں بہت خوش ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ایک نہایت ہی خوبصورت بیٹی ثمر اور دو بیٹوں مرتضےٰ اور مصطفےٰ سے نوازا ہے۔

اسی طرح فروری ۱۹۸۶ء میں سارہ کے ہاتھ پیلے ہوئے اور وہ انگلستان کے شہر مانچسٹر جا بسی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے تین بہت ہی خوبصورت بیٹوں، حسن، قیس اور جمال مصطفےٰ سے نواز رکھا ہے۔ یہ سب ان کے نانا اور نانی کی نیک دعاؤں کا صلہ ہے۔

میرے چھوٹے بیٹے عرفان نے زبردست کامیابی حاصل کی اور امریکہ کی معروف کولمبیا یونیورسٹی نیویارک کا وظیفہ حاصل کر کے وہاں داخلہ لے لیا اور مزید تعلیم کے لئے وہاں چلا گیا۔

ہارون اس وقت لاہور انجنیئرنگ یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھا۔ اس نے چھوٹے بھائی سے پیچھے رہنا پسند نہ کیا اور امریکہ کے معروف کالج گولگیٹ جا پہنچا اور معاشیات کے تحصیل علم میں جت گیا۔

Marfat.com

صرف صائمہ ہمارے ساتھ رہ گئی۔ وہ تو شکر ہے کہ بلقیس نے جب میرے لاہور سے باہر تبادلے ہونا شروع ہوئے تو اباجی اور اماں جی کو گاؤں چھوڑنے پر منالیا اور وہ ہمارے ساتھ رہتے تھے وگرنہ گھر کاٹنے کو آتا۔ بہرصورت زندگی اسی کا نام ہے۔ شروع ہوتی ہے بکھرتی ہے اور پھر اکٹھی ہوتی رہتی ہے۔ ہارون اور عرفان کے امریکہ چلے جانے کے بعد ہمارا گھر بہت ہی بے آباد ہو کر سونا سونا سا ہو گیا..... بلقیس بہت اداس ہو جاتی اور ہر وقت اپنے بیٹوں کو یاد کرتی رہتی۔ میں تو دفتر میں مصروف ہو جاتا مگر وہ بے چاری گھر میں بیٹھی بہت اکتا جاتی۔ صائمہ سکول اور بعد میں کالج چلی جاتی اور بلقیس بے چاری تنہائی کا شکار ہو گئی۔ یہ بلقیس کے لئے بد ترین وقت تھا۔ کبھی اباجی اماں جی کے گوڈوں کے ساتھ لگ کر روتی اور کبھی اپنے بہن بھائیوں سے جاکر اپنے دکھ درد کرتی مگر ایک نہایت ہی بے تاب روح کی طرح تڑپتی رہتی۔ جیسے پانی کے بغیر مچھلی۔

مجھے میری والدہ اور والد نے بہت دفعہ کہا کہ تم نے بیٹوں کو آخر باہر کیوں بھیج رکھا ہے تم بھی تو یہیں سے پڑھے ہو۔ اچھے بھلے افسر ہو۔ انہیں یہیں لے آؤ اور افسر بناؤ وگرنہ بلقیس ان کے بغیر تڑپ کر مرجائے گی۔ مجھے بلقیس پر غصہ بھی آتا اور ترس بھی کہ یہ زندگی کے حقائق ہیں۔ لڑکیاں تو خیر دوسروں کے گھر کا دھن ہوتی ہی ہیں لڑکوں کو بھی باہر جاکر قسمت آزمائی کرنا ہوتی ہے مگر میری اپروچ بالکل سطحی عملی اور دنیاوی تھی اور وہ ممتا کی ماری۔

بہرصورت ہارون اور عرفان کی تعلیم کا بھی وقت کٹ گیا۔ ہارون ۱۹۹۱ء میں ٹی بینک لاہور میں بہت اچھی سطح پر ملازم ہو گیا اور عرفان کو اس کی علم طلبی لمز (LUMS) یعنی لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز میں تدریس کی طرف لے گئی۔ اور یوں ایک دفعہ پھر ہم لوگ اکٹھے ہو گئے کہ یوں ہی صبح ہوتی ہے اور شام ہوتی رہتی ہے۔ اسی کا نام زندگی ہے۔

اسی زمانہ میں مجھے آئی۔ جی پولیس پنجاب کا چارج دیا گیا جو ایک بہت ہی ذمہ دار اور مصروف پوسٹ ہے۔ بلقیس میرے آئی۔ جی لگنے کے سخت خلاف تھی کہ وہاں کام بہت ہو گا۔ اسے اپنے اباجی کی مصروفیات بہت اچھی طرح سے یاد تھیں اور ہمیشہ کہتی کہ اباجی کو ان کی مصروفیات لے بیٹھیں۔ تم یہ نہ کرنا۔ میں تمہیں کھونے کا رسک نہیں لے سکتی۔ وہ بار بار کہتی کہ تمہیں شوگر ہے۔ اباجی کو بھی شوگر تھی۔ تم کوئی پر سکون اور اطمینان کی نوکری کرو حالانکہ وہ خود بھی شوگر کی مریضہ تھی مگر زندگی کچھ اسی طرح سے ہے۔

Marfat.com

صبح ہوتی ہے شام ہوتی

ہے

زندگی یونہی تمام ہوتی

ہے

اس دوران میری والدہ کی صحت بہت خراب ہوگئی۔ ان کے تمام پوتے پوتیاں' نواسے نواسیاں وہیں ان کے پاس تھے۔ ہروقت خدمت کرتے۔ ہر طرح کا خیال رکھتے مگر کچھ عمر کا تقاضا تھا اور بہت سی بیماریاں بھی امڈ آئی تھیں۔ ان کے خدمت گزاروں میں ان کی نواسی کوثر اور نواسے عبدالواحد نے تو کمال کر دیا۔ مگر بلقیس بھی پیچھے نہ تھی۔ اس کی تو جان اماں جی میں تھی۔ اصل میں وہ اپنا تمام رونا دھونا ان ہی کے ساتھ کرتی تھی۔

صحت زیادہ خراب ہوئی تو انہیں سروسز ہسپتال داخل کروانا پڑا۔ ان کے تمام نواسے نواسیاں وہیں دن رات ان کے پاس ہوتے۔ بلقیس بھی وہیں ہوتی۔ میں صبح اور شام ہسپتال میں حاضری دیتا۔ ۲۷ اکتوبر ۱۹۹۱ء کو مجھے کسی ضروری میٹنگ کے لئے راولپنڈی جانا تھا۔ میں صبح صبح اٹھ کر ان کے ہسپتال گیا اور بتایا کہ پنڈی جا رہا ہوں شام کے جہاز سے لوٹ آؤں گا۔ کہتی ہیں بیٹا تھک جاؤ گے۔ اگلے دن آجانا۔ یہ نہ سوچنا کہ ماں بیمار ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ انہیں شدید درد رہتا تھا مگر اپنے لاڈلے کا دل رکھنے کے لئے ایسے ہی جھوٹ موٹ کہہ رہی ہیں کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ہائے ری ممتا۔ تو کیا چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کیسی چیز پیدا کر رکھی ہے۔

اور پھر مجھے سفر کی مکمل تفصیلی ہدایات دیں کہ تمہارا اکثر پیٹ خراب ہو جاتا ہے یہ سب بیماری ان کمبخت مہاجر کیمپوں نے میرے بچے کو لگا دی۔ ادھر ادھر سے پانی نہ پینا۔ غلط جگہ سے کھانا نہ کھانا۔ دوپہر کو آرام کرنا وغیرہ وغیرہ۔

اور جب میں شام کو واپس ہوائی جہاز سے لوٹ کر سیدھا ہسپتال پہنچا تو ڈانٹ پڑ گئی کہ خواہ مخواہ اپنے آپ کو تھکا رہے ہو۔ بلقیس کی ڈیوٹی لگی کہ اسے سیدھا گھر لے کر جاؤ۔ گرم پانی سے نہائے اور آرام کرے خبردار ادھر ادھر ہسپتالوں وغیرہ میں نہ گھومے۔

Marfat.com

اگلے دن صبح گیارہ بجے باقاعدہ اپنی نواسی کوثر کے سہارے باتھ روم گئیں کہ کسی طرح بھی آخری دم تک کسی کا محتاج ہونا گوارا ہی نہ تھا۔ خود طہارت کی کہ ہر وقت باوضو رہنا زندگی کا معمول تھا۔ باہر نکلیں۔ اپنے لاڈلے کو باہوں میں لیا۔ پیار کیا۔ کلمہ پڑھا اور اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ کسی کو تکلیف نہ دی۔ ہر کسی کی خدمت کرتے کرتے اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ اور اپنے لاڈلے بیٹے آئی۔ جی پنجاب کی صحت اور آرام کا آخری وقت میں بھی اتنا خیال کہ اپنا پتہ ہی نہیں؟

ماں کی صحت کچھ دیر سے بہت خراب تھی اور ان کی عمر بھی اسی سال سے اوپر تھی اور ان کی رحلت کوئی اتنی غیر متوقع بھی نہ تھی مگر جب وہ لمحہ آیا تو پتہ نہیں مجھے کیا ہوا کہ میں بلبلا اٹھا۔ مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے میرے ارد گرد سے کوئی حفاظتی دیوار گر گئی ہے۔ میں اس دنیا میں بالکل تن تنہا اور ننگا ہو گیا ہوں کہ میری ماں نے تو کلمہ درود پڑھ کر ایک پتلی سی چادر دے کر چلتی گولیوں میں مجھے امرتسر کے پاس بالکل بے خوف کر دیا تھا۔ کیا وہ حفاظتی دیوار اب گر گئی ہے؟ ہاں میرے سامنے ڈھیر تھی اور میں خود بھی ڈھیر تھا۔

یہ داستان حیات ہے کہ حیات ہے نام دکھ کا درد کا۔ احساس کا جس درد و احساس کا خوبصورت ترین مظہر ماں کی ممتا ہے۔

میں نے ممتا کے موضوع پر اخبار میں کالم لکھا تھا کہ وہ میرے دل کی آواز تھی۔ میں اسے یہاں دہرانا چاہتا ہوں:

Marfat.com

رب کا روپ.....ماں

ہیلری کلنٹن اپنے معمول کے کالم میں لکھتی ہیں کہ مجھے بھی اپنی بیٹی کی فکر ہے جو اپنی تعلیم کے لیے ہم سے دور رہتی ہے۔ عام مادرانہ فکر کے علاوہ اسے یہ تشویش بھی لاحق رہتی ہے کہ اسے صدر امریکہ کی دختر ہونے کی وجہ سے ایک عام نو عمر دوشیزہ کی زندگی نہ مل سکے۔ صدر امریکہ کی بیٹی کے حوالے سے اسے سلامتی کا خدشہ بھی لاحق رہتا ہے۔ وہ ضرورت سے زیادہ دوسروں کی توجہ کا مرکز بن کر اپنی نجی زندگی کی راز داری نہ کھو بیٹھے اور عام آدمی کی زندگی کے زیر و بم اور چیلنجوں سے محروم رہ کر کوئی مختلف النواع شخصیت نہ بن جائے۔

بچوں کے لیے فکر مندی سے سوچنا' ان کی دیکھ بھال کرنا اور احتیاط کرنا ہر ماں کی فطرت ہے یہاں تک کہ یہ جذبات اور عمل جانوروں کی دنیا میں بھی اسی طرح موجود ہیں جس طرح انسانی دنیا میں ہے بلکہ انسانوں سے بھی بڑھ کر۔ ہر ماں یہ جبلت اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتی ہے اور ایک نسل سے دوسری نسل میں اپنے تخلیقی عمل سے آگے تبدیل کرتی جاتی ہے۔ یہ عمل تخلیق اور بقائے کائنات کا ایک لازمی جزو اور تسلسل ہے۔ رحمت کا یہ حسین عطیہ اصل میں خالق کل ہی کی طرف سے مخلوق کو ملا ہے اور یہ اس کی شفقت بے پایاں کا معمولی سا عکس ہے جو اس نے ماں کی شکل میں ظاہر کر رکھا ہے۔

Marfat.com

حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کا ایک مشہور واقعہ ہے کہ ایک صحابی رفع حاجت کے لیے باہر گئے' جھاڑیوں کے پیچھے چڑیا کے بچے دیکھے۔ ننھے ننھے بچے انہیں بہت بھلے لگے اور انہیں اپنی چادر میں لپیٹ کر چل پڑے' بچوں کی ماں چڑیا اپنی ممتا کی وجہ سے تڑپ اٹھی اور اپنے بچوں کو محبوس کرنے والے صحابی پر اپنے نحیف و نزار بال و پر سے حملہ آور ہو گئی کہ اپنے بچوں کو آزاد کرا سکے۔ وہ مسجد نبوی تک حملہ کرتی ہی رہی اور اپنے بچوں کی خاطر اپنی جان تک کی پرواہ نہ کی..... ماں کے جذبہ ترحم کا یہی تقاضا تھا اور وہ اس نے پورا کر دیا۔

قدرت یہ نظارہ دیکھ رہی تھی' رحمتہ للعالمین کی نگاہ جب اس منظر کی طرف اٹھی تو آپ نے مدینہ میں موجود تمام مومنین کو بلا لیا اور اپنے مختصر و موثر خطاب میں اس نحیف و نزار ماں کی محبت و ایثار کا نقشہ پیش فرما کر صحابہ سے پوچھا کہ ماں کی محبت کا آپ کو اندازہ ہوا' سب نے عرض کیا کہ 'ہاں' بالکل۔ واقعی ماں کی محبت سمندروں سے بھی بڑھ کر بیکراں ہوتی ہے' اس کا کوئی حساب نہیں لگا سکتا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ اب آپ اندازہ لگائیں کہ خالق کل کی محبت اپنی مخلوق کے لیے کتنی زیادہ ہے' ایک عام ماں سے بھی ۷۰ گناہ زیادہ اور پھر قرآن مجید میں خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایک ہی تو چیز ہے جس کا قادر مطلق نے خود ہی اپنے آپ کو پابند کر رکھا ہے اور وہ ہے رحمت ..... اس کی بے پایاں رحمت۔ کہ کوئی اسے نہ مانے تو بھی اسے رزق دیتا ہے بلکہ فراواں دیتا ہے کہ آزمائش ہی سہی ..... بسم اللہ نہ پڑھنے پر حضرت ابراہیم اپنے مہمان سے خفا ہو جاتے ہیں مہمان دستر خوان سے اٹھ جاتا ہے تو پیغمبروں کے جد امجد ابراہیم سے خود خدا خفا ہو جاتا ہے اور اس وقت تک خفا رہتا ہے کہ جب تک اس خدا کا نام نہ لینے والے کو وہ ڈھونڈ نہیں پاتے ..... خدا کی رحمت بے حد ہے بلا شرط ہے۔ ہاں رہنمائی کا ذریعہ عرفان حق و اقرار حق بذات خود اک رحمت عظیم ہے۔ یہی ربانی خاصیت جو ماں کی سرشت میں ہے' بگڑے اور ناخلف بیٹے کو بھی وہ بھوکا نہیں دیکھ سکتی سمجھاتی بھی ہے اور تڑپتی بھی ہے' سزا بھی دیتی ہے اور آنسو بھی بہاتی ہے .....

انسان کامل فخر موجودات رحمتہ اللعالمین حضرت محمد مصطفیٰ کے ریاستی ادائے فرض میں بھی آپ کو رحمت ہی رحمت نظر آتی ہے ..... ضمیر کی ستائی مومنہ حاضر ہو کر اقرار جرم کرتی ہے۔ آپ اپنا منہ دوسری طرف موڑ لیتے ہیں وہ دوسری طرف جا کر اقرار کرتی ہے۔ آپ پھر منہ موڑ لیتے ہیں اور وہ تیسری دفعہ بحر صداقت میں ڈوبنے کے لیے اقرار کرتی ہے تو پھر جا کر تعزیر واجب ہوتی ہے۔ رحمت و ربوبیت کا پلا کتنا بھاری ہے ..... یونہی ایک ماں اپنے بیٹے کی سزائے موت معاف کرانے کے لیے

Marfat.com

حاکم دو جہاں کے پاس حاضر ہوتی ہے' ماں کا دکھڑا سن کر آپ آبدیدہ ہو جاتے ہیں' وہ روتی جاتی ہے تو آپ بھی رونے سے رک نہیں سکتے' آنسو جاری رہتے ہیں۔ ماں ماں ہے' قاتل کی ماں بھی ماں ہے۔ قاتل کی ماں کا دکھ بھی اتنا ہی دلدوز ہے جتنا کسی بھی ماں کا اور شاید عام ماں سے بھی بڑھ کر کہ دکھ سزا ہی کا نہیں تربیت میں کوتاہی کا بھی ہے۔ غفلت و گمراہی کا بھی ہے مگر اللہ کی طرف سے ریاستی ادائے فرض بھی اہم ہے بلکہ لازم ہے' معافی کا اختیار بھی سربراہ مملکت کو نہیں' اس سربراہ کو بھی نہیں جس کا حکم اس کے ماننے والوں کا حصہ ایمان ہے۔ اختیار صرف وارث کو ہے' وہاں سے معافی نہیں ملی تو سزا دینا ہی پڑی مگر ماں کا دکھ کہ اس میں برابر کی شمولیت ہے' شعوری ہی نہیں جذباتی و فطری بھی کہ وہ دکھ ہی ایسا ہے۔

آپ کا اپنا داماد جنگ بدر میں کفار کی طرف سے لڑتا ہوا جنگی قیدی بن جاتا ہے۔ حضرت خدیجہ کا بیٹی کو پیار سے دیا ہوا ہار فدیہ کے طور پر آپ کے سامنے آجاتا ہے تو آپ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی جاری ہو جاتی ہے۔ کہ ایک ماں نے وہ ہار پیار سے اپنی بیٹی کو دیا تھا..... یہی نہیں اس کتیا کی قسمت دیکھیے جو فتح مکہ کے وقت فاتح لشکر سے اپنے بچوں کو بچانے کے لیے کوشاں ہے' گلیاں سنسان ہیں' سب دروازے بند ہیں کہ یہی اعلان عافیت ہے۔ کتیا ایک بند دروازہ سے دوسرے بند دروازہ کی طرف جاتی ہے کہ مبادا اس کے بچے لشکر عظیم کے پاؤں نیچے روندے جائیں آپ کی نگاہ کرم اس ہراساں کتیا ماں پر پڑتی ہے۔ آپ اس کا درد محسوس کرتے ہیں اور دس ہزار کا جری لشکر آپ کے حکم سے وہیں کھڑا ہو جاتا ہے جب تک اس ماں کو اپنے بچے سنبھالنے کی مہلت نہیں مل جاتی واہ واقعی ماں اس کی رحمت کا سایہ ہے' اسی لیے تو ہم پنجابی میں کہتے ہیں ماواں ٹھنڈیاں چھاواں۔

خود خدا نے صفا اور مروہ کو ماں کی محبت و ایثار کی علامت کے طور پر قابل پرستش بنا دیا ورنہ کیا ہے دو چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں مگر وہاں تو متفکر ماں اپنے بیٹے اسماعیل کی پیاس سے پریشان سات چکر کاٹتی ہے جلدی جلدی فکر مندی سے اور وہ ادائے ممتا ہی طریق عبادت ٹھہرا کہ ماں کی محبت رب کا ہی ایک روپ ہے۔

جب نپولین پورے یورپ کا شہنشاہ تھا تو اس نے اپنے باقی چھ بھائیوں کو بھی مختلف ملکوں کا بادشاہ بنا دیا تھا مگر ان سات بادشاہوں کی ماں ہمیشہ ان کے لیے متفکر رہتی تھی اور اس وقت بھی وہ اپنے پرانے گھر میں رہتی تھی اور اپنے بادشاہ بچوں کے لیے ہر روز کھانے کا بندوبست کرتی

Marfat.com

رہتی تھی' چیزیں اکھٹی کرتی' لباس بناتی اور بہت متفکر رہتی۔ ان سات بادشاہوں کی ماں کی ایک پرانی سہیلی سے رہا نہ گیا اور کہنے لگی کہ تمہارے ساتوں کے سات بیٹے بادشاہ ہیں تم ان کا اتنا زیادہ فکر کیوں کرتی ہو۔ بادشاہوں کی ماں کہتی ہے بس کچھ پتہ نہیں کہ کب ان بادشاہوں کی بادشاہت ختم ہو جائے اور وہ بیچارے بھوکے پیاسے ماں سے روٹی مانگنے آ جائیں ماں واقعی ماں ہے ہر رنگ میں اور ہر موقع پر ماں ہے' پیدا کرنے والے کی اس دنیا میں شناخت ہے۔

میری اپنی والدہ مرحومہ کی یہی حالت تھی اللہ انہیں اپنے غلاف رحمت میں رکھے۔ ۲۷ اکتوبر ۱۹۹۱ء کی صبح مجھے کسی اہم اجلاس کے لیے راولپنڈی جانا تھا میری ماں بہت بیمار تھیں' سروسز ہسپتال میں داخل تھیں' آنکھوں کی بینائی جواب دے چکی تھی مگر ہوش و حواس اچھی طرح سے قائم تھے۔ میں لاہور سے باہر نہیں جانا چاہتا تھا مگر ادائے فرض بھی ایک عجیب جذبہ ہے۔ میں اس وقت پنجاب کا آئی جی پولیس تھا میں نے بادل نخواستہ ماں سے راولپنڈی جانے کی اجازت مانگی' اجازت فوراً مل گئی مگر ساتھ لبی نصیحتیں کہ آرام سے جانا..... میری بیماری کی وجہ سے واپسی میں جلدی نہ کرنا تھک جاؤ گے۔ میں نے کہا جہاز سے جاؤں گا اور جہاز سے ہی آؤں گا۔ ہوائی جہاز سے انسان نہیں تھکتا۔ فرمایا نہیں بیٹا سفر سفر ہی ہوتا ہے۔ پتہ نہیں چلتا آدمی تھک جاتا ہے شام کو واپس مت آنا' تھک جاؤ گے ..... خبردار اس خیال سے جلدی کی کہ ماں بیمار ہے میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں' سب ہی تو میرے پاس ہیں اچھا یہ بتاؤ کھانا کہاں سے کھاؤ گے' بہتر ہے کہ تم گھر کا پکا کھانا ساتھ لے جاؤ' تمہارا پیٹ بہت جلد خراب ہو جاتا ہے' ہاں دوپہر کو سو لینا۔ میں نے کہا کہ میں پولیس کا بہت بڑا افسر ہوں۔ سب لوگ میرے آرام کا خیال رکھتے ہیں' صاف ستھرا کھانا تیار کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ مگر میری بیمار بہت ہی بیمار ماں کو میری باتوں پر قطعاً یقین نہیں تھا۔ وہ سراپا محبت و تفکر بنی کھڑی تھیں انہیں اپنی شدید بیماری بلکہ اپنی زندگی کی آخری اور جان لیوا بیماری کا ذرہ بھر فکر نہ تھا ..... فکر تھا تو اپنے صاحب اختیار بیٹے کے آرام کا' شام کو میں واپس آ گیا حاضری دی تو پہلی بات ہی یہی کہی کہ بیٹا بہت تھک گئے ہو گے' کیوں واپس بھاگے آئے' جاؤ گھر جا کر ذرا آرام کر لو۔ ذرا تامل کیا تو سختی سے کہا کہ جاؤ آرام کرو یہ میرا حکم ہے اور اگلے دن ۲۸ اکتوبر کی صبح وہ متفکر ماں اپنی زندگی کے آخری سانس لے کر اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ ماں مرتے دم تک پیار ہی پیار ہے' رب ذوالجلال کا احسان ہے' اس دنیا میں اس کی رحمت کا روپ ہے..... بے لوث الفت۔

Marfat.com

ہائے موت کہ تجھے موت کیوں نہ آگئی

مانا کہ موت کا ایک وقت معین ہے مگر بعض موتیں بہت ہی بے موقع' غیر متوقع اور دلخراش ہوتی ہیں۔ ۱۸ جولائی ۱۹۹۲ء کی صبح بلقیس نے اپنے پیٹ میں معمولی سی خرابی کی شکایت کی اور پھر Entox کی ایک دو گولیاں کھالیں۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

چند لمحوں بعد اس نے کہا کہ شام کو ہم لوگ خواجہ شریف غفور صاحب کے گھر ان کی بیٹی شارمین سے ہارون کی شادی کی بات کے لئے چلیں گے۔ مگر میں نے اپنی مصروفیت کے مد نظر کہا کہ کسی دن اور سہی۔ بلقیس کو کوئی تکلیف نہ تھی اور نہ ہی وہ کوئی زیادہ بیمار نظر آ رہی تھی میں دفتر چلا گیا۔

اگلے دن یعنی ۱۹ جولائی کی صبح صبح میاں منظور احمد وٹو صاحب جو اس وقت پنجاب اسمبلی کے سپیکر تھے کسی کام سے میرے گھر آئے اور میں کافی دیر ان کے ساتھ محو گفتگو رہا۔ وہ گئے تو میں نے دیکھا کہ بلقیس ٹی۔ وی روم میں بیٹھی ہے۔ مجھے دفتر کی جلدی تھی۔ میں نے بلقیس میں کوئی خاص بیماری کے آثار نہ دیکھے۔ ویسی ہی لگ رہی تھی جیسے کہ پہلے تھی۔ البتہ اس کا رنگ کچھ زرد زرد سا محسوس ہوا مگر میں سمجھا کہ پیٹ کی خرابی سے کچھ کمزوری ہو گئی ہوگی۔ بلقیس نے کوئی شکایت بھی نہ کی اور میں دفتر چلا گیا۔

Marfat.com

میں دفتر سے کوئی تین بجے سہ پہر واپس آیا تو باباجی (والد صاحب) کو بہت غصے میں پایا۔ بولے سردار! تم بہت فضول آدمی ہو۔ تمہیں پتہ ہی نہیں کہ بیگم بے چاری ہسپتال میں پڑی ہے اور تمہیں دفتر کی پڑی ہے۔

ہیں! ہسپتال میں پڑی ہے اور مجھے خبر تک نہ ہے۔ مجھے اطلاع کر دی ہوتی۔ بھئی اطلاع تو تبھی کرتے اگر تم فون پر ملتے۔ تمہاری میٹنگیں ہی ختم نہیں ہوتیں۔ جاؤ بیگم کا پتہ کرو۔ چھوڑو سب کام۔ فضول آدمی کہیں کے۔

باباجی کی یہی عادت تھی اور ایسے ہی جھڑکتے رہتے تھے۔ کوئی بھی ان کی بات کا برا نہیں مناتا تھا۔ سب کو پتہ تھا کہ ان کے سخت الفاظ کے پیچھے کتنی محبت چھپی ہوتی تھی اور میرے ساتھ تو وہ سب سے بڑھ کر الفت کرتے تھے۔

میں ابھی ہسپتال چلنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ نجمہ میری سالی کا ہسپتال سے فون آگیا کہ آپ ذرا ہسپتال آجائیں۔ میں نے بلقیس کا حال پوچھا تو کہتی ہے کہ ٹھیک ٹھاک ہے۔ بس ایسے ہی دل چھوڑے بیٹھی ہے۔ بار بار کہتی ہے کہ میں نے اب نہیں بچنا۔ جلدی سے سردار کو بلاؤ۔ نجمہ کا یہ کہنا تھا کہ میری تو جان نکل گئی۔ شاید میری چیخ ہی نکل گئی ہو۔ نجمہ نے مجھے تسلی دی کہ بھئی آپا بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ آپ ویسے ہی آجائیں۔

میں نے بھاگ کر گاڑی میں چھلانگ لگائی اور ہسپتال پہنچ گیا۔ دیکھنے میں بلقیس بالکل ٹھیک ٹھاک نظر آرہی تھی مگر اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اسے سخت درد ہے۔ میں نے پوچھا تو بتایا کہ اس کے پیٹ میں شدید درد اور جلن ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ سارا جسم آگ میں جل رہا ہے۔ اور مجھے بہت گرمی لگ رہی ہے۔ میں نے دیکھا تو کمرے کا ایئرکنڈیشنر پوری رفتار سے چل رہا تھا۔ کمرہ کافی حد تک ٹھنڈا بھی تھا مگر اسے گرمی کی بہت زیادہ شکایت تھی۔ میں نے پرویز مسعود چیف سیکریٹری پنجاب اور وزیر صحت چوہدری جعفر اقبال کو فون کیا تو انہوں نے پورے ہسپتال کے عملہ کو ہلا کر رکھ دیا کہ اس سے زیادہ ٹھنڈا کمرہ دو۔ اور چند لمحوں میں وہ خود بھی ہسپتال پہنچ گئے۔

اس دوران ایک ڈاکٹر نے مجھے چل کر ایک کمرہ دیکھنے کو کہا۔ وہ اوپر والی منزل پر تھا اور میں نے بھاگ کر سیڑھیاں چڑھنا شروع کر دیں بلکہ پھلانگنا شروع کر دیں۔ اتنے میں میں دیکھتا ہوں کہ ایک نہایت ہی سیاہ کالی موٹی تازی بلی تیزی سے میرا راستہ کاٹتے ہوئے ہمارے سامنے

Marfat.com

سے گزرتی ہے۔ کالی بلی کو دیکھنا تھا کہ میرا ماتھا ٹھنکا کہ اللہ خیر کرے حالانکہ میں ان چیزوں اور روایات پر ذرا بھر اعتقاد نہیں رکھتا مگر اس وقت میری ذہنی حالت کچھ ایسی تھی کہ اس وقت اس بلی کا گزرنا' مجھے بہت شاق گزرا اور یہ بات میرے دل سے نہ نکلی۔ در حقیقت اب تک نہیں نکل سکی اور میری روح کا کوئی حصہ پکار اٹھا کہ ہو نہ ہو کوئی المیہ ہونے کو ہے۔ خیر میں دعا کرتا رہا۔ وہ کمرہ تو مجھے پسند نہ آیا۔ اسی منزل پر ایک اور زیادہ ٹھنڈا کمرہ میسر ہو گیا مگر بلقیس کا تو شاید کلیجہ پھٹ چکا تھا اسے ٹھنڈک کہاں محسوس ہو سکتی تھی۔

ہارون اور عرفان ان دنوں لاہور ہی میں تھے وہ بھی پہنچ گئے مگر ہماری تینوں بیٹیاں ملک سے باہر تھیں سائرہ تو ویسے ہی مانچسٹر میں رہتی تھی مگر انجم اپنے چھوٹے بیٹے مصطفےٰ کے کسی اپریشن کے سلسلہ میں نیویارک گئی تھی اور ساتھ صائمہ کو بھی لے گئی تھی۔

.....ادھر بلقیس نے صائمہ! صائمہ کی رٹ لگا رکھی تھی۔ صائمہ کو فوراً بلاؤ۔ اسے کیوں نیویارک جانے دیا اور میں اسے جھوٹی تسلیاں دیتا رہا کہ ابھی پہنچتی ہے۔ ابھی پہنچ جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ بلقیس کو اس وقت صائمہ کی بہت فکر کھائے جا رہی تھی۔ ماں کا دل سب کی طرف سے مطمئن تھا مگر وہ سمجھ رہی تھی کہ صائمہ ابھی بہت چھوٹی ہے اور اس کی فکر اسے ستا رہی تھی۔

ڈاکٹروں نے تمام ٹیسٹ کر لئے۔ تمام پاپڑ بیل لئے مگر زردی اور گرمی کا احساس بلقیس کو تڑپاتا ہی رہا۔ آدھی رات گزرے اس کے پیٹ کے اندر Bleeding شروع ہو گئی اور خون کی ضرورت پڑی۔ سب سے پہلے خون ہارون نے دیا کہ اس کا گروپ ماں سے ملتا تھا۔ پھر ضرورت پڑی تو بلقیس کے بھائی ہمایوں رضا شفیع نے دیا اور پھر ضرورت پڑی تو اس کی بہن نجمہ نے دیا۔

.....اور پھر ضرورت ہی نہ رہی۔

صبح ہو چکی ہے۔ دن کے گیارہ بجے کا عمل ہے۔ ۲۰ جولائی کا منحوس دن ہے۔

سب ڈاکٹر کھڑے ہیں۔ بہن بھائی کھڑے ہیں۔ ہارون' عرفان کھڑے ہیں اور بلقیس کبھی نہ واپس آنے کے لیے کومے میں چلی گئی۔ ڈاکٹروں نے ہزار کوشش کی مگر ہونی کو ہو کر رہنا تھا اور بلقیس ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہمارا ساتھ چھوڑ کر چلی گئی۔ "انا للہ و انا الیہ راجعون"

اے زندگی تجھے لاؤں کہاں سے۔

Marfat.com

اس لمحہ مری زندگی کی روشنی ختم ہو چکی تھی
مری زندگی کا نور ہمیشہ کے لئے گل ہو گیا اور میں کچھ نہ کر سکا۔ بس دیکھتا رہ گیا۔

اور وہ کتنا تکلیف دہ منظر تھا جب نرس اس کی سونے کی چوڑیاں اس کے بے جان بازوؤں سے اتار رہی تھی۔ یہ چوڑیاں بلقیس نے کبھی بھولے سے بھی نہیں اتاری تھیں کہ یہ چوڑیاں اسے اس کے سردار نے دی تھیں وہ جو اسے بگاڑ کر سرتاج کہتی تھی اور آج سب حسرتیں سدھریں تھیں جو ان چوڑیوں کے ساتھ اتر رہی تھیں۔ میں چکرا کر ایک کرسی پر گر گیا۔

ہارون' عرفان کو دیکھا تو سنبھلنا پڑا

اس کے بعد جو ہوا وہی ہوا جو ایسے موقعوں پر اکثر ہوتا ہے۔ مگر سب سے مشکل وہ لمحہ تھا جب مجھے مانچسٹر اور نیویارک دیار غیر میں ان معصوم بچیوں کو یہ بتانا پڑا کہ اب ان کی ماں اس دنیا میں نہیں رہی۔ وہ بہت ہی تکلیف دہ مرحلہ تھا۔ دنیا کے دوسرے حصہ میں وہ بیچاریاں بے یارو مددگار تڑپ کر رہ گئیں اور لاہور چل دیں۔

گرمی کا موسم تھا۔ ہم بچیوں کا انتظار نہیں کر سکتے تھے اور اسی شام بلقیس مری والدہ کے پہلو میں فیصل ٹاؤن قبرستان میں اپنی آخری آرام گاہ میں پہنچ گئی۔

اور مرے منہ سے نکلا
یہاں ہیں وہ دو عظیم ہستیاں جنہوں نے میری زندگی بنائی
میری ہوک نکل گئی
آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ گیا۔
اور مجھے میرے والد صاحب نے سنبھالا۔
صائمہ' سائرہ اگلے دن پہنچیں تو ماں کی قبر سے لپٹ لپٹ کر روتی رہیں اور بے ہوش ہو گئیں۔

تب سے میرے منہ سے اکثر نکل جاتا ہے کہ
اے موت تجھے موت کیوں نہ آئی۔
زندگی تجھے ڈھونڈوں کہاں سے
کہ میں اس وقت سے بے موت ہی مر رہا ہوں۔
کہ میری زندگی ہی بلقیس تھی

Marfat.com

اور شاید میں بلقیس کے لئے؟
صرف بلقیس کے لئے ملازمت میں آیا تھا۔
کہ اللہ کی یہ منشا تھی
اسے یونہی منظور تھا

بلقیس کے چلے جانے کے بعد چند مہینوں میں ہی سب کچھ بدل گیا۔ حکومت بدل گئی اور میں افسر بکار خاص یا افسر بیکار بن گیا اور اسی حالت میں رٹیائر ہو گیا۔ کہ اسے اللہ کو ایسے ہی منظور تھا۔ یہ نوکری یہ ٹھاٹھ باٹھ مجھے صرف اماتا ملے تھے کہ میں بلقیس کی دلجوئی کر سکوں یا کم از کم اس کے اہل بن سکوں۔ جب اس کی ضرورت نہ رہی تو میری چھٹی ہو گئی۔

اس کے راز وہی جانے اور کوئی نہ جانے۔

یہ دل کے مرض اور گردوں کی خرابی سب اسی وجہ سے ہے کہ بلقیس کے بعد میری کیا ضرورت رہ گئی تھی۔ دل گردہ کس کام کا کہ دیکھنے والے ہی نہ رہے۔

تقریباً ۶۲ سال کی عمر کو پہنچ کر جب میں اپنی زندگی پر پیچھے مڑ کر نظر ڈالتا ہوں تو جو کچھ ہوا وہ کسی عجوبہ سے کم نہیں ہے۔ وہ وہ ہوا جو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ کیا ہونا ہوتا ہے وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ بندے کی کوئی حیثیت نہیں۔ فطرت کی قوتیں بہت زیادہ طاقتور ہوتی ہیں۔

Marfat.com

گھر دیکھ کر دشت یاد آیا

(غالب) کسی کو تو دشت دیکھ کر گھر یاد آیا تھا لیکن مجھے تو بلقیس کے بعد ہر روز گھر دیکھ کر دشت یاد آتا۔ قدرت کا عجیب نظام ہے میں پوری عمر کبھی بھی نچلا نہیں بیٹھا۔ چاہے پڑھ رہا تھا' چاہے کیمپوں کے دھکے کھا رہا تھا یا مزدوری کر رہا تھا۔ یا افسری کر رہا تھا مگر زندگی کا ایک پل بھی ایسا نہ تھا کہ آرام سے بیٹھ سکوں۔ ہر وقت بھاگ دوڑ ہی بھاگ دوڑ تھی اور بلقیس کے بعد یکدم کچھ بھی نہ رہا۔ سب اجاڑ ہی اجاڑ تھا۔ سرکار نے گھر بٹھا دیا اور گھر میں کوئی کام نہ تھا۔ فراغت ملی تو ایسی کہ سب بیابان تھا۔ زندگی بھر فراغت کی دعا کرتے رہے اور ملی تو ایسی ملی کہ یہ فراغت قیامت بن گئی۔

واہ رے قدرت

صائمہ اداس' ہارون اور عرفان پریشان۔ بابا جی اور میں گھر کی دیواریں دیکھیں۔ تنہائی سی تنہائی کہ خود تنہائی اس سے سہم جائے۔ دوست یار ملاقاتی بہت تھے مگر طبیعت کسی طرف مائل ہی نہیں ہوتی تھی۔ سب کچھ خزاں میں ڈھل کر پھیکا پھیکا سا ہو گیا۔ گھر کی دیواریں کھانے کو آتیں۔

اکثر بیٹھے بیٹھے یہ معلوم ہوتا کہ بلقیس ادھر سے آئی ادھر سے آئی۔ آپ یقین مانیں مجھے ہر وقت اور ہر طرف سے اس کی آوازیں آتیں۔ بعض دفعہ تو میں پاگلوں کی طرح اسے تلاش کرنے کے لئے کمرے کمرے گھومتا پھرتا۔ اس وقت اس کا وجود خیالی نہیں بالکل ٹھوس

Marfat.com

نظر آتا اور میں دیوانہ سا ہو جاتا۔ نیاز و دعا میں سکون ڈھونڈا۔ قرآن و سیرت کے مطالعہ میں ڈوبا۔ مجیب شامی اور اشفاق احمد خان کی صحبت کے لیے بھاگ اٹھتا۔ سیمینارز' مجالس اور پتہ نہیں کہاں کہاں خاک چھاننے کی کوشش کی۔ محروم طبقہ کے ہونہار بچوں کی تعلیم کے لیے طاہر یوسف صاحب سے مل کر کام شروع کیا مگر سکون تو مجھ سے روٹھ چکا تھا۔ کوسوں دور بھاگ چکا تھا۔ دن آرام نہ رات۔ گھر برا لگتا وہی گھر جو بلقیس کی زندگی میں اتنے شوق سے بنایا تھا اور اس نے سجایا تھا..... سب اجڑ کر رہ گیا۔

سب سے زیادہ صدمہ باباجی نے محسوس کیا۔ ان کی صحت ہمیشہ قابل رشک رہی تھی مگر بلقیس کے بعد وہ یکدم ڈھیر سے ہو گئے۔ میں حیران تھا کہ باباجی کو کیا ہو گیا۔ ہمارے زمانے کے رواج کے مطابق باپ کے ساتھ بیٹوں کی بے تکلفی کچھ زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ باپ حکم دینے کے لیے تھا اور بیٹا ماننے کے لیے اور ہمارا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔ دل کی باتیں کہاں ہو سکتی تھیں۔ مگر کچھ تو تھا جو باباجی کو اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔ میرے دوست چوہدری واجد علی خان نے باباجی کی بہت دلجوئی کی مگر وجہ معلوم نہ ہو سکی اور وہ خاموش خاموش سے رہتے اور گھلتے ہی جاتے۔ آخر ایک دن ہمارے دوست چوہدری انور ظہور نے باباجی کے دل کی بات نکال ہی لی۔ انور ظہور سے کہتے ہیں کہ:

"میرے سردار کا گھر اجڑ گیا ہے۔ مجھ سے اس کا دکھ دیکھا نہیں جاتا۔ ایسا ہونا نہیں چاہیے تھا۔ انور یہ کیا ہو گیا۔ اس کی اولاد جوان ہے۔ اب وہ اور شادی بھی نہیں کر سکتا۔ اس کے اپنے پواڑے ہوتے ہیں۔ کریں تو کریں کیا؟ میں سوچ سوچ کر پاگل ہو چلا ہوں۔ سردار کو سمجھاؤ کہ وہ فوراً ہارون کی شادی کرے اور اس اجڑے گھر کو نئی زندگی دے"۔

انور نے جب یہ بات مجھے بتائی تو سب معاملہ واضح ہو گیا۔ واہ میرے مولا میرے بوڑھے نوے سالہ باپ کو اپنے تقریباً بوڑھے بیٹے کا یوں خیال ستا رہا تھا۔ جیسے وہ کل کا بچہ ہو۔ شفقت پدری اسی کا نام ہے۔ دل پسیجا جا رہا ہے مگر چہرے پر بھرم کا عذاب اٹھائے رکھنا شاید ہمارے معاشرے کے ہر حساس والد کا حصہ ہے۔

میں نے باباجی کی بات کو اچھی طرح پلے باندھ لیا اور بلقیس کی آخری خواہش کے مدنظر خواجہ شریف غفور اور ان کی بیگم سے ان کی بیٹی کا رشتہ ہارون کے لیے مانگ لیا اور کچھ لیت و لعل

Marfat.com

کے بعد شکر ہے وہ رضا مند ہو گئے۔ یوں دسمبر ۱۹۹۳ء میں ہارون اور شارمین کی شادی ہوئی اور ہم نے بلقیس کو اتنا یاد کیا کہ پوچھئے مت۔ کلیجہ پھٹا جاتا تھا۔

اسی طرح اسی دوران صائمہ کے لیے بھی ایک بہت ہی اچھا رشتہ آگیا اور ہم نے اس کی شادی چوہدری عبدالکریم صاحب کے صاحبزادے نوید کریم سے طے کر دی۔

یوں شارمین بیٹی نے آکر اس اجڑے گھر کو دوبارہ آباد کیا ہے۔ اللہ کے فضل سے اب اسی گھر میں بلقیس کا ایک پیارا سا شرارتی سا پوتا اسفند یار بھاگتا پھرتا ہے اور ایک نہایت ہی پیاری سی گڑیا علمزہ اس کی پوتی کے روپ میں رونق افروز ہے کہ زندگی کے پہیہ کو مسلسل چلتے رہنا ہے۔ یہی مشیت ایزدی ہے اور یہی حقیقت حیات۔

صائمہ بیٹی کے بھی اب ماشاء اللہ تین بیٹے بیٹیاں عبداللہ' امن اور ایمان اپنی غیر حاضر نانی کے گھر آتے رہتے ہیں اور اپنے ننھا ننھا سے نانا کی تنہائی کے دور کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

کاروبار زندگی ہے کہ چلتا ہی رہتا ہے مگر بلقیس کے بغیر سردار تنہا ہے۔ اداس ہے دل گرفتہ ہے۔ میری زندگی میں وہ پہلی سی بہار پھر کبھی نہ آئی جو کبھی بلقیس کا عنبرین وجود میرے لیے لاتا تھا۔

وائے حسرت

پھر ۲۷ مئی ۱۹۹۷ء کی صبح میری زندگی بھر کی ڈھارس اور چھت باباجی بھی نہایت چپکے سے ملک عدم کے لیے چل دیئے۔

قبر کے چوکھٹے خالی ہیں انہیں مت بھولو جانے کب کونسی تصویر لگا دی جائے

ماشاء اللہ انہوں نے کافی طویل عمر پائی تھی مگر جب جدائی کا لمحہ آیا تو چند ساعتوں کے لیے تو مجھے ساٹھ سال کی عمر میں چھوٹا سا بے سہارا بچہ بنا گیا۔ اس وقت میں نے اپنے خیالات اور دلی جذبات کو ایک کالم کی شکل میں قلمبند کیا تھا۔ وہ میں آپ کی نذر کرتا ہوں:۔

۲۷ مئی کی صبح ایک عجیب صبح تھی۔ ۶۰ سال کی عمر میں اس صبح میں ایک چھوٹا سا بے سہارا بچہ بن چکا تھا۔ وقت ساکت ہی نہیں ہو گیا تھا الٹا گھوم رہا تھا۔ مرا بھانجا عبدالواحد گھبراہٹ اور سراسیمگی کی حالت میں مرے کمرے میں آیا اور وحشت زدہ ہو کر پکارتا جا رہا تھا کہ باباجی بول

Marfat.com

نہیں رہے بابا جی بل نہیں رہے۔ مرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ وقت آ گیا جس کی ہر شخص پیدا ہوتے ہی تیاری شروع کر دیتا ہے۔ منزل مقصود پہنچ گئی تھی۔

عبدالواحد بابا جی کے ساتھ ان ہی کے کمرے میں بالکل ساتھ والی چارپائی پر سوتا تھا۔ دن رات ان کا خیال رکھتا تھا کہ ذرا سی بھی آواز دیں تو ان کا حکم بجالائے۔ کھانے کا خیال رکھتا بر وقت دوائی دیتا پانی لسی دیتا بابا جی کی خدمت پر مامور ملازموں کو الرٹ رکھتا۔ ان کے مہمانوں اور دوستوں کی آؤ بھگت کرتا ہروقت اپنے نانا کے ساتھ سائے کی طرح چمٹا رہتا۔

اس صبح عبدالواحد کی گھبراہٹ سب کچھ بتا رہی تھی کہ اس کے نانا کا نوے سالہ شاندار سفر مکمل ہو چکا ہے۔ میرا کمرہ بالکل بابا جی کے کمرے کے سامنے ہے میں بھاگ کر بابا جی کے پاس پہنچا۔ بابا جی کے دیرینہ دوست ملک محمد حیات بھی اس وقت وہاں موجود تھے۔ مجھے دیکھتے ہی کہتے ہیں کہ بابا جی ٹر گئے۔ بس آرام سے ٹر گئے ہیں اب صبر لازم ہے۔ خوش قسمت تھے نیند میں سوئے سوئے ٹر گئے ہیں۔ کوئی تکلیف نہیں ہوئی ان کی چائے انتظار کر رہی تھی۔ آخری چائے مگر پینا نصیب نہ تھی۔ ہم سب یہاں ان کے ساتھ بیٹھے تھے۔ پتہ ہی نہ چلا چپکے سے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ جیسی زندگی ویسی موت شکوہ نہ شکایت۔ بیٹا صبر کرو اب صبر کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے بیٹا صبر صبر بابا حیات بار بار کہہ رہا تھا اور میں کہیں دور سے سنتا جا رہا تھا۔ پتہ نہیں کتنی دور سے سن رہا تھا واحد زارو قطار رو رہا تھا۔ بابا جی کے سب خادمین رو رہے تھے مگر میں کہیں اور ہی پہنچ ہوا تھا۔ سب کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں مگر پتہ نہیں کیسے؟ مگر میں ساٹھ سال پہلے کے دور میں چلا گیا تھا مرے وہ لمحات مرے بچپن کے تھے۔ نامعلوم میں وہاں کیسے پہنچا مگر میں اس وقت اپنے آپ کو ایک چھوٹا سا بے بس بچہ محسوس کر رہا تھا۔ میں کبھی بابا جی کی گود میں تھا تو کبھی ان کے کندھوں پر سواری کر رہا تھا میں اپنی جائے پیدائش موضع کوڈھیڑہ جلوالاں ضلع ہوشیار پور (بھارت) پہنچ چکا تھا۔ ان کی جوانی کڑیل جسم کالی سیاہ داڑھی اور کڑاکے دار آواز مرے عین آنکھوں کے سامنے تھی۔ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو ہروقت اپنے ساتھ لئے پھرتے تھے۔ پیار کرتے تھے حوصلہ بڑھاتے تھے نہلاتے تھے کسرت کرواتے تھے۔ وہ ہر طرح کا پیار ننھے سردار پر نچھاور کرتے تھے۔ لاڈ کرتے تھے یہ اس زمانے کا رواج نہ تھا مگر چوہدری دل محمد تھا کہ اپنے لاڈلے کو ہروقت اپنے سینے سے لگائے رکھتا تھا۔ سارا گاؤں کہتا تھا کہ لالہ اپنے بیٹے کو لاڈ پیار سے خراب کر رہا ہے مگر سارے گاؤں کا لالہ دل محمد اور اپنی ماں کا دولا کہتا جاتا کہ مرا بیٹا پڑھ لکھ کر بہت بڑا افسر بنے گا۔ مرا

Marfat.com

بیٹا مری پیٹھ نہیں لگوائے گا کبھی نہیں۔ ہندوؤں کے مقابلہ میں ایک ہونہار طالب علم بنے گا اور گاؤں کے مسلمانوں کا مان ہو گا۔ مری پیاری ماں بھی یہی کہتی' مری دادی اور دادا بھی یہی توقع رکھتے تھے۔ مرا دادا کہتا کہ چاہے ساری زمین بک جائے مگر میں اپنے پوتے کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلاؤنگا اور ہندوؤں کو شکست دونگا اور پھر مرے سارے گاؤں کا ہر مسلمان یہی کہہ رہا تھا میں ۲۷ مئی ۱۹۹۷ء کی صبح یہ سب کچھ سن رہا تھا مجھے بھی اپنے باپ دادا کی لاج رکھنا تھی اور پھر یہی کچھ ہوا جو ان کی آرزو تھی۔ جب بھی میں اپنی جماعت میں اول آتا تو مرے گاؤں کے سارے مسلمان جشن مناتے اور ہندو سوگ۔ ایک دو دفعہ تو ایسا بھی ہوا کہ کچھ اوباش ہندوؤں نے مرے فرسٹ آنے پر مری خوب دھنائی کر دی اور مرے باپ دادا اور عزیز و اقارب نے لاٹھیاں نکال لیں اور ان متعصب ہندوؤں کی خوب پٹائی کی۔

مرے والد سارے گاؤں کے لالہ تھے اور میں بھی انہیں لالہ ہی کہتا تھا۔ وہ کوئی بڑے عالم فاضل نہ تھے اور نہ ہی امیر کبیر۔ ایک سادہ لوح باریش نمازی مسلمان تھے۔ یہی صورتحال ہماری ماں کی تھی۔ سارا خاندان ایسا ہی تھا وہ نفسیات کے ماہر تھے اور نہ ہی کوئی زیادہ سیاسی مگر ہروقت وہ مری تعلیم پر زور دیتے کہ یہی راہ فلاح ہے۔ ذاتی بھی اور مسلمانوں کی بھی مجھے تو معلوم نہ تھا کہ پاکستان کے مضمرات کیا ہیں مگر ہمارے گھر میں ہروقت پاکستان کا ذکر رہتا کہ یہی مسلمانوں کی منزل ہے۔ یہی اسلام کی۔ یہی کلمہ یہی نجات۔ پاکستان بن رہا تھا اور میں پرائمری کے وظیفہ کے امتحان میں اپنی پوری تحصیل اونہ میں اول رہا۔ سب مسلمانوں نے جشن منایا اور ہندوؤں سکھوں نے حملہ کر دیا۔ ہمیں بھاگنا پڑا بارش ہو رہی تھی سامان اٹھانے تک کی مہلت نہ ملی۔ مگر مری والدہ نے بھاگتے بھاگتے قرآن مجید گلے میں ڈال لیا۔ مری دونوں بہنیں اور میں ان کے پیچھے پیچھے بھاگ رہے تھے اور وہ بار بار کہہ رہی تھیں کہ ڈرو مت۔ ہم اللہ کی حفاظت میں ہیں۔ قرآن تمہارا محافظ ہے اور ان الفاظ نے ہمیں واقعی بالکل بے خوف کر دیا تھا۔ جنگل میں چھپتے چھپاتے ہم ایک جگہ جا نکلے تو لالہ کو دیکھا پھر ہمارے چچا بھی آگئے اور چلتے چلاتے اسلامیہ کالج ہوشیار پور کے مہاجر کیمپ میں پہنچ گئے۔ ہر طرف رنج والم تھا۔ بیماری اور بھوک تھی ایسے محسوس ہوا جیسے جنت سے نکل کر ہم جہنم رسید ہو گئے ہوں۔ مگر ہمارے لالہ کے حوصلے بلند تھے۔ ان کی منزل پاکستان تھی پاکستان آکر ٹوبہ ٹیک سنگھ آبسے۔ ہمارے حالات اچھے نہ تھے لالہ ہی نہیں ہم سب ہی مزدوری کرتے تھے مگر لالہ اپنے لاڈلے کو پڑھانا ضرور چاہتے تھے۔ پتہ نہیں کس طرح

Marfat.com

انہوں نے مجھے کتابیں کاپیاں لے دیں۔ وہ مزدوری کرتے رہے میں پڑھتا رہا۔ زمین تھی نہ جائیداد' الاٹمنٹس وغیرہ سب بعد کی باتیں ہیں جب میں میٹرک کے امتحان میں فرسٹ آیا تو مرا لالہ سربسجود تھا۔ مری ماں الحمد اللہ الحمد اللہ کا ورد کر رہی تھی۔ مرے دادا دادی نے ایک عجیب رٹ لگا رکھی تھی کہ فوراً پرتھ رام اور بھگوان سنگھ کو اطلاع کریں کہ ان کا پوتا پھر فرسٹ آیا ہے اور ہم آج بھی تم سے لڑائی کے لیے تیار ہیں۔ یہ بات مجھے عجیب ہی نہیں بہت ہی زیادہ عجیب لگ رہی تھی..... مرے غریب لالہ نے شیخ محمد یوسف مرحوم کی مدد سے مری تعلیم کا اہتمام گورنمنٹ کالج لاہور جیسے اعلیٰ تعلیمی ادارہ میں کیا اور میں پاکستان کی اعلیٰ سروس کا مستحق ٹھہرا۔ افسر بنا خادم بنا' پولیس افسر بنا۔ صوبہ پنجاب کا آئی جی بنا سب کچھ ہی بنا مگر وہ اپنے لاڈلے کی حفاظت کے لیے ہمیشہ جہاں بھی میں ہوتا ساتھ رہتے۔ پتہ نہیں کیوں میں ان کی وجہ سے کچھ لاابالی سا بنا رہتا تھا۔ مشکل سے مشکل معاملات میں بھی نہیں گھبراتا تھا۔ بحران سرکاری ہو یا ذاتی بس اک گونا تسلی رہتی تھی کہ کوئی ذات ہے جو مسلسل مری محافظت کر رہی ہے۔ بینظیر صاحبہ نے اپنی پہلی حکومت کے دور میں مجھے بلاوجہ معطل کر دیا۔ شاید اسی لیے کہا گیا ہے کہ :۔

اپنی محنت کا صلہ اہل سیاست سے نہ مانگ
مردے کبھی قبروں کی کھدائی نہیں دیتے

سب پریشان تھے مگر اباجی حوصلہ کے پہاڑ بنے کھڑے رہے۔ بس ایک ہی ہدایت تھی کہ ذرہ بھر اپنے موقف سے نہیں ہٹنا۔ سچ پر ڈٹے رہو اگر سچے ہو تو جیت جاؤ گے جھوٹے ہو تو سزا پاؤ گے۔

مرا لالہ پاکستان آ گیا تو ہم نے انہیں اباجی کہنا شروع کر دیا۔ ہم بہنوں اور بھائی کی اولاد نے انہیں باباجی کہنا شروع کر دیا اور پھر ہر کسی کے باباجی بن گئے۔ سب کے چہیتے سب کے محترم سب سے وہ پیار کرتے تھے اور سب ہی ان سے پیار کرتے تھے۔ ۱۹۹۱ء میں ہماری والدہ اس دار فانی سے رخصت ہوئیں تو وہ اداس تو ہوئے مگر ہم سب کے لیے ڈھارس بنے رہے مگر جب ۱۹۹۲ء میں اچانک مری اہلیہ بلقیس بیگم فوت ہوئیں تو اس کے بعد باباجی بے حد پریشان رہنے لگے۔ ان کی نہایت ہی قابل رشک صحت ریزہ ریزہ ہوتی نظر آنے لگی۔ مرے نہایت ہی عزیز دوست چوہدری انور ظہور نے باباجی سے پوچھا کہ آپ کی صحت اچانک کیوں گرنے لگی ہے تو کہتے ہیں کہ

Marfat.com

مرے بیٹے کا گھر اجڑ گیا ہے یہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔ مجھے سردار کا فکر کھائے جاتا ہے..... واہ بابا باپ کو کیا کیا فکر ہوتے ہیں میں نے اپنے بڑے بیٹے ہارون کی فوراً شادی کی اور مری نہایت ہی پیاری بہو شارمین بیٹی نے بہت حد تک ہمارے گھر کے خلاء کو پر کر دیا۔ شارمین بابا جی کی ایک ایک ضرورت کا خیال رکھتی.....اور بابا جی کی صحت بحال ہو گئی۔ ڈاکٹر رزاق ڈاکٹر ہی نہیں وہ پورے باغبان پورہ کے لیے فرشتہ رحمت ہیں۔ ہمارے عزیز بھی ہیں۔ وہ بابا جی کے طبی پہلو کا باقاعدہ خیال رکھتے۔ مرے بہت ہی عزیز دوست چوہدری واجد علی خان بابا جی کی پسندیدہ کمپنی تھے۔ انتقال سے ایک دن پہلے ان کے ساتھ خوب دل کی باتیں کیں۔ مری ریٹائرمنٹ پر نہایت خوش تھے واجد کو کہہ رہے تھے کہ اب مرا بیٹا کچھ آرام کریگا.....ساٹھ سالہ بیٹے کے آرام کا خیال کتنا جانگزیں تھا ایک دن قبل خود اٹھ کر غسل خانہ گئے۔ اللہ نے انہیں کسی کا محتاج نہ کیا رات کو ٹیلی ویژن دیکھتے رہے اس رات ٹیلی ویژن پر ایک مذاکرہ آرہا تھا جس میں میں بھی گفتگو کر رہا تھا۔ دیکھ کر بہت خوش ہوئے آخری وقت میں بھی اپنے اس بیٹے سے خوش تھے جسے انہوں نے متعصب ہندوؤں کے مقابلہ میں تعلیم کے میدان میں ممیز کرنے کا تہیہ کئی دہائیوں پہلے کیا تھا.....رات گئے سوئے اور پھر ہمیشہ کے لیے سو گئے۔

اور میں ۲۷ مئی کی صبح ایک بار پھر چھوٹا سا بچہ تھا اب شفقت کی گود تھی اور نہ ہی بابا جی کے مضبوط کندھے مرے ساٹھ سال چھ سیکنڈ پر آکر ٹھہر گئے تھے۔ نامعلوم میں کیا کیا کہتا رہا اور کیا کیا نہ کہہ سکا پھر مرے بیٹے ہارون اور بہو شارمین نے مجھے ایک دفعہ پھر گزرے وقت کا احساس دلایا۔

"انکل! انکل کیا ہو گیا..... انکل! انکل آپ کو کیا ہو گیا آپ کیا کہہ رہے ہیں"۔

یکدم میں دوبارہ ساٹھ سال کا ہو گیا تھا مرے بچے مرے سامنے پریشان کھڑے تھے۔ انہوں نے شاید پہلی دفعہ مجھے بچہ بنا دیکھا تھا میں یکدم بوڑھا تھا اور یتیم بھی۔ واہ بابا جی آپ بھی چل دیئے اللہ کی تمام رحمتیں تیرے لئے امڈ امڈ کر آئیں۔ تو آرام سے رہے ہمیشہ آرام سے رہے مری پیاری ماں اب تیرے ساتھ ہے تیری پیاری بہو بلقیس تیرے ساتھ ہے تو خدا کے حوالے سب اس کے حوالے کمال سفر تھا اور کمال اختتام۔

اناللہ وانا الیہ راجعون۔

Marfat.com

دل کی بات

جب سب دل والے ہی لد جائیں تو بے چارہ دل کہاں سلامت رہتا ہے اور میرے ساتھ یہی کچھ ہوا۔ ۲۳ نومبر ۱۹۹۷ء کی صبح بے چارہ دل پھٹ ہی پڑا۔ آخر دل تھا نہ کہ سنگ و خشت۔ دل کا علاج بھی دل والے ہی کر سکتے ہیں اور ہم انہیں ڈھونڈتے رہے۔ مگر جو چلے جاتے ہیں وہ پھر کبھی واپس نہیں آتے۔ آپ کا دل بھی ساتھ لے جاتے ہیں۔

پاکستان میں تو میرے دل کو کوئی مسیحا نہ مل سکا۔ ڈاکٹر پیر محمد طور نے اصرار کیا تو ہم امریکہ دل کے مسیحا کی تلاش میں پہنچ گئے مگر یہاں آکر پتہ چلا کہ دل تو دل ہے ہمارے تو گردے بھی خراب ہیں۔ اب ہمارا دل رہانہ گردہ۔ اپریشن کریں تو خطرہ۔ نہ کریں تو خطرہ۔

مگر جو مرضی میرے مولا کی۔ ہماری زندگی تو پچھلے چھ سال سے ہم سے روٹھ کر دور جا چکی ہے۔ اب اور جی کر کیا کریں گے۔ اس کی ذات نے بہت کچھ دیا۔ ہمارے خواب و خیال سے بڑھ کر دیا ہے۔ شکر ہے لاکھ لاکھ شکر ہے اس کی ذات کا۔ کہ میرے اصرار پر عرفان میاں نے بھی شادی کر لی ہے اور اب میں زندگی کے بہت سے فرائض سے فارغ ہو چکا ہوں الحمد اللہ۔

مجھے تو اپنی ساری زندگی ایک دھندلا سا خواب محسوس ہوتی ہے۔ ہم نے اپنی باری لے لی ہے اب آئندہ آنیوالوں کی باری ہے جو ہمارا تسلسل ہے۔ زندگی جاری رہتی ہے رنگ بدل کر۔ نام بدل بدل کر۔ حد سے بڑھی حرص حیات حرام ہے۔

Marfat.com

اپنی آپ بیتی کے اختتام پر میں اپنی مرحومہ دادی کے اکثر گنگنائے پنجابی گانے کو درج کرنا چاہوں گا اور وہ اک ایسی حقیقت کی عکاسی کرتا ہے جو میری دادی کی دادی نے بھی ضرور ہی گایا ہو گا۔ تو میں اسے کیوں نہ گاؤں یا گنگناؤں:۔

چل دیا پتیا کیوں کھڑ کھڑ لائی او
پھلاں ٹر جاناں رت نویاں دی آئی او

Marfat.com

Marfat.com

انسان کی رنگا رنگ زندگی کتنے بھی انمول واقعات سے کیوں نہ بھری پڑی ہو اس کی کاغذ پر فوٹو کاپی تیار کرنا بہت ہی مشکل بلکہ ناممکن کام ہے۔ اس ناممکن کام کو سردار محمد چوہدری نے ایک خوش مزاج دیہاتی قصہ باف کے انداز میں اس طرح سے سرانجام دیا ہے کہ صرف اسی کے چھوٹے بڑے واقعات سے قصہ بافی کا سارا میلہ رنگا رنگ پارچات سے بھر گیا ہے۔ ایسے پارچات جن پر دساور کے تاجر بطور خاص نظریں لگائے بیٹھے ہیں۔

سردار محمد چوہدری کی خود نوشت پڑھتے وقت خود مصنف کی جو تصویر ذہن میں ابھرتی ہے وہ ایک سچے مگر غریب مسلمان اور درد مند پاکستانی کی تصویر ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ اس دہقانی وقائع نگار کو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور اس کھونٹ والے بابے کے پیچھے ان نئے لکھنے والوں کو بھی راستہ دے جو قافلے سے جدا ہو گئے ہیں۔

اشفاق احمد

RS: 150.00

www.sang-e-meel.com

ISBN: 969-35-1022-4

9789693510225

Marfat.com